سرگذشتِ حیات

از

ڈاکٹر احمد امین

ترجمہ

شیخ نذیر حسین

مجلسِ ترقیِ ادب ۰ لاہور

سرگذشتِ حیات

از

ڈاکٹر احمد امین

ترجمہ

شیخ نذیر حسین

مجلسِ ترقیِ ادب ۔ لاہور

طبع اول : مارچ ۱۹۷۹ء

تعداد اشاعت : ۶۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظمِ مجلسِ ترقیِ ادب ، لاہور
مطبع : ظفر سنز پرنٹرز ، ۹ کوپر روڈ لاہور
طابع : سید ظفرالحسن رضوی

قیمت : ۲۰ روپے

فہرست مضامین

★ ★ ★

دیباچہ مترجم

ڈاکٹر احمد امین عہدِ قریب کے مشہور مصری مصنف تھے ۔ ان کی کتابوں میں سے "فجرالاسلام" ، "ضحی الاسلام" اور "ظہرالاسلام" نے عالم گیر شہرت حاصل کی ہے ۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے شوق ، محنت اور جد و جہد کی بدولت بہت جلد مصری ادیبوں کی صفِ اول میں اپنا مقام پیدا کر لیا ۔ پہلے وہ محکمۂ شرعیہ میں قاضی تھے ۔ اس کے بعد جامعۂ مصریہ میں ادبِ عربی کے پروفیسر اور آرٹس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے ۔ وزارتِ معارف اور جامعۂ دول العربیہ (عرب لیگ) کے ثقافتی شعبوں کے ڈائرکٹر بھی رہے ۔

وہ خالص علمی آدمی تھے ۔ ساری عمر مصر کی مشہور انجمن لجنۃ التالیف و الترجمۃ و النشر کے صدر رہے ۔ اس انجمن نے عالمِ عرب کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ۔ یہ انجمن آج تک دو ڈھائی سو کے قریب کتابیں شائع کر چکی ہے ، جن میں نادر مخطوطات کی اشاعت کے علاوہ مغربی تصالیف کے تراجم بھی شامل ہیں ۔

ڈاکٹر احمد امین کا ایک عملی کارنامہ عوامی یونیورسٹی (جامعۂ شعبیہ) کا قیام ہے جس میں رات کو مفت تعلیم دی جاتی ہے ۔ اس یونیورسٹی کا مقصد مصروف اور کم پڑھے لوگوں میں تعلیم کی اشاعت ہے ۔ یونیورسٹی سے اب تک ہزاروں آدمی مستفید ہو چکے ہیں ۔

زیرِ نظر اوراق ان کی خود نوشت سوانح "حیاتی" کا اردو ترجمہ

ہیں ۔ عربی زبان میں خود نوشت سوانح کی کمی نہیں ۔ علمائے اسلام میں امام غزالی ، ابن الجوزی اور ابن خلدون نے اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات بیان کیے ہیں ۔ عصرِ حاضر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الایّام" نے بڑی شہرت پائی ہے لیکن ادب کی اس صنف کی تکمیل ڈاکٹر احمد امین نے کی ہے ۔

فاضل مصنف عمر بھر طالب علم رہے ۔ اس خود نوشت سوانح میں انھوں نے اپنی طالب علمی کی داستان کو خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے ۔ ازہر کی تعلیم کے نقائص بھی کھول کر لکھے ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی تعلیم اور تمدن کے زیرِ اثر زندگی کی پرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں لے رہی تھیں اور مشرقی تہذیب اور مغربی تمدن میں کشمکش پیدا ہو رہی تھی ۔ اس تہذیبی آویزش کی داستان سرائی انھوں نے دلکش انداز میں کی ہے ۔ کتاب میں مصر کے معاشرتی اور سیاسی حالات کم لیکن علمی اور تعلیمی کوائف زیادہ ملتے ہیں ۔

کتاب کا ترجمہ اس مقصد سے شائع کیا جا رہا ہے کہ شاید اس کو پڑھ کر کسی کے دل میں علم کی سچی لگن پیدا ہو سکے جس کے لیے مصنف مرحوم عمر بھر کوشاں رہے ۔

نذیر حسین ، لاہور

دیباچۂ مصنّف

میں کسی کتاب کی تالیف سے اتنا نہیں ڈرا جتنا اس کتاب کی تالیف و اشاعت سے، کیونکہ اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں دوسرے لوگوں کا ذکر ہے لیکن اس کتاب میں میں نے اپنی ذات کو پیش کیا ہے۔ اس طرح میں خود تماشا بھی ہوں اور تماشائی بھی۔ آنکھ اپنے آپ کو صرف آئینے کی مدد سے دیکھ سکتی ہے۔ ایک چیز جتنی زیادہ قریب ہوگی، اتنا اُس کا مشاہدہ مشکل ہو جائے گا۔ ایک انسان اپنی شخصیت کا اندازہ دوست یا دشمن کے قول سے کر سکتا ہے۔ یا تحلیل کی خاطر اُس کو دو شخصیتوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک دیکھنے والی اور دوسری دیکھی جانے والی، یا ایک فیصلہ کرنے والی اور دوسری فیصلہ قبول کرنے والی۔ لیکن یہ کام بہت مشکل ہے۔ بھلا اس معاملے میں انصاف بھی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نفسِ انسانی اپنی ذات اور اعمال کا اندازہ لگانے میں مبالغہ پسند واقع ہوا ہے۔ اپنی ذات کی طرف وہ جو کچھ منسوب کر دیتا ہے، اُس کا اہل نہیں ہوتا۔ اُس کے تصرفات میں جو کچھ اُسے برا لگتا ہے، اُسے مبنی برحق مان لیتا ہے۔ یا انصاف پسندی اُس کو بے وقعتی پر آمادہ کرتی اور اُس کے اعمال کی ناقدری کرتی ہے۔ کبھی وہ اپنے اعمال کو سیاہ عینک سے دیکھتا ہے اور انصاف پسند حاکم کا روپ دھار لیتا ہے لیکن گوہرِ مقصود کا پا لینا فلاسفروں اور دانشمندوں کے لیے بھی مشکل ہے۔

نفسِ انسانی کی سمندروں کی طرح گہرائیاں اور رات کی طرح

انتہائیاں ہیں ۔ پھر شعور اور لاشعور ، عقلِ باطن اور ظاہر ، بسیط اور مرکب ، سطحی اور عمیق ، عرضِ قریب اور بعید ، اور اس قسم کی دوسری کیفیات ہیں جن کی تحلیل مشکل اور تفہیم قریباً محال ہے۔ انسان دھوکہ کھا جاتا ہے حالانکہ دھوکے کی حقیقت اور اُس کے اسباب و اغراض کو سمجھنا آسان ہوتا ہے ۔ اگر انسان اپنی ذات کو دھوکہ دے تو یہ ایسا گہرا عمل ہے جس کی گہرائیوں پر ہزارہا پردے پڑے ہوئے ہیں ۔

اس واسطے سقراط کا یہ کہنا کہ "اپنی ذات کو خود پہچانو" ایک فضول سی تکلیف بھی ہے اور انسانی طاقت سے باہر بھی ۔ لیکن انسان پر لازم ہے کہ حق اور صداقت کے پہچاننے میں امکان بھر کوشش کرتا رہے تاکہ اُس کا نفس اور ضمیر مسئولیت کی تکلیف سے بچے رہیں ۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ۔

اسی بنا پر میں نے یہ کتاب تالیف کی ہے اور اس میں سچی باتیں ہی لکھی ہیں ، سوائے سچ کے کسی دوسری بات کا ذکر نہیں آیا ۔ سچی باتیں یوں بھی کانوں کو اچھی نہیں لگتیں ۔ جب ہم کسی بھی جسم کی عریانی کو ناپسند کرتے ہیں تو اپنی ذات کی عریانی کو کس طرح اچھا سمجھیں گے ۔ پھر ایک معمولی واقعہ جو میرے لیے یا کسی دوسرے کے لیے وقوع پذیر ہوا ہو اور جس کے بیان کرنے میں کوئی فائدہ ہی نہیں ، کیسے اچھا لگ سکتا ہے ۔

انسان کا اپنی ذات کے متعلق کچھ کہنا یوں بھی ناپسندیدہ اور بوجھ سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسان اپنی ذات کو بے حد محبوب رکھتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی بات میں چاہے انکساری کا اشارہ بھی پایا جائے ، ایک قسم کی مدح معلوم ہوگی جو اُس کی عظمت اور تفاخر پر دلالت کرتی ہے اور جس کو سن کر قاری اور سامع ناک بھوں چڑھاتے

ہیں ۔ لہٰذا حدیثِ نفس بھی ایک قسم کی ماہرانہ فنکاری ہے ۔

مجھے اِس کتاب کی اشاعت میں تأمل تھا کیونکہ لوگوں کو میری سرگزشتِ حیات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ نہ تو میں سیاسی لیڈر ہوں اور نہ اونچا سرکاری ملازم جس کی سوانحِ حیات سے اُن گہرائیوں اور رازہائے درون پردہ کی نقاب کشائی ہوسکے جو اب تک نہ کھل سکے ہوں اور جن کے بیان سے صداقت واضح اور تاریخ مکمل ہو سکے ۔ میں نہ ہی ایسا محقق ہوں جس نے نامعلوم حقائقِ عالم سے پردہ اُٹھایا ہو اور انسانی علم میں کچھ اضافہ کیا ہو ، یا انسانی جذباتِ محبت اور شجاعت کو روشن کر کے دکھایا ہو اور جس کے کارناموں سے ادب اور تاریخ کے سرمائے میں اضافہ ہوا ہو ۔ میں مجاہد قسم کا مصلح رہنما بھی نہیں ہوں جس نے خوب معرکہ آرائیاں کی ہوں اور فتح اور شکست سے دوچار ہوا ہو ۔ امراء ، عوام اور جمہور سے نبرد آزما رہا ہو ۔ کبھی لوگ اُس سے خوش اور کبھی ناراض رہے ہوں ۔ وہ سعادت اور شقاوت دونوں سے بہرہ مند رہا ہو ۔ اگر ایسا آدمی اپنے کوائفِ زندگی شائع کرے تو وہ باعثِ عبرت و نصیحت ہو سکتے ہیں ۔ لیکن مجھ میں یہ دونوں باتیں بھی ناپید ہیں تو میں اپنے سوانحِ حیات کیوں شائع کروں ؟

لیکن اس کا فوراً یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ استبداد کا زمانہ گزر گیا ۔ اُس کے پلٹنے کی کوئی اُمید نہیں رہی ۔ اُس کی جگہ اب آزادی نے لے لی ہے ، حتٰی کہ فن اور ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ مشرق میں شعر و شاعری نے خلفاء اور امراء کے محلات میں عوام سے دور رہ کر زندگی گزاری تھی ۔ اُس کا اہم ترین موضوع مدح سرائی اور بہترین خصوصیت اسلوب کا تصنع اور زیبائش تھی ۔ اب موضوعِ بیان میں ہر چیز داخل ہے اور اسلوب میں تزئین اور عبارت آرائی مفقود ۔ مغرب میں تمثیلی روایتوں کا موضوع بادشاہوں

اور امیروں کی زندگیاں ہوا کرتی تھیں ۔ غریبوں کا ذکر تو امیروں کے ہنسنے ہنسانے کے لیے ہوتا تھا ، لیکن وہ زمانہ تو گیا ۔ اب ہر شے موضوعِ کلام بن سکتی ہے ۔ فقیر کی جھونپڑی ہو یا قصرِ شاہی ، عیش پرست امیر کی زندگی ہو یا کسی فاقہ مست مزدور کی زراعت ہو یا قصرِ شاہی کی امارت ۔ ہمارے مؤرخ خلفاء اور اُن کے اعمال و افعال محاربات ، عمارات اور اُن کے حاشیہ نشینوں کی تاریخ لکھا کرتے تھے ۔ اب وہ جمہور اور سلطان ، فقیر اور امیر ، زراعت اور امارت دونوں کی تاریخ لکھتے ہیں لہٰذا گمناموں کی زندگی بھی مشہور آدمیوں کی طرح اہم ہے ۔

لہٰذا میں کیوں نہ اپنے سوانحِ حیات قلمبند کروں ۔ شاید یہ ہماری نسل یا زندگی کے کسی گوشے کی عکاسی کر سکیں ۔ آج قارئین کو فائدہ پہنچا سکیں اور کل کسی مؤرخ کے کام آ سکیں ۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میرے ماحول نے جس طرح میری ذات کو متاثر کیا ہے ، اُس کو اچھی طرح بیان کر سکوں ۔

تاریخِ حیات لکھنے کا خیال مجھے عہدِ جوانی سے رہا ہے ۔ میں اپنے سفرناموں سے ہر روز کی یادداشتوں کو مرتب کر لیتا تھا ۔ سالانہ یادداشتوں میں ہر سال کے وہ اہم واقعات درج کرتا تھا جن سے میں مسرور یا غمناک ہوا ہوتا ۔ یہ کام غیر منظم طور پر مختلف اوقات میں ہوتا رہا ۔ اس کے بعد یہ خیال پرورش پاتا رہا اور خصوصاً پچھلے برس سے تو اسی کا دھیان دامن گیر رہنے لگا ۔

میں نے ایامِ طفولیت سے بڑھاپے تک جو کچھ یادداشتوں کا خزانہ جمع کیا ہوا تھا ، اب ان حوادث کو ، جو مختصر اور بغیر کسی ترتیب کے درج تھے ، اس کتاب میں نچوڑ لیا ۔ جب اس سے فارغ ہوا تو اُس میں روزانہ یادداشتیں شامل کرتا چلا گیا ۔ چند ماہ

گزرنے کے بعد نئے سرے سے اس کو ترتیب دیا اور کتابت کرا دی جس کو آپ دیکھ رہے ہیں ۔ اس میں تصنع اور تکلف کا کوئی شائبہ نہیں ہے ۔

واللہ ھو الموفق — احمد امین

الجیزہ ، ۲۶ مارچ ۱۹۵۰ع

۱

تمہید

میں لازمی نتیجہ ہوں ان حوادث زمانہ کا جن سے میرے والدین دوچار ہوئے ۔ مادہ فنا نہیں ہوتا اسی طرح حقیقت بھی غیر فانی ہے ۔ چرند ، پرند اور حشرات مر تو جاتے ہیں لیکن مٹی میں تحلیل ہو کر نباتات اور اشجار کی خوراک بن جاتے ہیں پھر نباتات اور اشجار کا کوئلہ بن جاتا ہے ۔ کوئلے کی آگ گیس میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ حتیٰ کہ سورج کی شعاعوں کو جن سے جنگلات پرورش پاتے اور درخت اگتے ہیں ، اندھیرے میں ذخیرہ کر لیا جاتا ہے ، اگر ان کو آگ دکھا دی جائے تو وہ اپنی پہلی سیرت کی طرف عود کر آئیں گی ۔

یہی حال جذبات ، حواس ، افکار اور خیالات کا ہے ۔ یہ ابدی ہیں اور ان کا عمل ابد تک جاری رہتا ہے ۔ انسان جو کچھ شکم مادر سے لے کر ولادت تک اور پھر زندگی میں دیکھتا ہے ، وہ اس کے نفس اور حس کی گہرائیوں میں جا کر ٹھہر جاتا ہے ۔ برابر ہے کہ وہ اسے یاد رکھے یا بھلا دے ۔ اس سے لذت اندوز یا غمناک ہو ۔ وہ کتے کے بھونکنے کو سنتا اور آگ کے شعلے کو دیکھتا ہے ۔ خوشی اور غم کے حوادث سے دوچار ہوتا ہے ۔ یہ ساری چیزیں مل جل کر اپنا عمل جاری رکھتی ہیں اور یہ آمیزش اور عمل ان تمام برے بھلے اعمال کی بنیاد بن جاتا ہے جو انسان سے صادر ہوتے رہتے ہیں ۔ اسی سبب سے انسان عظیم اور حقیر بن جاتا ہے ۔ زندگی کے حوادث سے ہم جو آگاہی اور جو تجربات حاصل کرتے ہیں یا ہمارے دل میں جو

خیالات جگہ پاتے ہیں ، یہ سب ہماری زندگی کی تکوین میں بڑا کام کرتے ہیں ۔ اگر تم کسی کو زندگی سے بیزار یا کسی کو شاداں و فرحاں اور خوش دل یا کسی کو بہادر ، کشادہ دل یا کسی کو بزدل ، ذلیل اور تنگ دل پاتے ہو تو اس کی زندگی کی زنجیر کی کڑیوں کو اس زمانے سے تلاش کرو جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا ۔ کبھی ایک واقعہ رونما ہوتا ہے اور انسان اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا ۔ کبھی کوئی معمولی سی بات سنتا ہے لیکن غور و خوض سے کام نہیں لیتا ۔ یا پھر وہ کوئی جملہ کتاب میں سرسری طور پر پڑھ لیتا ہے تو یہ سب باتیں اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جاتی ہیں ۔ پھر کسی سبب سے ایک ہی لحظہ میں تحریک پا کر بڑے بڑے کاموں کا باعث بن جاتی ہیں ۔ انسان بڑی حد تک نتیجہ ہے ان تمام چیزوں کا ، جو وہ اپنے والدین سے ورثہ میں یا ماحول سے حاصل کر سکتا ہے ، اگر کسی انسان کا ماحول اور اس کی خاندانی روایات مجھ جیسی ہوتیں تو وہ کم و بیش مجھ جیسا ہوتا ۔

میری شخصیت کی تکوین میں میری آبائی وراثت ، اقتصادی زندگی جو ہم پر محیط تھی ، مذہب جو ہم پر حکمران تھا اور زبان جو ہم بولتے تھے ، ان سب کا بڑا عمل دخل ہے ۔ عوامی ادب جو ہم سنا کرتے ، تربیت کی خاص قسم جو ہمارے والدین کے ذہن میں محفوظ تھی اور شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی اور اس قسم کی دوسری باتیں بھی شریکِ عمل ہیں ۔

مَیں نے اپنی ذات کو خود نہیں بنایا بلکہ بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے ۔ اسی طریق سے جس طرح قوانین ، وراثت خاندان میں عمل پیرا ہوتے ہیں ۔

اس عالم کا بھی عجیب حال ہے ۔ اگر ایک نظر سے دیکھا

جائے تو وہ متشابہ اور اجزاء کی تکوین میں ہم جنس نظر آئے گا ۔ اور ایک ہی قانون کے زیرِ فرمان معلوم ہو گا لیکن دوسری نظر سے دیکھا جائے تو ایک جز دوسرے سے متغائر نظر آئے گا جس کی خصوصیات الگ ہیں اور جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ۔ گلاب کے بوٹے کو دیکھ لو ، ہر پتہ دوسرے سے الگ نظر آئے گا ۔ پس ایک طریقے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے سے کتنا مشابہ ہے اور دوسرے طریقے سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان انسان میں کتنا فرق ہے ۔

اس دوسرے نظریے کی بنا پر میں اکیلا ہی عالم ہوں جیسا کہ دوسرا انسان ۔ واقعات میرے اعصاب کو بھی متاثر کرتے ہیں لیکن میرا تاثر دوسرے لوگوں سے مختلف قسم کا ہوتا ہے ۔ ایک ہی واقعے سے ایک انسان ہنستا اور دوسرا روتا ہے ۔ تیسرا نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے ۔ عود کی مختلف تاروں کی طرح جن پر مختلف فن کاروں کے ہاتھ پڑتے ہیں ۔

میں وہی باتیں عرض کروں گا جن سے میری ذات متاثر ہوئی ۔ وہی بیان کروں گا جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا اور وہی لکھوں گا جن سے میرے حواس اور افکار متاثر ہوئے ۔

——:o:——

۲

خاندان

ایک دن جغرافیہ کے استاد نے میرے سر کو غور سے دیکھ کر پوچھا کیا تم خالص مصری ہو ؟ میں نے جواب دیا کہ میرا گمان تو یہی ہے لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا ؟ استاد نے کہا کہ نسلِ انسانی کے علم سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا سر ایک کُرد جیسا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کردیت کہاں سے آگھسی ۔ میرے والد کے خاندان کا تعلق شہرِ سُمخراط سے ہے جو بحیرہ کے صوبہ میں واقع ہے ۔ سارا خاندان مصری کسانوں پر مشتمل تھا ۔ بحیرہ کا علاقہ ہمیشہ سے مہاجروں کی پناہ گاہ بنا رہا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ میرے جدِ امجد بھی کردی یا شامی یا حجازی ہوں ۔ ہمارے بزرگ جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا ، سب کے سب آزاد منش تھے ، ان کو اپنی تاریخ سے کوئی سروکار نہ تھا ۔ ہمارے خاندان کا گزر بسر کاشت پر تھا ۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان کے شہر میں بارہ فدان کے قریب ان کی زمین تھی ۔ لیکن حکام کے ظلم اور ٹیکسوں کی تحصیل میں سختی کی وجہ سے وہ اپنا شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ۔

بیگار کئی قسم کی لی جاتی تھی ۔ دریائے نیل کی طغیانی کے زمانے میں پلوں پر پہرہ دینا پڑتا تھا مبادا کہ دریا کی طغیانی سے سارا شہر زیرِ آب آجائے ۔ اگر کوئی اس نگرانی سے پہلو تہی کرتا تو اسے دردناک سزا دی جاتی تھی ۔ بیگار کی دوسری قسم خاص تھی ۔ امیروں ، سرداروں اور چوہدریوں کو حق حاصل تھا کہ غریب کسانوں سے

دن رات بغیر کسی اجرت کے کام لیں ۔ جب ریاض پاشا[1] نے اس بیگار کو خدیو توفیق[2] کے عہد میں حکماً روک دیا تو بڑے بڑے لوگوں نے اس فعل کو ناپسند اور معیوب قرار دیا ۔ وہ کہنے لگے کہ اس نے تو کسانوں کو سر پر چڑھا دیا ہے ۔ ملک میں قلیل التعداد امیروں کی حکومت تھی اور عوام ان کے غلامِ بے دام تھے ۔

ٹیکس غیر منظم اور ظالمانہ تھے ۔ بعض اوقات امراء نادہندگی کی وجہ سے بھاگ نکلتے یا کم ادا کرتے اور باقی ماندہ رقم سے خلاصی کے لیے رشوت یا سفارش سے کام لیتے ۔ غریبوں سے ان کی حیثیت سے زیادہ کا مطالبہ کیا جاتا ۔ اگر وہ سرکاری واجبات ادا نہ کرتے تو ان کے مویشی اور گھر کے مال و اسباب کو نیلام کر دیا جاتا ۔ ان کو کوڑوں سے پیٹا جاتا اور دردناک سزائیں دی جاتی تھیں ۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے وہ گھر کا سامان اپنے جانوروں پر رکھ کر ظلمتِ شب میں جدھر چاہتے نکل جاتے ۔ بعض اوقات وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں پناہ لیتے یا صحرا میں جا کر خیمے لگا لیتے ۔ علی مبارک پاشا[3] اور بہت سے خاندانوں کی طرح ہمارے خاندان نے بھی ایسا ہی کیا ۔ ایک رات میرے والد اور تایا گھر کا سامان لے کر نکل کھڑے ہوئے ۔ زمین چھوڑ دی کہ جو کوئی چاہے قبضہ کر لے اور لگان ادا کرتا رہے ۔ ہجرت کے بعد وہ منشیہ کے محلے (قسم الخلیفہ) میں جا ٹھہرے ۔ اس وقت ان کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ کوئی رشتہ دار ۔

بولاق کی طرح خلیفہ کے محلے کی آبادی زیادہ تھی مگر لوگوں

---

۱ ۔ ریاض پاشا : سابق وزیرِ اعظمِ مصر ۔

۲ ۔ خدیو توفیق : ۱۸۵۲ - ۱۸۹۲ ۔

۳ ۔ علی مبارک پاشا : (۱۸۲۴ - ۱۸۹۳) مصر کے سابق وزیر تعلیم ، دارالکتب المصریہ اور دارالعلوم (قاہرہ) کے بانی ۔

کا حال برا تھا ۔ اس میں زیادہ تر مزدور ، کاریگر اور پھیری والے رہتے تھے ۔ متوسط طبقے کے لوگ زیادہ اور اونچے طبقے کے کم تھے ۔ اگر کوئی ازمنہ وسطیٰ میں قاہرہ کے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہے تو ان دونوں محلوں ، خاص کر میرے ایامِ ولادت کے حالات پڑھ لے ۔

میں قضا و قدر کے فیصلوں پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتا ۔ میرے والدین حکام کے ظلم سے سمخراط سے نکل کھڑے ہوئے ۔ قاہرہ میں بود و باش اختیار کی جہاں کہ میں پیدا ہوا اور تعلیم حاصل کی ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کسانوں کی طرح کھیتی باڑی کرتا لیکن عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ۔ شر سے خیر اور خیر سے شر پیدا ہوتا ہے ۔ واقعات اسی وقت سمجھ میں آتے ہیں جب یہ سلسلۂ عمل مکمل ہو کر عرصۂ ہستی پر ظاہر ہوتا ہے ۔

مہاجروں نے ایک معمولی سے محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان لے لیا اور اس میں رہنے لگے ۔ جو کچھ پس انداز کیا تھا اس پر گزران کرنے لگے ۔ شروع شروع میں دونوں نے بہت کچھ تکلیف اور مصیبت برداشت کی لیکن جلد ہی میرے تایا نے معاش کا طریقہ ڈھونڈھ نکالا ۔ وہ بہت اچھا کاریگر تھا ۔ میرا خیال ہے کہ میرا تایا میرے والد کو بھی اپنے ساتھ کام پر لے جایا کرتا تھا تاکہ کام میں اس سے مدد لے سکے ۔ لیکن میرے باپ پر اس کا فطری شوق غالب آ گیا ۔ انھوں نے قرآن پاک حفظ کر کے ازہر میں داخلہ لے لیا ۔ وہ بھائی پر اپنی تعلیم کا بوجھ ڈالنے سے ڈرتے تھے ۔ اس وقت کم سے کم خرچہ کا مطالبہ کرتے ۔ جب ازہر میں کوئی کتاب پڑھائی جاتی تو اس کو اپنے ہاتھ سے نقل کر لیتے ۔ ان کا خط بہت اچھا تھا جس کی طلباء اور علماء میں نظیر نہ تھی ۔ وہ کاغذ کا پیمانہ بنا کر دھاگے کو گوند سے جوڑتے اور

سطریں کھینچ کر بڑے سلیقے سے کتابت کرتے۔ میرے والد نے اس قسم کی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ کوئی قلمی کتاب دیکھتے تو اس کو نقل کر لیتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان کاموں کے لیے کہاں سے وقت نکال لیتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی ہے کہ وہ کبھی کھیل تماشے میں مصروف رہے اور نہ ہی قہوہ خانہ میں جا کر بیٹھے۔ ان کی ساری زندگی عملِ پیہم سے عبارت تھی جس سے اُن کی صحت برباد ہو گئی تھی۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو میں نے یہ تمام کتابیں جمع کر کے ان کی طرف سے ہدیۃً دے دیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں نحو اور فقہ شافعی کے متعلق تھیں۔

تعلیم میں ترقی کرنے کے ساتھ میرے والد کو کسی کام کی بڑی تلاش تھی۔ اس کے لیے کبھی تو وہ سرکاری مطبع بولاق میں مصحح (پروف ریڈر) اور کبھی سرکاری مدارس میں مدرس بن جاتے۔ ازہر کی تعلیم بڑا کٹھن مرحلہ ہے جس کو طویل صبر سے قطع کیا جا سکتا ہے۔ داخلہ تو بہت سے لوگ لے لیتے ہیں لیکن فراغت بہت کم پاتے ہیں۔ ان کی مثال پانی کی بڑی نہر جیسی ہے جو تنگ نالے میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ طالب علم اپنی عمر کے بیس سال گزار دیتا ہے۔ پھر کبھی کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی ناکام۔ اس طرح میرے والد نے صبر و ثبات کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور اس قابل ہو سکے کہ اپنے بھائی کا ہاتھ بٹائیں اور اُس کے احسانات سے سرخرو ہوں۔

میری والدہ کا گھرانا تلا سے تعلق رکھتا ہے جو منوفیہ کے اطراف میں ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اُنھوں نے اپنے اصلی وطن کو حکام کے جور و ستم کی وجہ سے چھوڑا تھا یا کوئی دوسری وجہ تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے ماموں قاہرہ کے وسط میں باب الخلق کے پاس رہتے تھے اور پنساری (عطاری) کا کام کرتے تھے اور ان کا

کاروبار خوب چمکا ہوا تھا ۔ اس تجارت کے ساتھ وہ حافظِ قرآن بھی تھے ۔ قرأت نہایت عمدگی سے کرتے اور شعائر دینی کے پابند تھے ۔ میرا ایک ماموں نہایت سخی تھا ۔ فقراء کی خدمت کرتا رہتا اس کو مال اور دل دونوں کی فراخی حاصل تھی ۔ مگر میرا دوسرا ماموں نہایت کنجوس ، تنگدل اور تنگدست تھا ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے پہلے ماموں کی فراخ دستی سخاوت کا موجب تھی ۔ اسی طرح یہ بھی میری سمجھ سے بالا ہے کہ دوسرے کی تنگدلی اس کی تنگدستی کی وجہ سے تھی یا اس کی تنگدلی اس کی تنگدستی کا موجب تھی ۔

———:o:———

۳

والدین

میرا پہلا مدرسہ میرا گھر ہی تھا جس میں میں نے زندگی کے اہم اسباق حاصل کیے ۔ جب میرے تایا اور والد کی حالت سدھر گئی تو انھوں نے اسی محلے میں اپنا ذاتی مکان بنا لیا اور اس میں رہائش پذیر ہو گئے ۔ نچلی منزل کو چھوڑ کر مکان کی دو اور منزلیں تھیں ۔ نچلی منزل مہمانوں کے لیے مخصوص تھی ۔ ہر ایک منزل میں تین تین کمرے اور ملحقات تھے ۔

گھر میں سادگی اور صفائی کا نہایت اہتمام تھا ۔ اکثر کمروں کا اثاثہ ایک چٹائی پر مشتمل تھا جس پر قالین پڑا رہتا ۔ سونے والے کمرے میں لحاف ، گدے اور تکیے نظر آتے جو صبح کو لپیٹ لیے جاتے اور شام کو پھیلا دیے جاتے ۔ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا ۔ باورچی خانے کا اسباب بھی معمولی تھا ۔ نقل مکانی کے لیے (اسباب اٹھوانے کے لیے) ایک گڑی کافی تھی ۔ گھر کا بیشتر اور قیمتی اثاثہ کتابیں تھیں جن کی قطاریں الماریوں میں لگی رہتیں ۔ میرے باپ کے کمرے میں اور پہلی منزل پر کتابیں ہی کتابیں تھیں ۔ میرے والد مختلف علوم کی کتابوں کے شائق تھے ۔ وہ فقہ ، حدیث ، تفسیر ، لغت ، تاریخ ، ادب ، نحو ، صرف اور بلاغت کی کتابیں دیکھتے رہتے ۔ کسی کتاب کے دو ایڈیشن چھپتے تو وہ اعلیٰ ایڈیشن خریدتے ۔ میرے والد سرکاری مطبع میں پروف ریڈر تھے ۔ اس وجہ سے ان کے پاس اسی مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں موجود تھیں ۔ یہ لائبریری میرے بڑے

کام آئی ۔ میں نے اس کی اچھی چیزوں کو سنبھال کر رکھا ہے اوراس کو بڑے کتب خانے کی بنیاد بنایا ہے جس پر مجھے فخر ہے ۔ میں اس میں آج بھی گھنٹوں رہتا ہوں ۔

اسی مکان کے کمرے میں یکم اکتوبر ۱۸۸۶ع کو صبح کے پانچ بجے میری پیدائش ہوئی ۔ گویا یہ تاریخ پتہ دے رہی تھی کہ میں مدرس بنوں گا ۔ میں یکم اکتوبر کو مدرسہ میں داخلہ لیا ۔ پرائمری ، مڈل اورکالج میں لڑکے ، لڑکیوں ، مشائخ اور نوجوانوں کو پڑھاتا رہا ۔ میں اپنے والدین کا چوتھا بچہ ہوں ۔ میرے والد ذمہ داری کے بوجھ کی وجہ سے کثرتِ اولاد کو ناپسند کرتے تھے ۔ تاہم میری بہن کی وفات پر انھیں بے حد صدمہ پہنچا تھا ۔

میری ایک بہن تھی جس کی عمر بارہ سال کے قریب ہوگی ۔ میرے والد نے یہ سوچ کر کہ اس کا گھر میں بھی بےکار رہنا مفید نہ ہوگا ، اس کو ایک استانی کے ہاں بھیجنا شروع کر دیا جہاں وہ سینا پرونا اور گل کاری سیکھتی تھی ۔ وہ ایک دن اپنی استانی کے مہمانوں کے لیے قہوہ تیار کر رہی تھی کہ آگ بھڑک کر اس کے بدن اور بالوں تک پہنچ گئی ۔ پہلے تو اس نے خود آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی ۔ آخرکار وہ مدد کے لیے چلائی ۔ لوگ گئے تو دیکھا کہ وہ آگ کا شعلہ بن چکی تھی پھر دو گھنٹوں کے بعد مر گئی ۔ میں اس وقت ماں کے پیٹ میں تھا گویا میں نے غمگین دودھ پیا اور پیدائش کے بعد بھی غم آمیز دودھ ہی میری خوراک بنا ۔ ولادت کے وقت سرد مہری سے میرا استقبال ہوا جس کا تا حیات میری زندگی پر اثر رہا ۔ میں لوگوں کی طرح خوش نہیں ہوتا اور نہ ہی زندگی سے اتنا لطف اندوز ہوتا ہوں جتنا کہ دوسرے لوگ ۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے یا بڑے عالموں کو ۔

ہمارے خاندان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ گھر اور روزی میں استقلال تھا ۔ ہاں کبھی کبھی عزیز و اقارب آ نکلتے تھے ۔ گھر پر میرے والد کی حکمرانی تھی ۔ گھر کی زمامِ کار ان ہی کے ہاتھ میں تھی ۔ والدہ ان کی اجازت سے گھر سے باہر نکلتی ۔ بچے مار پیٹ کے ڈر سے مغرب کے بعد گھر سے باہر نہ جاتے ۔ سارے کنبے کا خرچ ان کے پاس جمع رہتا ۔ جس طرح چاہتے خرچ کرتے ۔ ہمارا کھانا نہ کھانا ان کی مرضی کے تابع تھا ۔ اپنے فرائض کو وہ بخوبی سمجھتے تھے ۔ اولاد کی تعلیم کا خیال ہر وقت دامن گیر رہتا ۔ بچوں کو خود پڑھاتے، مدارس میں جا کر ان کی پڑھائی دیکھتے ۔ اس معاملے میں لڑکے اور لڑکیاں ان کے نزدیک یکساں تھیں ۔ بچوں کی تعلیم میں انہوں نے بے اندازہ تکلیف اٹھائی تھی ۔ بیمار ہو جاتے تو کبھی بیماری کی پروا نہ کرتے ، ٹیک لگا کر پڑھا دیتے ۔ انس ، مسرت اور میٹھی میٹھی باتوں سے نا آشنا تھے ۔ شاید ان چیزوں کو غیر ضروری سمجھتے تھے ۔ ہم پر مہربانی فرماتے لیکن یہ مہربانی چھپی رہتی اور سختی کا اظہار ہوتا رہتا ۔ ہم میں سے جب کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس وقت ان کی شفقت ظہور میں آتی ۔ اوپر کی منزل میں اکیلے رہتے تھے ۔ اکیلے کھاتے اور اکیلے عبادت کرتے ۔ ہماری ملاقات پڑھنے کے وقت ہوتی لیکن ہماری بات چیت ، خوش مزاقی اور کھیل کود صرف والدہ کے ساتھ تھا ۔

ہماری ایک نانی بھی تھی جو نیک دل اور دین دار خاتون تھی ۔ اس کا نورانی چہرہ دمکتا رہتا ۔ وہ کبھی کبھی ہمارے ہاں آکر رات گزارتی تو ہم اس کی زیارت اور گفتگو سے شاد کام ہوتے ۔ اس کو بے شمار عوامی ، شہری اور دیہاتی قصے یاد تھے ۔ ان کہانیوں سے کبھی تو ہم مرعوب ہو جاتے اور کبھی خوش ۔ ان میں قضا و قدر ، خوش نصیبی عورتوں کے مکر و فریب ، جنوں اور شیطانوں ، بادشاہوں اور بڑے

لوگوں اور مقدر کے سامنے بے بسی کے واقعات ہوتے۔ ان قصوں کے اندر لطیف عوامی مثالیں اور جملے ہوا کرتے جو قصے کی جان ہوتے تھے۔ کبھی میرا بھائی الف لیلیٰ پڑھ کر سناتا۔ کتاب میں کوئی جملہ ناشائستہ آجاتا تو وہ شرمندہ اور مضطرب ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی لڑکھڑاتی آواز میں اس جملے کو ادا کرتا تو بعض حاضرین ہنس پڑتے۔ اس پر میری والدہ اور نانی شرمسار ہو جاتیں۔ میرا بھائی بھاگ جاتا اور پڑھنا بند ہو جاتا۔

مختصر طور پر ہمارے گھر کا ماحول سنجیدہ تھا جس میں زیادہ ہنسی مزاح کا گزر نہ تھا اور یہ سب میرے والد کی خاموشی، علیحدگی اور سخت گیری کا نتیجہ تھا۔

اس وقت گھروں پر مغربی تمدن کی حکومت نہ تھی۔ خاص کر ہمارے جیسے متوسط گھرانے تو اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ گھروں میں نل نہ تھے۔ ماشکی پیٹھ پر مشک لاد کر لاتے اور برتنوں میں انڈیل دیتے۔ ایک مشک خالی کر کے دوسری لے آتے۔ محلے میں پانی کے لیے ہمیشہ ماشکی کی مانگ رہتی۔ ہر گھر کے لیے اس کا حساب و کتاب ٹھہرا ہوا تھا۔ ہفتہ گزرنے کے بعد وہ پانی کی قیمت مانگتا۔ مشک لے کر آتا تو حساب رکھنے کے لیے دیوار پر ایک لکیر کھینچ دیتا۔ بعض شریر لوگ ان لکیروں میں سے ایک آدھ مٹا کر ماشکی کو مغالطے میں ڈال دیتے۔ اس پر ماشکیوں نے مجبور ہو کر دوسرا طریقہ نکالا۔ وہ ہر گھر میں بیس منکے دے جاتے۔ جب ایک مشک بھر کر لاتے تو ایک مہرہ لے جاتے اور جب سب ختم ہو جاتے تو اسی نسبت سے گھر والوں سے پانی کے دام وصول کرتے۔

میں جوان ہی تھا کہ میں نے محلے میں گڑھے کھدتے اور پانی کے نل نصب ہوتے دیکھے۔ اس طرح گھروں میں پانی کی فراوانی

ہو گئی اور ماشکی کی آواز محلے سے غائب ہو گئی ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ماشکیوں کی لکیروں اور منکوں سے محفوظ رکھے ۔

ان حالات میں گھروں میں برق روشنی کہاں سے آتی ۔ چراغ تیل سے روشن کیے جاتے تھے ۔ برق روشنی اس وقت نصیب ہوئی جب میں یہ محلہ چھوڑ کر دوسرے محلے میں چلا گیا ۔ کھانا ایندھن سے پکایا جاتا ۔ اس سے ترقی ہوئی تو پتھر کے کوئلہ پر پکنے لگا ۔ اس سے آگے بڑھے تو انگریزی چولھے (اسٹوو) سے پکنا شروع ہوا ۔

گھر کا سارا کام کاج میری والدہ کر لیتی تھی ۔ گھر میں کوئی نوکر تھا نہ نوکرانی ۔ بڑی لڑکیاں والدہ کی مدد کرتیں ۔ لڑکے کام سے فارغ ہو کر آتے تو وہ بھی ہاتھ بٹاتے ۔ میرے والد جامعہ ازہر اور مسجدِ امام شافعی میں مدرس تھے ۔ مسجد کی امامت بھی کر لیتے ۔ ان کی تنخواہ بارہ پونڈ تھی ۔کاغذی سکہ سے کوئی بھی آشنا نہ تھا ۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت پرائمری سکول میں پڑھتا تھا ، جب کاغذی سکہ (نوٹ) کا چلن ہوا ۔ لوگ نوٹ لیتے ہوئے ڈرتے تھے ۔ فکاہی اخبارات بھی کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑتے رہتے ۔ اگر کہیں سے نوٹ ہاتھ پڑ جاتا تو بڑے بوڑھے جلدی سے نوٹ کو طلائی سکہ سے بدلوا لیا کرتے تھے ۔ بارہ پونڈ کی رقم ہماری ضروریات کے لیے کافی ہی نہ تھی بلکہ ہم کچھ پس انداز بھی کرلیتے تھے ۔ اس وقت کے بارہ پونڈ آج کے پینتالیس پونڈوں کے برابر تھے ۔ ایک قرش کے دس انڈے ملتے تھے ۔ تین چار قرش میں ایک رطل گوشت ملتا ۔ اسی طرح گھی کا بھاؤ تھا ۔ ضروریاتِ زندگی محدود اور سادہ تھیں ۔ میرے والد کی دنیا گھر سے کام تک اور مسجد سے گھر تک محدود تھی ۔ وہ نہ تو حقہ پیتے اور نہ قہوہ خانہ میں جاکر بیٹھتے ۔ ہمارے کپڑے صاف ستھرے رہتے ۔ کھانے پینے میں بھی اعتدال تھا ۔ کھانے کی

متعدد قسموں کا ہونا ضروری نہ تھا ۔ گوشت بھی ہر روز نہ پکتا ۔ الغرض اڑوس پڑوس سے ہم اچھا ہی کھاتے تھے ۔ اس زمانے میں سنیما تھے نہ تھیٹر ۔ کبھی کبھی ہمارے محلے کے دروازے کے پاس پتلیوں کا تماشا ہوتا جس میں داخلے کا ٹکٹ نصف قرش کو ملتا ۔ ہم سال میں ایک دو بار یہ تماشا ضرور دیکھ لیتے ۔

گھر پر مذہبی شعور غالب تھا ۔ میرے والد وقت پر نماز ادا کرتے ۔ صبح و شام کلامِ پاک کی تلاوت کرتے ۔ وہ علی الصبح اٹھ بیٹھتے ، نماز پڑھ کر خضوع و خشوع سے دعا مانگتے ۔ تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کرتے ۔ موت کو یاد کرتے ۔دنیا اور اس کی مزخرافات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ۔ صالحین کی حکایات ، اعمال اور عبادات بیان کرتے ۔ زکوٰۃ ادا کرتے تو اقرباء کو ترجیح دیتے ۔ والد اور والدہ دونوں حج و زیارت سے مشرف ہو چکے تھے ۔ ہماری تربیت مذہبی رنگ میں ہوئی تھی ۔ فجر کے وقت ہمیں جگاتے تا کہ ہم نماز پڑھ لیں ۔ دوسری نمازوں کی بھی نگرانی کرتے ۔ پوچھتے رہتے کہ کہاں سے آئے ہو اور نماز کہاں پڑھی ہے ۔ ہماری والدہ بھی کبھی کبھار نماز پڑھ لیتی ۔ رمضان کے روزے دھوم دھام سے رکھے جاتے ۔ الغرض اگر کوئی ہمارے گھر میں داخل ہوتا تو اسے مذہب کی پاک اور نورانی خوشبو کا احساس ہوتا ۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے محلے میں شادی کی دعوت تھی ۔ اس میں بعض لوگوں کے لیے ناؤنوش کا بھی انتظام تھا ۔ جس دستر خوان پر میرا بھائی بیٹھا تھا اس پر شراب بھی تھی ۔ میرے والد کو اس بات کا پتہ چلا تو بھائی کو اتنا مارا کہ وہ بےہوش ہو گیا ۔ ایک دن میرے پاس پانچ قرش تھے ان سے میں نے ایک سگریٹ خریدنا چاہا لیکن میرے بڑے بھائی نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ سے اتنی پوچھ گچھ کی جتنا سرکاری وکیل ایک ملزم سے کرتا ہے

کیونکہ گھر میں تو کسی کو سگار پینے کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ انقلاب زمانہ سے باپوں کا رعب و داب اُٹھتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ ماؤں، لڑکوں اور لڑکیوں نے لے لی ہے۔ اب ہر گھر ایک چھوٹی سی اسمبلی بن گیا ہے جس میں کوئی نظم ہے نہ انصاف۔ اس میں نہ کسی سے رائے لی جاتی ہے اور نہ غلبے کی وجہ سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کبھی ماں زیادتی کرتی ہے تو کبھی لڑکا یا لڑکی۔ باپوں کو شاذ و نادر ہی مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پہلے سارے گھر کا خرچ ایک ہاتھ میں تھا اب کئی ہاتھوں میں ہے۔ ہر فرد کی ضروریات زندگی بڑھ گئی ہیں۔ اب جتنے منہ ہیں اتنی باتیں۔ جھگڑے اور دنگا و فساد کی وجہ سے گھر سے برکت، اطمینان اور سکون رخصت ہو گیا ہے۔ مادی تہذیب و تمدن سے برق روشنی، ریڈیو، ٹیلیفون، ریفریجریٹر اورانواع و اقسام کی دوسری چیزیں تو میسر آگئیں ہیں لیکن اس فراوانی سے گھر کی برکت میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو سکا۔

آج عورتوں نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا ہے، لیکن میری بہن اور والدہ پردہ کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں ایک بڑے انقلاب کی خبر دیتی ہیں۔ اگر میرے آبا و اجداد سمخراط سے اُٹھ کر آجائیں تو ہم کو دیکھ کر پاگل ہو جائیں۔ نئی چیزیں آہستہ آہستہ بار پاتی ہیں۔ پھر ہم تدریجاً ان سے مانوس ہو جاتے ہیں اور وقت گزرنے پر یہ حیرت جاتی رہتی ہے۔

—:o:—

۴

ماحول

یہ گھر ایک بڑا مدرسہ بھی تھا جس میں میرے جسمانی ، خلقی اور روحانی عناصر کی تکوین ہوئی - جب ایک انسان بڑھتا ، پھولتا یا کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے تو اصل کی طرف رجوع کرنے سے مسئلے کی کیفیت سمجھ میں آجاتی ہے - میری والدہ کی نظر کمزور تھی - اس لیے میں نے بھی ضعفِ بصر ورثے میں پایا ہے - اس عارضہ کی وجہ سے میں نے زندگی میں بڑی تکلیف اٹھائی ہے - جب میں نے دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہا تو نظر کی کمزوری کی وجہ سے محروم رہا - مدرستہ القضاء میں میرا داخلہ ایک معجزے سے کم نہ تھا - اس ضعفِ بصارت کی وجہ سے مجھے بعض اوقات شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے - محفل میں کوئی دور بیٹھا ہو تو اس سے علیک سلیک نہیں ہو سکتی اور لوگ اس کو تکبر پر محمول کرتے ہیں - ہوٹلوں میں میرا انتظار کیا جاتا ہے - میں جب جاتا ہوں تو کسی کو پہچان نہیں سکتا یہاں تک کہ لوگ مجھے نہ دیکھ لیں مجھے ایک آدمی کی تلاش تھی جب وہ راستے میں ملا تو میں پہچان نہ سکا - لہٰذا اس سبب سے میں سنیما یا ڈرامہ تک نہیں دیکھتا - اس قسم کے کئی واقعات سے مجبور ہوکر میں نے چشمہ استعمال کرنا شروع کردیا لیکن چشمہ بھی ہر سال تبدیل کروانا پڑتا - آخرکار میری آنکھیں ایسے چشمہ کی عادی بن گئی ہیں جس کے شیشے بہت موٹے ہیں اس میں بھی کئی قسم کی قباحتیں ہیں - جب چشمہ ٹوٹ جاتا ہے یا

اس کو گھر بھول آتا ہوں تو اندھا ہو جاتا ہوں۔ اس کے بعد دو چشمے بنوانے پڑے۔ ایک لکھنے پڑھنے کے لیے اور دوسرا چلنے پھرنے اور کام کاج کے لیے۔ پھر بھی یہ کوفت ناقابلِ بیان ہے۔ بہرحال جب ایک اندھے سے اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو یہ ضعفِ بصارت بڑی نعمت معلوم ہوتا ہے کیونکہ جوہری اشیاء کو، لوگوں سے لے کر حسین مناظر تک کو، کوتہ نظری سے دیکھ لینا ہی غنیمت ہے۔ اس وجہ سے میں تنہائی پسند ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نقص کے باوجود میری بینائی درست ہے اور ساٹھ سال کی عمر میں بھی لکھنے پڑھنے اور کتابوں کے مطالعے پر قادر ہوں۔

گھرانے کے سارے خصائص جن کا میں ذکر کر چکا ہوں، میری سرشت میں موجود ہیں۔ ان سے میرے ممیزاتِ شخصی کی تکوین ہوئی ہے۔ اگر تم دیکھو کہ میں سنجیدگی اور مزاح میں افراط و تفریط سے کام لیتا ہوں، یا کسی بھاری کام میں سرگرمی دکھاتا ہوں، یا خوشی سے زیادہ غمی سے متاثر ہوں تو سمجھ لو کہ یہ سب کچھ گھر کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اگر میرے دل کی گہرائیوں میں مذہب جاگزیں ہے اور ایمان باللہ کو فلسفہ متزلزل نہیں کر سکا یا ملحدوں کی کتابوں کے مطالعے سے کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتا یا میں اکثر موت کا ذکر کرتا رہتا ہوں اور جاہ طلبی یا شہرت کی خواہش نہیں کرتا یا اس دنیا اور اس کی رنگینیوں کو مٹ جانے والا سایہ سمجھتا ہوں یا کھانے، پینے، پہنتے، ملنے ملانے کی رغبت کم رکھتا ہوں یا اس زندگانی میں مجھے تکلف اور تصنع سے بیر ہے تو اس کی وجہ میری پدری تعلیم اور گھر کے مشاہدات ہیں۔ میں نے بہت کچھ اس تعلیم کے خلاف بھی پڑھا ہے۔ یار باش لوگوں سے بھی ملا ہوں۔ ملحدوں کے خیالات کو بھی سنا ہے۔ بعض لوگوں

نے مجھے اس دنیا اور اس کی رونقوں سے لطف اندوز ہونے کی نصیحت کی ہے۔ میں نے اس زندگی میں حیاتِ انسانی کے مختلف گوشے بھی دیکھے ہیں لیکن ان سب کا اثر نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔ میرا عمیق شعور اس سفید کاغذ کی مانند ہے جو سب کچھ قبول کر کے مستقبل کے لیے محفوظ کر دیتا ہے پھر زندگی بھر اس کا اثر جاری رہتا ہے۔

میں بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے میری طرح ایک دیندار گھرانے میں پرورش پائی تھی لیکن آئندہ زندگی میں انھوں نے اس دینی جذبے کو خیرباد کہہ دیا اور اس سے دور ہوتے چلے گئے۔ ان کا راستہ میرے راستے اور میرا طریقہ ان کے طریقے سے الگ کیوں رہا؟ کیا دین انسانی مزاج کے طابع ہے یا میری شخصیت ہی اتنی پختہ تھی کہ جو اس پر نقش ہو چکا اس کو زمانہ مٹا نہ سکا یا میرے گھرانے کے ماحول نے اس دینی رنگ کو نکھار دیا تھا کہ خیالات کی آندھیاں اس کو کچھ ضعف نہ پہنچا سکیں۔ شاید یہ کم و بیش اسی کا نتیجہ ہے۔

زندگی کے دوسرے معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ ہم دو آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ دونوں نے نہایت غربت و افلاس کی حالت میں پرورش پائی تھی پھر ان پر مال و دولت کی فراوانی ہوگئی۔ اس کے بعد دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شروع سے دولت جمع کرنے کا حریص تھا اور دوسرے نے دل کھول کر اپنی غربت کی کسر نکال لی کیونکہ جو اوائل زندگی میں تنگدست رہتا ہے وہ آخر میں خوب گل چھرے

اڑاتا ہے۔

ہم نے طرفہ[1] اور العتاہیہ[2] کے لطائف سنے ہیں۔ دونوں نے میرے سامنے موت کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے۔ طرفہ نے ان سے عیش و عشرت کے وجوب کو ثابت کر دیا:

الا ایّھا الزاجری احضر الوغلی
و ان اشھد اللذات ھل انت مخلدی
و اِن کنت لاتستطیع دفع حینتی
فدعینی ابادرھا بما ملکت یدی

ترجمہ:۔ "دیکھ اے ملامت کرنے والے کہ میں معرکوں اور ناؤنوش کی محفلوں میں حاضر ہوتا ہوں۔ کیا تو مجھ کو ہمیشہ زندہ رکھ سکتا ہے۔
اگر تو میری موت کو نہیں ٹال سکتا تو مجھ کو چھوڑ تا کہ اپنا مال ومتاع خرچ کر کے پائیدار زندگی حاصل کرسکوں۔"

تو ابوالعتاہیہ نے ان سے لذتوں کے حقیر اورذلیل ہونے کا نتیجہ نکالا۔

عجبت لذی لعب قد لھا عجبت و ما لی اعجب
أیلھو و یلعب من نفسہ تموت و منزلہ یخرب

ترجمہ:۔ مجھے تعجب ہے کھیل کود میں مصروف رہنے والے پر۔ پھر اس پر کیوں نہ متعجب ہوں۔ کیا وہ کھیلتا ہی رہے گا حالانکہ وہ مر جائے گا اور اس کا مکان اُجڑ جائے گا۔

---

۱ - طرفہ: (المتوفی) ۵۰۰ع - زمانۂ جاہلیت کا ایک شاعر -
۲ - ابو العتاہیہ: (۱۳۰ - ۲۱۱ھ) دور عباسی کا شاعر جو زہدیات کے لیے مشہور ہے۔

خواہ کچھ ہی ہو گھر میں زندگی کے اولین بیج اس زمین کے لئے بوئے جاتے ہیں جہاں کہ اس نے رہنا ہو پھر ماحول اس کو خراب کر دیتا ہے یا پروان چڑھا دیتا ہے اور وہ اس جہان کے قواعد و قوانین کے مطابق مقدور بھر زندگی گزارتا رہتا ہے۔

——:o:——

۵

بچپن

اختصار کی غرض سے میں اپنے بچپن کے تین واقعات کا ذکر کرتا ہوں ۔ ایک تو یہ ہے کہ جب میری عمر چار سال کی تھی ، ایک دفعہ میں اپنے محلے سے باہر نکلا اور ایک بڑی عمارت دیکھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا ۔ میں اس کے اندر چلا گیا ۔ اس عمارت میں خراس تھا ۔ ایک بڑا سا بیل تھا جس کے گلے میں لکڑی پڑی ہوئی تھی ۔ لکڑی لوہے کے ایک بڑے ستون سے بندھی ہوئی تھی ۔ بیل گھومتا تو لوہے کا ستون بھی حرکت میں آ جاتا ۔ پتھر کے نیچے دوسرا پتھر رکھا ہوا تھا ۔ جب یہ ستون گھومتا تو جو کچھ رکھا ہوتا اس کو پیس ڈالتا ۔ یہ منظر مجھے تو بہت پسند آیا ۔ لڑکوں کو سکون کی نسبت حرکت زیادہ پسند ہوتی ہے ۔ ساکن گڑی کے بجائے متحرک گاڑی زیادہ اچھی لگتی ہے ۔ اسی نفسیاتی بنیاد پر بچوں کو سنیما میں متحرک تصویریں دکھلائی جاتی ہیں ۔ یہ منظر بہت ہی خوب تھا ۔ بیل گھومتا تو ستون حرکت میں آ جاتا اور پتھر نرم آٹے میں تبدیل ہوتا جاتا ۔ میں اس کے سامنے دو گھنٹے بیٹھا رہا اور اس سے لطف اندوز ہوتا رہا ۔ اس اثناء میں میری والدہ مجھے ڈھونڈتی رہی ۔ میرا بھائی اور بہن دونوں مجھے محلے میں تلاش کرتے رہے ۔ جب میرا پتہ نہ چلا تو پریشان ہو گئے ۔ ہمارے محلے میں مشہور تھا کہ ایک گروہ بچوں کو پکڑ لے جاتا ہے اور دور دراز کے شہروں میں لے جا کر ان سے بیگار لیتا ہے ۔ دوسرا گروہ بدمعاشوں کا تھا جن

کو لوگ سہاری کہتے تھے۔ یہ لوگ بچے پکڑ کر ذبح کرتے یا ان کو بڑی بڑی دیگوں میں ڈال کر نیچے آگ جلا دیتے۔ میری والدہ ڈری کہ مجھ پر اسی قسم کا حادثہ نہ گذرا ہو۔ محلے میں ایک منادی کرنے والا رہتا تھا اس سے اجرت پر منادی کرائی جاتی تھی۔ وہ چھوٹے طبقے کے بچوں میں کھڑا ہو کر زور سے کہتا " کسی نے ایک بچہ دیکھا ہو جس نے سرخ یا زرد رنگ کی قمیص پہنی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر ٹوپی ہے یا سر ننگا ہے۔ اس نے جوتا پہنا ہوا ہے یا ننگے پاؤں ہے۔ جس کو وہ ملے گا اس کو حلوا دیا جائے گا۔" منادی کرنے والا گلیوں اور کوچوں میں یہی صدا لگاتا پھرتا۔ آخر میں "یاعدوی" کہتا۔ عدوی اللہ تعالٰی کے نیک ولیوں میں سے تھے جن کا کام بھولے بھٹکے کو اس کے والدین کے پاس پہنچا دینا ہے۔

یہاں میں اس مناسبت سے ایک پرلطف واقعہ بیان کرتا چلوں۔ شیخ طنطاوی جوہری مرحوم نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "این الانسان" تھا۔ مرحوم فتحی زغلول پاشا نے یہ کتاب پڑھی تو انھیں پسند نہ آئی انھوں نے این الانسان (انسان کہاں ہے) کے مقابل میں یا عدوی لکھ دی۔

منادی کرنے والا پکار پکار کر کہہ رہا تھا اور میں خراس میں بیٹھا تھا۔ اسی اثناء میں ایک شخص نے آکر مجھے باہر نکال دیا۔ ہم دونوں میں گالی گلوچ بھی ہوئی اس کے بعد میں گھر واپس چلا آیا تو والدہ نے جھڑک کر پوچھا "کہاں تھے؟" میں نے جواب

۱۔ شیخ طنطاوی جوہری: (۱۸۷۰ - ۱۹۴۰ع)۔ عالم دین اور مفسر قران۔ ان کی الجواہر فی تفسیر القرآن مشہور تفسیر ہے۔

۲۔ فتحی زغلول پاشا: (۱۸۶۲ - ۱۹۱۴ع) مصری قانون دان اور کئی قانونی کتب کے مصنف۔

دیا کہ میں خراس میں تھا اور جو کچھ دیکھا تھا اور جو کچھ اس آدمی نے کہا تھا تتلاتی ہوئی زبان میں دہرا دیا۔ جس کسی نے یہ قصہ سنا بہت ہنسا۔ مجھ سے باربار یہ قصہ دہرایا جاتا لہذا اب اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے والد پڑوس کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ انھوں نے اپنی جرابیں اور جبہ اتارا اور آستین چڑھا کر وضو خانہ کی طرف گئے۔ یہ وضو خانہ پانی کا حوض تھا جس کا رقبہ ۹ فٹ کے قریب ہو گا۔ یہ حوض کوئیں کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ اس پر چرخی لگی تھی جس میں رسی پڑی تھی۔ اس کے دونوں طرف بڑے بڑے ڈول تھے۔ ایک بھرا ہوا ڈول اوپر آجاتا دوسرا خالی نیچے چلا جاتا۔ لوگ ہتھیلیوں میں پانی لے کر ہاتھ منہ دھوتے۔ اس کے بعد پانی دوبارہ حوض میں چلا جاتا۔ یہ حوض بہت سے مصائب کا ذریعہ تھا۔ متعدی امراض مثلاً آشوبِ چشم کے مریض بھی یہاں آ کر وضو کرتے۔ پانی گندہ ہو جاتا اور تندرست آدمی بھی مرض کی لپیٹ میں آجاتا۔ مذہبی اعتقاد، عیوب اور خطرات پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ جب قاہرہ میں نلوں کے ذریعہ آب رسانی کا انتظام ہوا تو ان حوضوں کی ضرورت نہ رہی۔ پرانی چیزوں سے محبت کی وجہ سے لوگ وضو خانوں کو یاد کرتے تھے۔ شیخ محمد عبدہ[1] پر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ازہر میں قایم وضو خانے بندکروا کر ان کی جگہ اسقاوے بنوا دیے ہیں۔ اس طرح لوگ مضرت رساں پرانی چیزوں سے مانوس ہو جاتے ہیں اور نئی اور سود مند چیزوں کی مخالفت

۱۔ شیخ محمد عبدہ: (۱۸۴۹ء - ۱۹۰۵ء) مصر کے مشہور مصلح، عالم اور مفسرِ قرآن۔

کرتے ہیں ۔ یہ لوگ مذہب میں وہ چیزیں داخل کر دیتے ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ۔

میرے والد نے وضو کیا اور نماز ادا کرنے چلے گئے ۔ میں کنوئیں اور حوض کے درمیان پھرنے لگا اچانک میرا قدم پھسلا اور میں حوض میں گر گیا ۔ حوض میں پانی میرے سر سے بھی اونچا تھا ۔ اگر میرے والد آواز سن کر فوراً حوض کی طرف نہ لپکتے تو میں مر گیا ہوتا ۔ اگر میں ایک منٹ بھی پانی میں رہ جاتا اور میرے والد کو میرا دھیان نہ آتا تو میرا رشتۂ حیات منقطع ہو گیا ہوتا ۔ اس قسم کے حادثات میں کئی لوگ بچ جاتے ہیں تو کئی ضائع بھی ہو جاتے ہیں ۔ حوادث اور قضا و قدر کا فلسفہ کتنا گہرا واقع ہوا ہے ۔

اس کے بعد تیسرا واقعہ ہوا ۔ ایک روز سورج غروب ہونے سے قبل ہمارے محلے سے ایک فقیر دف بجاتا ہوا گزرا تھا ۔ وہ دف پر آنحضرت صلعم کی مدح میں قصیدے پڑھتا اور دف کی تھاپ کے ساتھ گنگناتا بھی جاتا ۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔ فقیر نے سارے محلوں کا چکر لگا کر دورہ ختم کر لیا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا لیکن گھر والے میرا انتظار کرتے رہے ۔ جب میں واپس آیا تو بغیر کسی سوال و جواب کے والد مارنے لگے ۔ اگر میرے والد آرٹسٹ ہوتے تو مجھے ضرور چومتے کیونکہ وہ کانوں میں موسیقی کی آواز ڈھونڈ لیا کرتے تھے ۔ ان کو تو اس وقت خیال آیا جبکہ میں بعد غروب آفتاب گھر پہنچا ۔

—— :o: ——

٦

محلہ

میرا دوسرا مدرسہ میرا محلہ تھا ۔ میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا اور ان سے محبت و نفرت ، پیار اور انتقام اور گالیاں وغیرہ سیکھتا ۔ اس طرح مصری زندگی کی ابتدائی تصویر اپنے رواج ، اخلاق ، عقائد، خرافات ، اوہام ، ماتم ، شادی ، خوشی اور علیحدگی کے ساتھ میرے ذہن پر نقش ہو گئی ۔ ہمارا محلہ قرون وسطٰی کے گھرانوں کا مثالی نمونہ تھا ۔ اس وقت مادی تمدن کا زور نہ ہوا تھا ۔ میں انگریزی تسلط کے چار سال بعد پیدا ہوا تھا ، صرف چند خاندان فرانسیسی تمدن سے آشنا تھے ۔ یہ قدامت پسند گھرانے تھے ۔ عوام اس سے بے بہرہ تھے۔ ہمارے محلے میں سوائے چند سرکاری ملازموں کے نہ تو کوئی اجنبی زبان بولتا اور نہ طربوش اور پتلون وغیرہ پہنتا ۔ گھروں میں عیش و آرام کے وہ وسائل بھی موجود نہیں تھے جو موجودہ تمدن کے پیدا کردہ ہیں ۔ نہ ہی کوئی جدید اسلوب کی نئی ترجمہ شدہ کتاب پڑھتا ۔ جو کوئی پڑھا لکھا ہوتا وہ قرآن ، حدیث ، قدیم قصص مثلاً الف لیلہ[۱] ، عنترہ[۲] یا ہلکی پھلکی ادبی کتابیں کلیلہ دمنہ[۳] اور المستطرف[۴] وغیرہ دیکھتا ۔

مغربی طور طریقوں نے ، جو پڑوس کو اہمیت نہیں دیتے ، ابھی

---

۱ ۔ الف لیلہ : عربی افسانوں کی مشہور کتاب ۔

۲ ۔ عنترہ : زمانہ جاہلیت کا مشہور بہادر جس کے کئی قصے مشہور ہیں ۔

۳ ۔ کلیلہ دمنہ : ابن المقفع کی ادبی کتاب ۔

۴ ۔ المستطرف : محمد بن احمد (الابشیہی المتوفی ۸۵۰ھ) کی ادبی کتاب ۔

تک غلبہ نہیں پایا تھا ۔ ایک آدمی دوسرے کے ہمسایہ میں برس ہا برس رہتا ہے لیکن کوئی شناسائی پیدا نہیں ہوتی ، بلکہ ایک ہی گھر میں اس کی ایک جانب میں رہائش رہتی ہے لیکن جان پہچان یا ایک دوسرے کے حال کی آگاہی کی نوبت نہیں آتی ۔ عربی اخلاق ، پڑوسی کو دنیا میں بڑا درجہ دیتا ہے ۔ اس وقت ہمارے پڑوسی ایک دوسرے کے احوال ، نام اور مشاغل سے واقف ہوتے تھے ۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو عیادت کے لیے جاتے ، ماتم میں تعزیت کرتے ، خوشی میں شرکت کرتے ، ضرورت کے وقت ایک دوسرے کو قرض بھی دے دیتے ۔ متوسط طبقے کے گھرانوں میں نچلی منزل پر ایک کمرہ ہوتا جس کو المناظر کہتے ۔ یہاں آنے والوں کا استقبال ہوتا ۔ عربی میں گفتگو ہوتی اور رات کو بھی محفل جمتی ۔

ہمارے محلے میں تیس گھر تھے ۔ رات کے وقت بڑا دروازہ بند کر لیا جاتا ۔ درمیان میں چھوٹا دروازہ بھی تھا جس کے پیچھے دربان رہتا ۔ یہ دروازہ زمانۂ قدیم کی یادگار تھا اور چوروں اور فوجیوں کے فتنہ سے بچاتا تھا ۔ جب کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا تو دروازہ بند کر لیا جاتا اور دربان چوکیداری کرتا ۔ امن و عافیت کا زمانہ ہوتا تو دروازہ کھلا رہتا اور دربان کی ضرورت نہ رہتی ۔

یہ گھر مختلف طبقات کی نمائندگی کرتے تھے ۔ ان میں ایک گھر ایک رئیس کا تھا ۔ دس گھر متوسط طبقہ کے اور بیس گھر چھوٹے طبقہ کے تھے ۔

اونچے گھرانے کے ایک بزرگ تھے جو پگڑی باندھتے تھے ، ان کا چہرہ مہرہ پتہ دیتا کہ وہ ترکی الاصل ہیں ۔ سرخ و سفید چہرہ ، بلند قامت اور صاحب وقار تھے ۔ ان کی سفید نورانی داڑھی تھی ۔ بارعب تھے ۔ دو گھوڑوں والی گاڑی رکھتے تھے ۔ گھوڑوں کی ٹاپ سے محلے والوں کے

دل دہل جاتے ۔ یہ محکمہ شرعیہ کے نائب اور محلے کے نمبردار تھے ۔ نوکری سے واپس آتے تو لوگوں کو ادب اور تمیز سکھاتے ۔ چھوٹے درجے کی عورتیں اونچی آواز سے نہ بولتیں ۔ قاضی صاحب جب صحن میں بیٹھتے تو آنے جانے والے کو شائستگی سکھلاتے ، اگر عورتیں اونچی آواز میں بحث کرتیں تو حبشی خادمہ آتی ۔ ان عورتوں کو قاضی صاحب کے سامنے لے جاتی اور وہ اتنی ڈانٹ ڈپٹ کرتے کہ دوسری دفعہ ان کو آواز نکالنے کی جرأت نہ ہوتی ۔ ہماری زبان پر یہی رہتا : " شیخ صاحب تشریف لے آئے ۔ شیخ صاحب تشریف لے گئے"۔ اُن کے وسیع گھر میں ایک ترکی خاتون تھی ، اس کے علاوہ حبشی غلام اور کنیزیں تھیں ۔ قاہرہ میں ایسے بازار بھی تھے جہاں سیاہ اور سفید باندیاں بکتی تھیں ۔ مشتری ، غلام یا کنیز کو دیکھتا بھالتا ۔ ان کا جسم بھی کھول کر دیکھ لیتا مبادا ان میں کوئی عیب ہو پھر جو پسند آ جاتا اس کا بھاؤ چکاتا ۔ اس طرح اُس کی ملکیت قائم ہو جاتی ۔ یہ حالت خدیو اسماعیل[1] کے عہد تک رہی ۔ دولِ یورپ نے مداخلت کرکے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے غلامی ختم ہو گئی اور ہر ایک مالک نے اپنے اپنے غلام آزاد کر دیے لیکن پھر بھی بہت سے غلام اور کنیزیں اپنے مالکوں کی خدمت کے لیے رہ گئیں ۔ مشہور تھا کہ شیخ صاحب کے پاس بہت سا سونا ہے اور وہ اس سونے کو تھیلیوں میں بھر کر آہنی صندوقوں میں رکھتے ہیں ۔ سال میں ایک دو دفعہ سارے سونے کو پانی اور صابن سے دھوتے ہیں پھر اُس کو اصلی جگہ پر رکھ دیتے ہیں ۔ شیخ صاحب بے اولاد تھے پھر بھی بڑے بخیل تھے ۔ کبھی نہ سنا گیا کہ انھوں نے محلے میں کسی کی

---

۱ ۔ خدیو اسماعیل : (۱۸۳۰ - ۱۸۹۵ء) مصر کا والی ۔

مدد کی ہو ۔ جب ستر سال کے ہوئے تو ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا ۔ اس پر انھوں نے ایک نوخیز لڑکی سے شادی کر لی جس نے ان کا مال خوب اڑایا ۔ میرے والد کی بیٹھک میں بہت سے اہلِ علم جمع ہو جاتے اور مسائلِ فقہ پر گفتگو کرتے ۔ یومِ محفل باعیدِ میلادالنبی صلعم کے موقع پر شیخ صاحب ایک سنہری چغہ پہنتے اور خچر پر سوار ہو کر مجلس کی طرف جاتے ۔ فی الجملہ ان کا رعب و داب محلے میں ایسا تھا جیسا کہ میرے والد کا ہمارے گھر میں ، یا سرکاری حکام کا دفاتر میں ۔

متوسط طبقہ ، سرکاری ملازموں پر مشتمل تھا ۔ کوئی دیوانِ اوقاف میں منشی تھا تو کوئی دفتر خانہ میں ، اور کوئی اپنی املاک کے غلہ پر گذر بسر کرتا ۔ ان میں ہر ایک کا خرچ سات پونڈ سے لے کر گیارہ پونڈ تک تھا ۔ گذران سادہ تھی جس میں نہ تنگی تھی نہ عیش کوشی ۔ لوگ اپنی اولاد کو مکاتب اور مدارس میں تعلیم کے لیے بھیجا کرتے ۔ ان گھروں میں سے دو کا اثر زیادہ تھا ۔ دیوان اوقاف کے منشی کا گھرانہ دیندار ، پاکیزہ اور خوش باش تھا ۔ دیوان خانہ میں اس کے دوست آ کر بیٹھتے ۔ رات کو خوب باتیں ہوتیں ۔ کبھی کبھی کوئی خوش الحان قاری آ نکلتا تو قرآن پاک کی تلاوت ہو جاتی ۔ کبھی فکاہیہ قصص سنائے جاتے جسے سن کر لوگ خوب ہنستے ۔ لطائف و ظرائف کا تبادلہ ہوتا ۔ میں بھی موقع پا کر ان باتوں کو سنتا اور خوش ہوتا ۔

دوسرا بھی دیوان اوقاف میں منشی تھا ۔ یہ دف خوب بجاتا تھا ۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے لئے تخت پوش بنایا ہوا تھا ۔ جس پر کوئی عود بجاتا تو کوئی گاتا ۔ کبھی کبھار یہ منشی اپنے دوستوں کی محفل منعقد کرتا اور ساری رات گانے بجانے میں گذرتی ۔ میں ان

چیزوں سے خوب متمتع ہوتا کیونکہ اس وقت نہ ریڈیو تھے نہ فونو گراف۔ گھر کا مالک یعنی اس مغنی کا باپ صالح اور ظریف تھا۔ اس کی کوئی بھی نماز نہ چھوٹتی۔ دوسرے گھر کا مالک نوجوان، بدمست اور شرابی تھا اگرچہ اس کا باپ محلے کی مسجد کا امام تھا۔

دیگر مکانات کمین طبقے یعنی راجوں، مزدوروں، درزیوں، باورچیوں، قہوہ خانوں کے مالکوں اور پھیری والوں کے تھے۔ یہ لوگ خستہ حال اور کثیرالاولاد تھے۔ ان کو اپنی نکبت کا احساس نہ تھا۔ ساگ پات، سبزی اور مچھلی ان کی خوراک تھی۔ ان میں سے بہت کم لوگ گھر پر کھانا پکاتے۔ ان کی اولاد مکتب اور مدرسہ سے ناآشنا تھی۔ بچے بڑے ہوکر اپنے آباء و اجداد کے پیشہ میں لگ جاتے۔ ان کی عورتیں کھلے منہ گھر کے دروازہ پر بیٹھی رہتیں۔ اکثر ان میں لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی۔ ایک دوسری کو مختلف قسم کی گالیاں دیتی اور ان گالیوں میں علم بلاغت کی مختلف اقسام، حقیقت، مجاز، تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتیں۔ والدین کی عزت و ناموس پر حملے ہوتے۔ فقر و فاقہ اور فسق و فجور کے طعنے دیے جاتے۔ حالات کے تحت یہ جھگڑے جلد ختم یا طول پکڑ جاتے۔ گالیوں سے آپس میں مار کٹائی تک نوبت پہنچتی اور عورتوں کی مار کٹائی سے مردوں میں دھینگا مشتی ہوتی۔ اگر شیخ صاحب ہمارے محلے میں موجود نہ ہوتے تو ان واقعات کی کثرت ہوتی۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود سارے بچے آزاد منش تھے۔ ہمیں امیری، غریبی، علم یا جہالت کی پروا نہ تھی۔ برابر سرابری سے کھیلتے۔ ایک دوسرے سے ایک ہی زبان میں مخاطب ہوتے، جس میں غرور و تکبر کا شائبہ نہ تھا۔ میرے عزیز دوست تین تھے۔ ایک دفتر خانے کے منشی کا لڑکا، دوسرا قہوہ خانے کے مالک کا اور تیسرا نقیبہ کا لڑکا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب شخصیت شیخ احمد الشاعر کی تھی ۔ ان کی ٹھوڑی لمبی اور بال سیاہ تھے۔ یہ جلباب اور عمامہ پہنتے ، سرخ رومال میں ایک کتاب بغل کے نیچے رہتی ، آواز بلند تھی ، نماز عشا کے بعد ایک قریبی قہوہ خانے میں چلے جاتے اور اونچی کرسی پر جا بیٹھتے ۔ ان کے ارد گرد لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے پھر وہ رومال کھول کر عنترہ[1] ، زیر سالم[2] یا ظاہر بیبرس[3] کا قصہ نکالتے اور اونچی آواز سے پڑھنے لگتے ۔ بہادری کا ذکر آتا اور جوش و شکست کا ذکر آتا تو نرمی اور آہستگی سے کام لیتے ۔ اشعار گا کر پڑھتے ۔ قصے میں دو فریق ہوتے تو حاضرین میں بھی دو گروہ بن جاتے اور وہ اپنے اپنے بہادر کی حمایت کرتے ۔ ایک فریق شیخ احمد کو رشوت دیتا کہ وہ مجلس کا اختتام اس کے بہادر کی بہادری کے اعلان پر کرے ۔ قہوہ خانہ کا مالک ان کو الگ اجرت دیتا تھا کیونکہ وہ قہوہ خانہ کی رونق اور بھیڑ کا سبب تھے ۔

دوسری عجیب و غریب شخصیت شیخ احمد الصبان کی تھی ۔ پہلے وہ کوئلہ کی دوکان کرتے تھے اور ان کی حالت اچھی تھی ، پھر بے رحم زمانے نے انھیں تباہ کر ڈالا ۔ وہ نابینا ہوگئے اور کاروبار سرد پڑ گیا ، روزی کمانے سے معذور ہوگئے۔ بڑا مکان چھوڑ کر ایک مختصر سے کمرے میں رہنے لگے ۔ خیرات و صدقات سے گذارا کرتے ۔ کہا جاتا ہے کہ جنات ان کے قبضے میں تھے ۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ غیب جانتے ہیں اور مستقبل کی خبر دیتے ہیں ۔ میاں بیوی

---

۱ ، ۲ و ۳ ۔ عنترہ ، زیر سالم اور ظاہر بیبرس : زمانہ جاہلیت کے ابطال ہیں جن کے بہادرانہ کارنامے قصص اور داستان کے پیرائے میں تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں قلمبند کیے گئے تھے ۔

میں میل ملاپ کرا دیتے ہیں ۔ گم گشتہ بچے اور مال مسروقہ کا پتہ بتلا دیتے ہیں ۔ یہ خبر دور و نزدیک پھیل گئی تھی ۔ دور دراز سے لوگ عجائبات دیکھنے کے لیے شیخ احمد الصبان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ۔ ان کا کام خوب چل نکلا اور حالت سدھر گئی ۔ اس کے بعد وہ دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے ۔ محلے والے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ۔ ایک گروہ کہتا کہ "شیخ احمد الصبان آسیب زدہ ہیں" دوسرا کہتا "کتنی بلند ہے وہ ذات جو اپنا بھید اپنی ضعیف ترین مخلوق کو بتلا دیتی ہے ۔"

طبقات کے لحاظ سے شرح پیدائش معکوس تھی ۔ غرباء بہت زیادہ بچے پیدا کرتے ۔ ایک خاتون کے ہاں آٹھ یا دس بچے پیدا ہوتے ۔ بعض امراء کے گھر ایک بچہ بھی نہ ہوتا ۔ شرح پیدائش کی طرح شرح اموات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ۔

حفظان صحت کا انتظام اچھا نہ تھا ۔ پانی اور کھانے کی صفائی اور پاکیزگی کی طرف دھیان نہ تھا ۔ لوگ طبیب کے نام سے نا آشنا تھے ۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو سب اپنے اپنے تجربے کی بنا پر دوا بتلاتے ۔ مریض قضا و قدر کے رحم پر ہوتا ۔ کوئی بیمار ہو جاتا تو عیادت کرنے والا دیر تک بیٹھا مریض کے پاس باتیں کرتا رہتا ۔ متعدی امراض کا پھیل جانا مشکل نہ تھا ۔ موت نے میرے بہت سے ہمجولی چھین لئے تھے :

لا تعجبن من هالک کیف ثوی
بل فاعجبن من سالم کیف نجا

ترجمہ : مرنے والے پر تعجب نہ کرو کہ وہ کیسے مر گیا ۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ زندہ رہنے والا کیسے بچ نکلا ۔

میں نے بچپن میں ایک اور عجیب منظر دیکھا تھا جو اب دیکھنے میں نہیں آتا ۔ ایک محلے کے نوجوان کاریگر دوسرے محلے کے کاریگروں سے لڑتے ۔ منشیہ' والوں کا حسینیہ' کے رہنے والوں سے ٹکراؤ ہوتا پھر جبل المقطم کے پاس مقابلہ کرنے کے لیے کوئی دن مقرر ہو جاتا ۔ وہاں جا کر دو متحارب گروہ بن جاتے ۔ لڑائی میں چھوٹے چھوٹے پتھر اور ڈنڈے چلتے ۔ اس معرکہ میں کئی زخمی اور مقتول ہو جاتے ۔ شام کو یہ جدال و قتال دوسرے دن کے وعدہ پر رک جاتی ۔ میں نے ایک دفعہ یہ منظر دیکھا تو بہت گھبرایا ۔

بدلہ اور انتقام کی آگ سینوں میں بھڑکتی رہتی ۔ جھگڑے کا یہ سلسلہ ان متحارب گروہوں سے بڑھ جاتا ۔ ایک محلے کے لوگ دوسرے محلے کے لوگوں پر اُن کی خوشی کے اوقات میں ٹوٹ پڑتے ۔ مار دھاڑ ہوتی اور خوشی غم میں تبدیل ہو جاتی ، اس طرح انتقام کا یہ چکر چلتا رہتا ۔

ہر ایک محلے کے سرے پر بازار تھا ۔ اُس میں گھر کی ساری ضروریات موجود رہتیں ۔ یہ قوم کی وحدت اجتماعی کا مظہر تھا ۔ بازار میں حیات اجتماعیہ کے سارے اسباب مہیا تھے ۔ بچوں کی تعلیم کے لیے مکتب ، اہل محلہ کے لیے مسجد ، عورتوں اور مردوں کے لیے باری باری سے غسل کے لیے حمام اور وقت کاٹنے کے لیے قہوہ خانے تھے ۔ قہوہ خانوں میں قہوہ ، چائے ، تمباکو اور دوسری چیزیں ملتی تھیں ۔ قہوہ خانے بھی متعدد تھے اور ہر ایک طبقے کے لائق ۔ خرید و فروخت کے معاملے میں لوگوں کو کسی دور کے محلہ میں جانے کی ضرورت نہ تھی اسی وجہ سے بچپن میں میری دنیا میرا

---

۱ ۔ منشیہ اور حسینیہ : قاہرہ کے دو محلے ہیں ۔

محلہ رہی تھی - کبھی کبھی گندم کی خرید کے لیے والدہ کے ساتھ غوریہ یا موسکی تک جانا ہوتا اور یہ سفر سب سے لمبا ہوتا یا میں اپنے ماموں کے گھر خلق دروازہ کے قریب چلا جاتا ، بس یہ میری دنیا تھی -

محلہ اور اس کے اطراف میرے لیے مدرسہ تھے - میں نے عامی زبان کے الفاظ ، اسالیب ، امثال اور زجل یہاں سے سیکھے جو قاہرہ کی خالص زبان کا نمونہ تھے - یہ محلہ فصیح زبان کا بھی مرکز تھا جہاں علمائے لغت دور دراز سے زبان سیکھنے آتے - میں نے شہری عادات اور رسم و رواج یہیں سے سیکھے - یہاں میں نے تمام طبقات چھوٹے ، متوسط اور بڑے کی عادات کے اختلاف اور ان کی خوشی اور غم کی تقریبات کا مشاہدہ کیا -

ایک دفعہ ایک خاتون کی محفل دیکھی جس کی نسبت بیان کیا جاتا تھا کہ اس کو جن چمٹ گیا ہے - یہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں - ایک دوسری عورت آئی جس کے ساتھ بہت سے مرد اور عورتیں تھیں جن کے ہاتھ میں ڈھول تھے- آتے ہی انھوں نے " یاسلام سلم" کا نعرہ لگایا جس پر کوئی بھی نہ ہلا - پھر ایک عورت نے جس کا نام کودیہ تھا " صلوات اللہ علیہ وسلم " کا نغمہ ڈھول پر گایا جس سے حاضرین میں بعض عورتیں تھرکنے اور ناچنے لگیں - کبھی تو وہ سر کو ہلاتیں - کبھی بال لٹکا لیتیں تو کبھی الٹ دیتیں - یہ سب غیر شعوری طور پر حرکت کر رہی تھیں - گھر میں بخور روشن تھا جس سے اعصاب میں سکون پیدا ہو چلا تھا - اس کے بعد مرغ اور جوڑے ذبح کیے گئے - آسیب زدہ خاتون کے کپڑے اس خون سے رنگے گئے - اس وقت کودیہ عجیب و غریب نغمے الاپ رہی تھی جو میں سمجھ نہیں سکا لیکن میرے اعصاب بالکل غیر متاثر تھے ،

یہ منظر عجیب و غریب تھا ۔ آسیب زدہ خاتون نے سب کو الوداع کہا ، اب اس کو بیماری سے شفا حاصل ہو چکی تھی ۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ شعائر دینی اور اہل محلہ اور دوکانداروں کے سودے مسجد میں ہوتے تھے۔ حماموں میں مرد اور عورتیں نہانے کے لیے جاتے۔ ان عملی اسباق اور قیمتی تجارب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ جب میں ان تجربات کے بارے میں جو میں نے اپنے محلے میں حاصل کیے ہیں ، اپنی ذات اور اپنی اولاد کا مقابلہ کرتا ہوں جس نے دوسری قسم کی تربیت پائی ہے تو بڑا فرق محسوس کرتا ہوں ۔ وہ نہ پڑوسی کو جانتے ہیں نہ محلے والوں سے ملتے ہیں ۔ ہماری اور ان کی تربیت میں تجربات کی کثرت اور زبان کے ذخیرہ الفاظ کی معرفت ، قوم سے واقفیت میں بڑا اختلاف محسوس ہوتا ہے ۔

——:o:——

۷

مکتب

میرا تیسرا مدرسہ مکتب تھا ۔ اس زمانے میں پرائمری اور مڈل سکول بہت کم تھے ۔ یہ ترقی یافتہ سکول میرے گھر سے بہت دور تھے ۔ میرے والد نے میرے لیے وہ مکتب پسند کیا جو محلے کے دروازہ کے قریب تھا ۔ اس کے ایک جانب کنواں بھی تھا ۔ اس کمرہ کا اثاثہ ایک بڑی سی پرانی چٹائی تھی ۔ اس کی بعض تیلیاں ٹوٹ گئی تھیں ۔ پانی پڑنے سے یہ چٹائی میلی اور سیاہ ہو گئی تھی ۔ اس پر لکڑی کا پردہ پڑا رہتا ۔ اس میں بڑی سی رسی بندھی ہوئی تھی جس سے آب خورہ لٹکایا ہوا تھا ۔ اس آب خورہ سے تندرست اور بیمار، گندے اور صاف آدمی آ کر پانی پیتے ۔ ایک چھوٹا سا صندوق تھا جس میں تختیاں رکھی رہتیں ۔ بعض تختیاں زنگ آلود تھیں اور بعض کا رنگ و روغن اتر چکا تھا ۔ بعض پر قرآن پاک کی آیات لکھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں ۔ ہمارے یہ استاد عمامہ و قبا پہنتے اور ہاتھ میں لمبا سا عصا رکھتے ۔ دیوار میں بڑی سی میخ گڑی ہوئی تھی جس میں چرخی لگی ہوئی تھی اور اس میں موٹا سا ڈنڈا پڑا ہوا تھا جس کی لمبائی ایک میٹر کے قریب ہوگی ۔ اس میں دو سوراخ نکال کر رسی ڈالی ہوئی تھی ۔ ہمارے استاد جب کسی شاگرد کو مارنا چاہتے تو اس کے پاؤں کو رسی سے باندھ کر لکڑی سے کس دیتے ۔ اس سے پاؤں حرکت نہ کر سکتے پھر وہ شاگرد کی خوب مرمت کرتے ۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کھجور کی لمبی سی ٹہنی بھی رہتی جس سے

وہ دور بیٹھے ہوئے شاگرد کو مار سکتے تھے ، بس یہ تھا ہمارے مدرسہ کا ساز و سامان - ہم صبح سویرے جاتے ، آلتی پالتی مار کر ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھتے اور صندوق سے اپنی تختیاں نکال لیتے - میری تختی نئی تھی کیونکہ میں تو نیا نیا داخل ہوا تھا - ہمارے اُستاد کا مددگار بھی تھا جو بچوں کی لکھائی اور مار پیٹ میں اس کی مدد کرتا اور اس کی غیر حاضری میں اس کا قائم مقام ہوتا - ہر شاگرد اپنے سبق کے مطابق پڑھتا - کوئی الف - باء پڑھتا تو کوئی سورۂ فاتحہ اور کوئی تبارک الذی - بچے جب درس سے فارغ ہو جاتے تو جو کچھ قرآن حفظ کیا ہوتا وہ سناتے - کھانے کا وقت آتا تو اُستاد ہر ایک شاگرد سے اس کے مقدور کے مطابق قرش یا نصف قرش یا حلیم لیتا - مددگار اُستاد دو سبز رکابیاں لے آتا - ایک میں سبزی اور شوربا اور دوسری میں سرکہ وغیرہ ہوتا - ان کے اردگرد ہم بھی روٹیاں لے کر بیٹھ جاتے اور شوربا یا سرکہ میں لقمہ بھگو کر کھاتے - بچوں میں تندرست ، بیمار ، صاف اور گندے سبھی قسم کے ہوتے - ہمارا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہی تھا کیونکہ برکت چھوت چھات کو روکتی ہے - پڑھتے وقت ہم خوب ہلتے اور شور مچاتے - اگر کوئی نہ ہلتا یا شور نہ مچاتا تو اُس پر ڈنڈا پڑتا ، پھر وہ روتے ، چلاتے ہوئے پڑھنے لگ جاتا - ہمارا یہ حال عصر کے قریب تک رہتا - اس کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے - کبھی کبھی کسی بچے کا باپ آ نکلتا - وہ بچے کی پڑھائی کے متعلق پوچھتا اور سختی کرنے کو کہتا - اس پر اگر بچے مردہ اور شکستہ خاطر پائے جاتے تو کوئی تعجب کا مقام نہ تھا - اسی وجہ سے میں مکتب اور میاں جی کے نام سے گھبراتا تھا - ایک دن میں اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ درس کے تصور سے میرے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا - مجھے خیال

آیا کہ میں سبق پڑھتے ہوئے نہیں ہلا اور میاں جی کا ڈنڈا مجھ پر برس رہا ہے۔

ہفتہ کی صبح سے مجھے نفرت تھی اور جمعرات کی شام سے محبت، کیونکہ جمعہ کو ناغہ ہوتا تھا۔

اس فرسودہ طریقہ پر میں نے الف ۔ با ختم کر لی ۔ دس سال کی عمر تک بغیر سوچے سمجھے اسباق کو رٹتا رہا ۔ میں مکتب، میاں جی اور پڑھائی سے نفرت کرتا اور ایک مدرسہ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور چوتھے تک منتقل ہوتا رہتا ۔ اسلوب تعلیم کے لحاظ سے سب مکتب یکساں تھے ۔ ہاں کوئی کمرہ چھوٹا تھا تو کوئی بڑا ۔ کوئی میاں جی بینا تھے تو کوئی نابینا ۔

ہمارے دوسرے مکتب کے استاد عجیب و غریب اطوار کے تھے ۔ کبھی ہوش و حواس کی باتیں کرتے تو کبھی پاگل پن کی ۔ کبھی سختی کرتے تو کبھی نرمی ۔ کبھی ہنستے تو کبھی روتے ۔ راستہ چلتے تو چھوٹے بچے انہیں دیکھ کر ہنستے ۔ میں نے ایک ایسا کام کیا تھا جس کا ذکر مناسب نہیں جس پر دو لڑکوں نے میرے پاؤں کو چرخی کی رسی سے باندھ کر کھجور کی شاخ سے مجھے خوب پیٹا اس سے میرے دونوں پاؤں لہولہان ہو گئے اس کے بعد دو لڑکے مجھے گھر چھوڑ گئے پھر میں نے مکتب کا رخ نہیں کیا ۔ میں نے ان مدرسوں میں پانچ سال تعلیم پائی ۔ ان پانچ برسوں میں، میں نے قرآن پاک حفظ کر لیا اور نوشت و خواند سے آگاہی حاصل کر لی ۔ جمعہ کے دن یا فرصت کے اوقات میں اپنے والد سے کچھ نہ کچھ نئی باتیں یاد کرتا یا پرانے اسباق سناتا ۔

ہمارے اس زمانے کا موجودہ زمانے کے بچوں سے کیا مقابلہ ہے ۔ آج بچے جدید قسم کے مدارس میں جاتے ہیں ۔ خوش اطوار اور ظریف

خواتین جدید طرز تعلیم کے مطابق ان کو پڑھاتی ہیں ۔ کھیل سے تدریجاً پڑھائی کی طرف لے جاتی ہیں ۔ تصویروں اور قصوں کی مدد سے تعلیم دیتی ہیں ۔ آج تعلیم ایک قسم کی میٹھی چیز بن گئی ہے اور دن کا اکثر حصہ کھیل تماشے میں گذرتا ہے ۔ لطیف اور ظرافت آمیز گانے بچوں کو سنائے جاتے ہیں ۔ ہر روز ڈاکٹر طبی معائنہ کی غرض سے سکول آتے ہیں ۔ مریض بچہ صحت کا سارٹیفکیٹ لانے پر دوبارہ مدرسہ میں داخل ہو سکتا ہے ۔ آج سرکہ اور ترکاریوں کے بجائے دودھ ، بسکٹ اور چائے ملتی ہے غرضیکہ اس قسم کی بے شمار نعمتیں ہیں ۔ مجھے ایام ماضی کی زیادہ سختی اور اپنے بچوں کی زیادہ آسائش دونوں ناپسند ہیں ۔ تعلیم کی قسم وہی اچھی ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں کی عکاسی کرے ۔

میں اس وقت اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کھیل کود سے دل بہلا لیا کرتا تھا ۔ ہم گیند سے کھیلتے یا کبڈی ۔ پھر گھر میں میری نانی کی باتیں اور میرے بھائی کا بعض کتابوں کو پڑھ کر سنانا دل لگی کا باعث ہوتا اور بس ۔

——:o:——

۸

مدرسہ

میرے ماحول نے میرے ذوق اور جمالیاتی شعور کو ختم کر دیا تھا ۔ (محلہ میں) شیخ صاحب کے گھر کو چھوڑ کر سارے گھر کچے اور مٹی کے بنے ہوئے تھے ۔ سوائے بارش کے ان پر کبھی پانی نہ پڑتا یا مکین نالیوں اور دھوون کا پانی باہر ڈال دیتے ۔ کبھی کبھی یہ گندہ پانی کسی گذرنے والے پر پڑ جاتا تو لڑائی اور گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی ۔ سڑکیں اور بازار گندے تھے ۔ جاروب کشی اور جھڑکاؤ کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ پتے ، چھلکے ،گوبر وغیرہ جہاں کے تہاں پڑے رہتے ۔ سڑکیں شاملات دیہہ کا منظر پیش کرتی تھیں ۔ ہمارے گھروں میں جمالیاتی ذوق کی تربیت کا بالکل انتظام نہ تھا ۔ ان میں نہ کوئی خوبصورت تختی لگی ہوتی نہ تصویر نہ پھول ۔ بس لے دے کر میرے والد نرگس کے موسم میں نرگس کے پھول لے آتے اور ایک گلدستہ سا بنا کر پانی کے بخورے میں رکھ دیتے اور وقتاً فوقتاً اسے سونگھتے رہتے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ نرگس کو کیوں پسند کرتے تھے حالانکہ اس کا موسم بالکل مختصر ہوتا ہے اور وہ اتنا خوبصورت بھی نہیں ہوتا ۔ اس سے تو گلاب اور یاسمین کے پھول زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں پھر وہ سستے اور ان کا موسم بھی لمبا ہوتا ہے ۔ میرے خیال میں اس پسند میں ان کے جمالیاتی ذوق کو دخل نہ تھا ۔ میرا گمان ہے کہ انھوں نے حدیث میں اس کی تعریف پڑھی تھی کہ نرگس برسام کو روکتا ہے ۔ برسام بھی جنون کی

ایک قسم ہے لہٰذا وہ عامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے نرگس خرید لیا کرتے تھے ۔ اس معمولی سے نظارہ کو چھوڑ کر ہمیں ہر جگہ ، راستے میں محلے میں مکتب میں بدصورتی ہی نظر آتی ۔ چٹائی ، استاد ، زائرین اور مزدوروں کا منظر گھناؤنا ہوتا ۔ یہ سب کچھ جمالیاتی شعور کو مردہ کرنے کے لیے کافی تھا اور جمالیاتی شعور بڑی نعمت ہے ۔ بچے کا اخلاق استوار کرنے کے لیے ذوق تربیت سب سے اچھی چیز ہے ۔ بہرحال میں اپنے والد کا شکر گذار ہوں کہ مجھے ان بدصورت مکاتب سے نکال کر ایک پرائمری مدرسہ میں داخل کر دیا جس کا سرکاری نام مدرسہ والدہ عباس پاشا اول تھا ۔ یہ مدرسہ مثالی قسم کا تھا ۔ اس کی عمارت نہایت شاندار اور خوبصورت تھی ۔ کمرے فراخ اور فرش سنگ مرمر کا تھا ۔ چھت سنہرے نقوش سے مزین تھی ۔ خطاطوں نے سنہری حروف میں قرآن پاک کی آیات باہر لکھی ہوئی تھیں ۔ پرانی بدصورتی کے بدلے یہ نئی خوبصورتی کتنی خوش آئند تھی ۔

میں نے جلباب چھوڑ کر کوٹ اور دیسی ٹوپی کے بجائے طربوش پہن لی ۔ اس سے میں اپنے آپ کو بڑا خیال کرنے لگا ۔ متوسط اور اعلیٰ گھرانوں کے طالب علموں سے میرا میل جول بڑھا جن کی صفائی اور خوبصورتی میں مکاتب کے بچوں سے کوئی نسبت نہ تھی ۔

مدرسہ کا خرچ اوقاف سے چلتا جن کو والدہ عباس اول[1] نے قائم کیا تھا ۔ پڑھائی مفت تھی ۔ مدرسہ کی بعض روایات تھیں ۔ سال میں دو مرتبہ بعض بچوں کو پوشاک دلوانے کی خاطر والدہ عباس الاول کے محل میں لے جایا جاتا ۔ بچوں کو ایک جوڑا سردیوں میں ملتا اور دوسرا گرمیوں میں ۔ بچے نیا جوڑا پہن کر سڑک پر نکلتے ۔ گویا

---

۱ ۔ عباس الاول : جو ۱۸۴۸ ۔ ۱۸۵۰ء تک خدیو مصر رہے ۔

یہ واقفہ کی نیکی کا اعلان تھا۔ تیوہاروں پر واقفہ کی قبر پر طالب علم فاتحہ اور دعا پڑھنے جاتے تو اُن کو نان اور حلوا ملتا۔

میں نے اس مدرسہ میں تعلیم کے تین ادوار دیکھے۔ پہلے قرآن پاک کے علاوہ معمولی حساب اور ترکی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر ان چیزوں کو چھوڑ کر قرآن پاک حفظ کرایا جاتا اور اس کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ اور فرانسیسی زبان کی تعلیم دی جاتی لیکن یہ انتظام بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے مدرسہ چھوڑنے سے پہلے ایک جدید منظر دیکھا یعنی فرانسیسی زبان میں کمزور طلبہ کو انگریزی سکھانے کے لیے جمع کیا جاتا۔ پھر انگریزی زبان نے فرانسیسی زبان کی جگہ پر قبضہ کر لیا۔

میں پہلے درجہ حفظ میں اور پھر دوسرے سال فرانسیسی زبان کے درجے میں داخل ہوا۔

میرے والد نے میرے لیے تعلیم کا سخت پروگرام بنایا تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ بوجھ میں نے کس طرح اُٹھایا۔ وہ مجھے صبح سویرے جگاتے اور میں اُن کے ساتھ نماز پڑھتا۔ پھر ایک سیپارہ پڑھ کر نحو میں الفیہ ابن مالک[1] حفظ کرتا۔ سورج نکلنے پر ناشتہ کرتا اور کپڑے پہن کر مدرسہ چلا جاتا جہاں ظہر تک اسباق ہوتے۔ پھر سکول میں جلدی جلدی کھانا کھا کر مسجد شیخون چلا جاتا۔ یہاں مدرسہ کے فقیہ کو قرآن پاک کا ایک جز سناتا۔ مدرسہ کی گھنٹی بجتی تو واپس مدرسہ پہنچتا اور بعد ظہر تک مدرسہ میں شریک رہتا۔ جب چھٹی کا گھنٹہ بجتا تو اپنے گھر واپس آتا۔ مدرسہ کے کپڑے اتار کر

۱۔ ''الفیہ ابن مالک'' (۶۰۰ - ۶۷۲ھ) نحو کی مشہور کتاب ہے جس میں نحو کے مسائل کو نظم کیا گیا ہے۔

جلباب پہن لیتا اور اس مسجد میں چلا جاتا جہاں کہ میرے والد پیش امام تھے - یہاں مغرب سے لے کر عشا تک ان کا درس سنتا ، پھر ان کے ساتھ گھر واپس آتا - راستہ میں ایک دو شعر بھی حفظ کر لیتا - والد ان کے اعراب پوچھتے تو اعراب بتلا دیتا - وہ میری غلطیوں کی اصلاح بھی کر دیتے - یہ سب کچھ راستہ چلتے ہوئے ہوتا - پھر ہم کھانا کھا کر سو رہتے - میں والد کے پاس جانے سے پہلے جلدی سے سکول کا کام بھی ختم کر لیا کرتا تھا اور سوائے جمعرات کی شام اور جمعہ کے روز کے مجھے کوئی آرام نہ ملتا -

اس عجیب و غریب قسم کے پروگرام کا یہ سبب تھا کہ میرے والد میرے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے - وہ سوچتے رہتے کہ مجھے دینی تعلیم کے لیے ازہر بھیج دیں یا پرائمری اور مڈل سکولوں میں رکھیں - وہ اس معاملہ میں سمجھدار لوگوں سے بھی مشورہ کرتے لیکن ان کو کوئی بھی مطمئن نہ کر سکتا - کوئی ایک مدرسہ کی صلاح دیتا تو کوئی دوسرے کی - انھوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا - وہ مجھے ازہر میں قرآن پاک اور متون کے حفظ کے لیے بھیجتے اور دوسرے مضامین کی تعلیم کے لیے سرکاری مدارس میں - یہ حل کچھ اچھا نہ تھا - انھوں نے میرے مستقبل کی فکر میں جتنی تکلیف اٹھائی ہے ، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور میری پڑھائی میں جو سختی کی ہے ، اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے -

کبھی کبھی یہ تنگی میری ناراضگی کا سبب بھی بن جاتی - میں ظہر کے وقت فقیہ صاحب اور عصر کے بعد اپنے والد کے پاس نہ جاتا یا بیماری کا بہانہ کر لیتا ، جس کے بدلے میں مجھے سخت زد و کوب کیا جاتا تو میرا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ جاتا - میری والدہ مار پیٹ کے وقت مداخلت تو کرنا چاہتی لیکن ڈرتی کہ اگر اس شدید غصہ کے

وقت بیچ میں پڑی تو وہ بھی نہ بچ سکے گی ۔ وہ صرف دور کھڑی ہو کر روتی اور چلاتی رہتی ۔ میں اس مدرسہ میں پڑھتا رہا ۔ والد سے پڑھنے کی وجہ سے عربی زبان میں خوب ہوشیار ، حساب میں اوسط درجہ کا اور فرانسیسی زبان میں کمزور تھا کیونکہ والد نے ان مضامین کی تعلیم کے لیے زیادہ وقت نہ چھوڑا تھا ۔ میں نے اس مدرسہ میں تعلیم سے زیادہ زندگی کے تجربے حاصل کیے ۔ میرا دوسرے طالب علموں سے کھیلنا ، ان کا اپنے اپنے مزاج اور سمجھ بوجھ کے مطابق کام کرنا ، غصہ اور حلم ، ظلم و انصاف ، یہ سب علم سے زیادہ زندگی کا درس تھے ۔ خود مدرس مختلف قسموں کے تھے ۔ کوئی خوبصورت تھا تو کوئی بد صورت ۔ ایک متکبر تھا تو دوسرا مسکین ۔ فرانسیسی زبان کا استاد سست رفتار ، کند زبان اور ٹیڑھی قسم کا انسان تھا ۔ آنکھیں بڑی اور شراب کے اثر سے سرخ رہتیں ۔ اس کو شاگردوں کا مطلقاً خیال نہ تھا ۔ پڑھیں یا نہ پڑھیں ۔ یاد کریں یا نہ کریں ۔ حساب کا مدرس طلباء کا خیال رکھتا ۔ پڑھانے میں امکانی کوشش کرتا لیکن عجیب قسم کا انسان تھا ۔ کبھی کبھی غصہ سے بھڑک اٹھتا تو مارنے لگ جاتا ۔ مار اتنی سخت ہوتی کہ ہڈی ٹوٹ جاتی یا شاگرد زخمی ہو جاتا ۔ ہنسنے ہنسانے پر آ جاتا تو حد ہو جاتی ۔ گھر کی باتیں اور دل کے راز بتلا دیتا ۔ عربی زبان کا مدرس ہر بات میں نکتہ پیدا کر لیتا ۔ نہ مارتا نہ پیٹتا لیکن تمسخر اور استہزاء سے کام لیتا ۔ دینیات کا مدرس ایک شامی تھا ۔ وہ شامیوں کا لباس جبہ ، قبا اور ترکی ٹوپی پہنتا ۔ بھاری بھرکم اور ثقیل روح تھا ۔ طلبہ اور مدرسین اس کو بوجھ سمجھتے اور بعض تو ہمیں چھیڑنے پر آکساتے اور ہم چھیڑنے کے مختلف حیلے بہانے ڈھونڈتے ۔ اس کا سبق ہنسی مذاق کا موجب تھا ۔ لہذا ہم بہت خوش رہتے ۔ لکھائی کا مدرس

ترک تھا جو خوبصورت اور خوش رو تھا۔ داڑھی لمبی تھی۔ دیکھنے والے تعظیم کرتے۔ وہ مشرقی ترکی کا لباس پہنتا اور ترکی لہجے کے ساتھ عربی بولتا۔ خاموش طبع اور پرسکون چال کا برہا تھا۔ اس کی آواز مدھم تھی، نہ مارتا اور نہ گالی دیتا۔ سب اس کی عزت کرتے۔ اس کے پیریڈ میں کوئی بھی آواز نہ نکالتا۔ ناظر مدرسہ (سپرنٹنڈنٹ) طبیب تھے لیکن بچوں کی تربیت کی سمجھ نہ تھی۔ ایک طالب علم نے کاغذ چرا لیا تھا۔ آپ نے اس کے گلے میں ایک کاغذ پر "یہ چور ہے" لکھ کر باندھ دیا اور تادیب کی خاطر اس کو سب لڑکوں کے سامنے پھرایا۔ اس کے بعد میں نے اس طالب علم کو مدرسہ آتے نہیں دیکھا۔ بے چارے نے شاید ہمیشہ کے لیے پڑھائی چھوڑ دی۔ اس مدرسہ کے شاگرد اور استاد ان روایات کے مظہر تھے جو زندگی، حرکت اور مناظر سے بھرپور ہے، جو اچھے ہیں اور برے بھی۔

میں اس نوعمری میں نہایت دیندار تھا۔ مدرسہ میں چھوٹی سی مسجد تھی، اس کو خوب صاف رکھتا۔ وقت پر نماز پڑھتا۔ رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز بھی پڑھتا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا اور اس سے ڈرتا رہتا۔ میں خضوع و خشوع سے دعا مانگتا تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ لمبے سجدے کرتا اور دیر تک دعا مانگتا رہتا۔ مجھے بہت سی دعائیں یاد تھیں۔ میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت بھی کی تھی۔ دیکھا کہ کمرے میں نور ہی نور چھایا ہوا ہے۔ مجھے کہا کہ میری قدرت دیکھنے کے لیے کچھ مانگو۔ میں نے لوہے کی چھری اور لکڑی کی جالی بنانے کی درخواست کی اور یہ دونوں چیزیں بن گئیں تو میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان لے آیا۔ میں نے یہ خواب گھر والوں کو سنایا تو سبھی خوش ہوئے اور پہلے سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے لگے۔

میں دوسری جماعت سے تیسری جماعت اور تیسری سے چوتھی جماعت میں چڑھ گیا لیکن میرے والد کو فکر لگا رہا کہ میں اسی مدرسہ میں پڑھتا رہوں یا ازہر میں داخلہ لے لوں ۔ وہ کسی سرکاری ملازم سے پوچھتے تو وہ مجھے اسی مدرسہ میں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیتا ۔ مشائخ ازہر سے مشورہ کرتے تو مجھے ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کی صلاح دی جاتی ۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کر کے مجھے ازہر میں داخل کرا دیا ۔

—:o:—

۹

ازہر

اب میری عمر چودہ برس کی ہو چلی تھی ۔ میں نے سکول کا لباس چھوڑ کر جبہ اور عمامہ پہن لیا ۔ لوگ محلے یا رستے میں مجھے دیکھتے تو یہ لباس دیکھ کر حیران رہ جاتے کیونکہ جبہ یا عمامہ بزرگ اور مشائخ ہی پہنا کرتے تھے اور جب وہ مجھے عمامہ باندھے ہوئے دیکھتے تو ہنستے ۔ سڑکوں پر بچے مجھے کنکھیوں سے دیکھتے اور میں شرم اور گھٹن محسوس کرتا ہوا لوگوں سے خالی رستہ تلاش کرنے لگتا ۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ مدرسہ کے ہمجولی سمجھتے کہ میں نے ہیئت تبدیل کر لی ہے اور بدو بن گیا ہوں گویا کہ میرے اور ان کے درمیان وحدتِ لباس ہی میل ملاپ کا ذریعہ تھا نہ کہ ہم عمری ۔ وہ میرے اشتیاق کے باوجود مجھ سے دور ہوتے گئے ۔ میں تنگ دل سا رہتا کیونکہ قدیم دوست بچھڑ گئے تھے اور نئے دوست مل نہ سکے ۔ میں اُس شاخ کی طرح تھا جو درخت سے ٹوٹ گئی ہو یا کوئی بکری اپنے ریوڑ سے جدا ہوگئی ہو یا مسافر کسی اجنبی شہر میں داخل ہوگیا ہو ۔ میں اپنے والد کی منت سماجت کرتا کہ مجھے پگڑی وغیرہ باندھنے سے معاف رکھیں اور مدرسہ واپس بھیج دیں لیکن انھوں نے ایک نہ سنی ۔ مجھے محسوس کرکے دکھ ہوتا کہ عمامہ میرے لیے ایک قسم کی بیڑی بن گیا ہے جس کی وجہ سے میں نہ تو بچوں کی طرح چل سکتا اور نہ جوانوں کی طرح خراماں ٹہل سکتا ہوں ۔ میں وقت سے پہلے بوڑھا ہوگیا تھا بچہ جب بتکلف بوڑھا

بلے تو اس بوڑھے کی طرح ہو جاتا ہے جو لڑکا بننا چاہتا ہو ۔ یہ دونوں ہی منظر بوجھل اور ناپسندیدہ ہیں ۔ میں یہ سب کچھ خون کے گھونٹ پی کر برداشت کرتا رہا ۔

ایک دن میرے والد مجھے علی الصبح ساتھ لے کر غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے ، کافی مسافت طے کرنے کے بعد ایک بڑی عمارت میں داخل ہوئے اور کہا کہ یہی ازہر ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس لفظ کا میرے دل پر کیا اثر ہوا کیونکہ ازہر ایک گہری قسم کی چیز تھی جس کی کنہ ، نظام ، طریق اور مستقبل کو میں نہ جانتا تھا ۔ دروازے سے داخل ہونے پر مکھیوں کے بھنبھنانے کی سی آواز سنائی دی جو سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ اس سے میں ڈرا ۔ میرے والد نے دروازے پر جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیے ، میں نے بھی ایسا ہی کیا ۔ ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل کر ایک بڑے دالان میں داخل ہوا جس کی آخری حد دکھائی نہ دیتی تھی ۔ فرش پر چٹائی پڑی ہوئی تھی اور ستونوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں ۔ ہر ستون کے پاس ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس کو لوہے کی زنجیر کے ساتھ باندھا ہوا تھا ۔ کرسی پر ایک بزرگ عمامہ پوش ، میرے والد جیسے بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کے ہاتھ میں زرد رنگ کی کتاب جیسی کوئی چیز تھی ۔ ان کے سامنے کھلا یا بند حلقہ تھا ۔ طلباء سفید قبا یا سفید جلباب اور سیاہ عبا پہنے ہوئے تھے ۔ شیخ صاحب پڑھتے یا تشریح کرتے اور طلبہ خاموشی سے سنتے ۔ ان ستونوں کے درمیان بعض طلبہ اکٹھے ہو کر کھانا کھاتے یا باتیں کرتے ۔

میں نے اس مجمع کو حیرت اور دہشت سے دیکھا ۔ بعض جگہ اپنی پرانی کتابوں کی طرح کتابیں دیکھیں اور سمجھا کہ ازہر میں تعلیم کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے بلکہ اصل مقصود کتابوں کا ختم کرنا ہے ۔

پھر ہم اس ایوان سے باہر نکل کر ازہر کے صحن میں گئے ۔ یہ صحن کھلا اور کچا تھا ۔ ادھر آدھر سفید اور سیاہ کپڑوں پر دھوپ میں روٹیاں سکھائی جا رہی تھیں ۔ میرے پوچھنے پر والد نے بتلایا کہ یہ طالب علموں کا توشہ ہیں جو گاؤں سے وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں یا ان کے والدین بھیج دیتے ہیں اور وہ ان کو دھوپ میں سکھا کر رکھ چھوڑتے ہیں ۔ یہ تھی ازہر کی کائنات جو میں نے پہلی دفعہ دیکھی ۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے بھی چٹائی پر بیٹھ کر حلقہ میں شامل ہونا پڑے گا اور دوسرے طالب علموں کی طرح شیخ صاحب سے درس سننا اور ستونوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانا ہو گا ۔ میں نے ازہر کی چٹائی کا ، مدرسہ کی کرسی سے اور مدرسہ کے آستاد کا ، ازہر کے شیخ سے ، ازہر کے صحن کا ، جہاں روٹیاں سکھائی جاتی تھیں ، مدرسہ کے کھیل کے میدان سے ، مقابلہ کیا تو غمگین ہوا ۔ مجھے ازہر کے ایک رواق کی طرف لے جایا گیا جہاں ایک شیخ صاحب نے داخلے کا فارم لے کر قرآن پاک کا امتحان لیا ۔ میں نے خوب جوابات دیے اور انھوں نے مجھے داخل کر لیا ۔ ہم ایک دوسرے دروازے سے باہر نکلے جس کا نام باب المزینین تھا ۔ جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اس کا نام باب المعاہدہ تھا ۔ باب المزینین کا نام اس لیے رکھا گیا کہ اس کے سرے پر آستادوں اور طالب علموں کے لیے حجاموں کی دوکانیں تھیں ۔ اس دروازہ پر طلبہ کا گروہ تھا جو روٹیاں بیچتا تھا ۔ میں نے اس کے متعلق والد سے پوچھا تو آنھوں نے جواب دیا کہ جب ازہر کے طلبہ آونچی جماعتوں میں پہنچتے ہیں تو ان کو تین یا چار روٹیاں ہر روز ملتی ہیں یہ ان کی ضروریات سے زائد ہوتی ہیں ۔ وہ ان میں سے کچھ بیچ کر سالن خرید لیتے ہیں ۔ ہر ازہری عالم کو دس یا اس سے زیادہ روٹیاں ملتی ہیں اور جب تم بھی بڑی جماعتوں

میں جاؤ گے تو تمھیں بھی اتنی ہی ملیں گی ۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس طرح کھڑے ہو کر نہ بیچنا ۔

میں گھر واپس آیا تو غم سے نڈھال تھا ۔ میرا مدرسے اور ہمدرسوں سے تعلق ٹوٹ گیا تھا ۔ پرانی یادیں بھی محو ہو چکی تھیں ۔ میرے دل میں نئی زندگی رس بس گئی تھی اور میں جدید ماحول سے مانوس ہو چلا تھا ۔

ازہر کے دفتر میں نام لکھانے کے بعد طالب علم آزاد ہوتا ہے ۔ اسے کتابیں اور استاد منتخب کرنے کی اجازت ہے ۔ مگر جب اس کا کوئی رہنما نہ ہو تو وہ اس ناپیدا کنار سمندر میں غرق ہو جاتا ہے ، کسی کو پتہ نہ چلتا کہ وہ حاضر ہے یا غائب ۔ تعلیم میں ترقی کر رہا ہے یا اُلٹا پیچھے ہٹ رہا ہے ۔ سال کے آخر میں کوئی امتحان نہ ہوتا اور نہ اس کو کوئی پوچھنے والا ہوتا کہ اس نے کیا پڑھا ہے ۔ طالب علم کو کسی کام کے لیے سارٹیفکیٹ لینے کی ضرورت ہوتی کہ اس نے فلاں کتاب فلاں استاد سے پڑھی ہے تو وہ سادہ کاغذ لے کر حسب منشاء کتابوں اور استادوں کے نام لکھ لیتا اور ان کے پاس لے جا کر مہریں لگوا لیتا ، چاہے اس وقت استاد نے پہلی دفعہ طالب علم کو دیکھا ہو اور اس نے یہ دقیق کتابیں سال میں دیکھی بھی نہ ہوں ۔ اس میں حرج کیا تھا ” بارک اللہ فی من نفع ۔“

والد نے میرے لیے ایک پروگرام مرتب کر دیا تھا ۔ میں صبح کو فقہ حنفی کے درس میں شرکت کرتا ۔ انھوں نے فقہ حنفی کا اس لیے انتخاب کیا تھا کہ یہ قضا کے لیے معتبر مانا جاتا تھا اور شرعی قاضی کے لیے حنفی ہونا شرط تھی ۔ اس کے بعد چاشت کے وقت میں تجوید سیکھتا ۔ ظہر کے بعد نحو کی کتابیں پڑھتا ۔ عصر کے بعد علوم عصریہ ، جغرافیہ اور حساب کے اسباق میں شریک ہوتا ۔ اس

طرح سارا دن گذر جاتا ۔ اوقات درس کا تعین گھنٹوں کے حساب سے نہ تھا بلکہ نمازوں کے اوقات سے تھا ۔ نحو کا سبق نماز ظہر کے بعد ہوتا ۔ جغرافیہ اور حساب نماز عصر کے بعد پڑھائے جاتے ۔ تفسیر اور حدیث کا درس نماز فجر کے بعد ہوتا اور فقہ کا سورج نکلنے کے بعد ۔ ان کے علاوہ شیخ محمد عبدہ[1] بلاغت اور تفسیر ، نمازِ مغرب کے بعد پڑھاتے ۔ میں پروگرام پر اس طرح عمل کرتا کہ چاہے سخت جاڑا ہو نماز فجر کے بعد اٹھ بیٹھتا ۔ والد کے ساتھ نماز فجر پڑھتا اور کپڑے پہن کر گھر سے نکل آتا ۔ اس وقت لوگ سوئے ہوتے اور خاموشی کا عالم ہوتا ۔ صرف مرغ کے اذان دینے کی یا کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ۔ گھر سے ازہر پہنچنے کے لیے لمبی مسافت طے کرنی پڑتی ۔ اس وقت نہ ٹرام تھی نہ گاڑی ، اگر موجود بھی ہوتی تو اتنی صبح اس سے فائدہ اٹھانا مشکل تھا کیونکہ گھر اور ازہر میں آدھے گھنٹے کی مسافت تھی ۔ راستے میں خمیری روٹی بیچنے والے ملتے ۔ اگر میرا ہاتھ تنگ ہوتا تو نان بائی سے ¼ قرش میں چپاتی لے لیتا ۔ نان بائی چپاتی پر تھوڑا سا میٹھا (شیرا) ڈال دیتا ۔ میں روٹی کھڑے کھڑے کھا لیتا ۔ منہ پر رومال پھیرتا ، اللہ تعالٰی کا شکر ادا کرتا اور چل پڑتا ۔ اگر میری جیب میں زیادہ پیسے ہوتے تو خود نان بائی سے روٹی لگواتا ۔ وہ گوندھے ہوئے آٹے کا ایک ٹکڑا لیتا ۔ ایک لحظہ میں اسے گول کر کے تنور میں لگا دیتا ۔ تھوڑا سا گھی لے کر اس پر چھڑکتا اور دو تین منٹوں کے بعد عمدہ پکی ہوئی روٹی باہر آ جاتی ۔ نان بائی ایک معمولی سے دسترخوان پر — جو نہ صاف ہوتا اور نہ

---

۱ ۔ شیخ محمد عبدہ (المتوفی ۱۹۰۵ء) : مصر کے مشہور مصلح عالم اور مفسر قرآن ۔

گندہ — روٹی رکھ کر اور اس پر کھانڈ ڈال کر پیش کرتا اور میں مزے سے کھا لیتا ۔ دوکان کے اندر جا کر ہاتھ منہ صاف کرتا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ۔ اگر میرے پاس زیادہ پیسے ہوتے تو میں ازہر کے قریب پہنچ کر ایک سرخ رو اور بھاری بھرکم انسان کے پاس جاتا ۔ اس کے سامنے حلوے کی بڑی سینی (تھال) ہوتی جو ایک اونچی اور گول ٹوکری پر رکھی ہوتی ۔ سینی کے درمیان خالی جگہ رکھ کر اس کو گھی سے بھرا ہوتا ۔ میں اس کو نصف قرش دیتا وہ حلوے کا ٹکڑا دے دیتا اور تھوڑا سا گھی اس پر ڈال دیتا ۔ اگر وہ زیادہ مہربانی کرتا تو مجھے وہ ٹکڑا دیتا جس پر مقشر بادام پڑے ہوتے ۔

ازہر کے قریب ایک مسجد تھی ۔ وہاں سورج نکلنے سے پہلے پہنچ کر میں اپنے استاد کا انتظار کرتا ۔ ازہر کے اردگرد بہت سی مسجدیں تھیں جن میں ازہر کی طرح درس ہوتے تھے ۔ ان کو وہ علماء پسند کرتے جو سکون اور آزادی کے خوگر ہوتے ۔ استاد آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا اور ہم ان کے سامنے ہوتے ۔ استاد صاحب باوقار تھے ۔ صاف ستھرا لباس پہنتے ، چہرے سے صالحیت برستی ۔ وہ خوبصورت تھے اور ان کی داڑھی لمبی تھی ۔ محکمہ شرعیہ میں قاضی بھی تھے ۔ ان کا نام شیخ صلاح تھے ۔

بسم اللہ ، الحمد للہ اور دعا کے بعد وہ کہتے "کام وہی سہل ہے جس کو تو سہل کر دے اور تو چاہے تو مشکل بھی آسان بن جائے ۔" ان کے اور ہمارے ہاتھوں میں طائی کی شرح کنز الدقائق[1] رہتی ۔ درس کا موضوع وضو تھا ۔ ایک متن اور شرح پڑھتا اور یہ

---

۱ ۔ کنز الدقائق : فقہ حنفیہ کی معتبر کتاب ہے ۔

دونوں میری سمجھ میں آ جاتیں لیکن اس کے بعد تعلیقات ، اعتراضات ، سوالات اور جوابات کا وہ سلسلہ شروع ہوتا جو میری سمجھ سے باہر تھا ۔ میں بہتیرا حاضر دماغی سے بھی کام لیتا لیکن کچھ پلے نہ پڑتا ۔ اس پر میرا ذہن پریشان اور خیالات منتشر ہونے لگتے ۔ اب اس مدرسہ کی یاد ستانے لگتی جہاں کہ میں اپنے ہمجولیوں پر ہر طرح فوقیت رکھتا تھا ۔ میں اپنے خیالات میں مگن اور استاد اور شاگرد اعتراضات میں لگے رہتے ۔ ان کے سوالات اور جوابات میری سمجھ میں نہ آتے ۔ یہ حالت دو گھنٹے یا زائد تک جاری رہتی اور جب " واللہ اعلم" کہہ کر درس ختم کر دیتے تو جان میں جان آتی ۔ تمام طلبہ کھڑے ہو جاتے اور مدرس صاحب کے ہاتھ چومتے لیکن میں نے یہ حرکت کبھی نہ کی ۔

اس مسجد سے نکل کر ہم ازہر میں جاتے۔ طلبہ کی عادت تھی کہ وہ فقہ کے درس کے بعد ناشتہ کرتے ۔ ازہر کے بڑے دالان ، صحن اور رواقوں میں دسترخوان بچھ جاتے ۔ ان کے گرد تین تین یا چار چار کا حلقہ ہوتا ۔ کھانے میں مختلف قسم کی سبزیاں اور ساگ بھات ہوتے ۔ طلبہ کھانے پر ٹوٹے پڑتے ۔ جب کھانا کھا لیتے تو بقیہ کھانا وہیں چھوڑ دیتے اور مسجد کے خدام آ کر صفائی کر دیتے ۔ میں اس وقت پنیر کا ٹکڑا میٹھی چیز کے ساتھ کھاتا ۔ اس کے بعد زود رو اور کمزور نظر استاد کے پاس جا کر تجوید کا سبق لیتا ۔ میں قرآن پاک کی کوئی سورت تلاوت کرتا اور وہ علمِ قرأت کے مطابق میری اصلاح کرتے جاتے ۔ میں قرأت سے فارغ ہوتا تو میری پیشانی عرق آلود ہوتی ۔ میرے بعد دوسرے طلبہ بھی سبق کے منتظر رہتے اور مختلف قرأتوں سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ۔ پھر میں نحو کے سبق کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ۔ ازہر میں قاعدہ تھا کہ استاد کے درس دینے سے پہلے

طالب علم سبق کا اچھی طرح مطالعہ کرتے تاکہ اُستاد کے درس میں اُس کو کوئی دشواری پیش نہ آئے اور وہ اُستاد کی تشریح کے وقت مشکل مقامات پر مطلع رہے ۔ ظہر کی نماز پڑھ کر میں نحو کے سبق میں شریک ہوتا ۔ اس درس میں میرا حال فقہ سے بھی برا تھا حالانکہ فقہ کا مضمون میرے لیے نیا تھا اور نحو کو اپنے باپ سے حاصل کر چکا تھا لیکن یہاں بھی اُستاد صاحب لمبی تقریر کرتے ۔ اعتراضات اور جوابات بھی خوب ہوتے ۔ وہ عجیب و غریب قسم کے زبان آور، معترض، خود پسند انسان تھے ۔ کبھی کبھی موضوع سے باہر نکل جاتے ۔ کہا کرتے تھے کہ دلیا میں صرف دو جیبی گھڑیاں بنائی گئی ہیں ۔ ایک تو وہ جو اُن کی جیب میں رہتی ہے اور دوسری قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی کے پاس ۔ اُن کے گھر میں ہزاروں کتابیں تھیں جن کی جلدیں سنہری تھیں ۔ وہ خدیو عباس[1] کے ساتھ گھنٹوں اہم امور سلطنت کے متعلق رازدارانہ گفتگو کرتے اس کے ساتھ وہ ہنس مکھ اور شیریں کلام بھی تھے ۔ اُن کی باتیں ظاہر میں خوشنما اور باطن میں خالی خولی ہوتیں ۔ سبق ختم ہو جاتا تو میں اس مشقت سے نجات پا کر جغرافیہ اور حساب سیکھنے الموید کی مسجد میں چلا جاتا ، وہاں جا کر میں بھی سوالات پوچھتا اور جوابات اچھی طرح سمجھتا کیونکہ یہ مدرس ہمارے پہلے مدرسہ سے آئے ہوئے تھے ۔

مصیبت یہ تھی کہ میرے اور دوسرے شاگردوں اور اُستادوں کے درمیان کوئی رابطہ نہ تھا ۔ میں اُن سے کچھ نہیں پوچھتا تھا ۔ چاہے میری سمجھ میں آتا یا نہ آتا ۔ اس کے علاوہ گھر کے لیے کام

---

۱ ۔ خدیو عباس حلمی : جو ۱۸۹۲ - ۱۹۱۴ء تک مصر کے والی رہے ۔

بھی نہ پوچھتا ۔

اسی طرح دن گذرتے گئے ۔ میں نے نہ تو اسباق کے سمجھنے میں ترقی کی اور نہ اسلوبِ تعلیم ہی میری سمجھ میں آیا ۔ میں نے اپنے مدرسہ میں واپس آنے کے متعلق غور و خوض کیا لیکن کچھ نہ کر سکا ۔ بھاگنے کا بھی ارادہ کیا لیکن ہمت نہ کر سکا ۔ میں نے دو نوجوان دیکھے جنھوں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے ۔ اُن کی ظاہری حالت اُن کی امارت کی غمازی کر رہی تھی ۔ وہ دونوں قاہرہ کے رہنے والے اور علماء کے لڑکے تھے ۔ گھروں میں انھوں نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی ۔ میں نے اثناء کلام میں معلوم کرلیا کہ ان دونوں کے پاس لکڑی کا صندوق ہے جو رواق کی الماری میں رکھا رہتا ہے ۔ اس میں وہ کپڑے سنبھال کر رکھتے ہیں ۔ زرد رنگ کے سلیپر بھی پہنتے ہیں جس کی وجہ سے جراب گندی نہیں ہوتی ۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن میرے والد کو میری صفائی اور فیشن پرستی ایک آنکھ نہ بھائی ۔ بلکہ ایک دفعہ میں نے پیٹی کس کر کمر میں باندھ لی تھی اور اس کا ایک سرا ڈھیلا چھوڑ دیا اور گھڑی جیب میں رکھ لی تو انھوں نے مجھے "امیر کا بچہ" کہہ کر خوب مارا ۔ اس کے بعد میں نے شوقینی چھوڑ دی ۔

یہ دونوں لڑکے میری طرح شکوہ گذار تھے ۔ دونوں کے پلے کچھ نہ پڑتا ۔ ایک نے تو ایک دفعہ بھاگنے کا بھی ارادہ کر لیا تھا ۔ اس کے بعد ہم نے ازہر کا ایک گوشہ ڈھونڈ لیا ۔ جہاں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کتاب اور اُستاد کی تکلیف سے نجات پانے کے لیے جوا کھیلنے لگے ۔ کبھی تو میں ہار جاتا اور اپنا اسباب بیچ ڈالتا ۔ میرے والد اور اُستاد میری قمار بازی سے بالکل بے خبر رہتے ۔ ان کو پتہ نہ چلتا کہ میں حاضر ہوں یا غیر حاضر ۔ میں گھر جاتا تو کہہ

دیتا کہ میں پڑھ کر آ رہا ہوں ، لیکن میرے ضمیر نے مجھے متنبہ کیا کہ اس کام کا انجام برا ہوگا اس لیے ان کی صحبت چھوڑ کر درس و تدریس میں دوبارہ مشغول ہوگیا ۔

——:o:——

۱۰

ملازمت

مجھے ازہر میں ایک اور طالب علم کی رفاقت نصیب ہوئی جو شبین الکوم کا رہنے والا تھا ۔ میرا اور اس کا تعارف کیسے ہوا ؟ اس کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا ۔ وہ مجھ سے پانچ چھ سال بڑا تھا ، لحیم و شحیم ، گول چہرہ ، نیک دل اور شادی شدہ تھا ۔ وہ اپنی بیوی اور بچے چھوڑ کر پڑھنے کے لیے ازہر چلا آیا تھا ۔ اُس کے والد اُس کے اہل و عیال کی خبرگیری کرتے تھے ۔

اس طالب علم نے ازہر کے پر مشقت اول درجے کو عبور کر لیا تھا ۔ یہ طالب علم روشن خیال بھی تھا ۔ شیوخِ ازہر ، مفتی محمد عبدہ اور ان کے زندقہ اور الحاد کے متعلق جو کچھ کہتے اُس پر کبھی دھیان نہ دیتا ۔ اُن کے درسِ قرآن پاک میں حاضر ہوتا ۔ دلائل الاعجاز[1] اور اسرار البلاغۃ[2] سنتا ۔ میں نے کئی دفعہ ضد کی کہ مجھے بھی مفتی صاحب کے درس میں ساتھ لے چلے لیکن میرے محدود علم کا خیال رکھتے ہوئے وہ انکار کر دیتا اور پھر اُن کا درس مغرب سے لے کر

---

۱ ، ۲ ۔ دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ : معانی اور بیان میں امام عبدالقاہر الجرجانی المتوفی ۔۷۴ھ کی مشہور عالم کتابیں ہیں جو سلاستِ بیان کی وجہ سے ممتاز ہیں ۔ مفتی محمد عبدہ کا احسان ہے کہ انہوں نے ان کتابوں سے علمی دنیا کو روشناس کرایا ۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے ان کتابوں کو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نصاب تعلیم میں داخل کرایا ۔ مترجم

عشا تک جاری رہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے ازہر میں عشا تک رہنا پڑتا۔ یہ طالب علم آن کے خیالات سناتا جس کی وجہ سے مجھے بھی شوق ہوا کہ میں آن کے درس میں شامل ہوں۔ میں نے دو دفعہ آن کے درس میں شرکت کی اور آن کی دل آویز گفتگو سنی اور جو اب تک شیوخ ازہر سے میری سمجھ میں نہ آیا تھا اس کی شد بد ہونے لگی۔ آن کی شاگردی سے محروم رہنے پر میں بہت نادم ہوا اور پکا ارادہ کر لیا کہ آن کے اسباق میں شامل ہوا کروں گا، لیکن یہ دونوں درس آن کے آخری درس تھے۔

آن کے اسباق میں لطائف و ظرائف بھی خوب ہوتے۔ ایک دفعہ ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے باپ سے پوشیدہ بات کرنے آئی اور آ کر آن کی ایک طرف بیٹھ گئی۔ یہ زمانہ قاسم امین[1] کی تحریک کا زمانہ تھا، کہنے لگے "یہ ہے ماڈرن عورت" کیونکہ اس وقت قاسم امین نے ایک کتاب "المرأة الجدیدہ" (ماڈرن عورت) کے نام سے لکھی تھی۔ ایک دفعہ میں ان کے درس میں حاضر تھا لیکن بعض عبارتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا وہ بھی نہ بتلا سکا۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ایک رقعہ لکھ کر عبارت کا مطلب پوچھ لیں کیونکہ اس وقت یہی رواج تھا۔ ہم نے رقعہ کے اختتام پر م اور ر لکھ دیا۔ یہ رقعہ انھیں ملا تو کہنے لگے کہ مجھے ایک شخص نے پوچھا ہے جس کا نام مُمر یا مَمر ہے لیکن وہ میری بات کو سمجھ نہیں سکا۔ پھر جو عبارت ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی اس کی خوب تشریح کی۔ آن کی عادت تھی کہ جو اہم خطوط آن کے پاس آتے وہ ہمیں پڑھ کر سناتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ کسی نے آن کو کافر اور ملحد لکھا تھا اور قتل کی بھی دھمکی دی تھی۔

۱۔ قاسم امین (۱۸۶۳ - ۱۹۰۸ع) : حریت نسواں کے مشہور داعی۔

خط سنانے کے بعد کہنے لگے کہ کاش یہ صحیح ثابت ہو سکے اگر کسی دن کوئی مصری ہمت کر کے مجھے قتل کر ڈالے تو میرے لیے باعثِ فخر ہوگا :

زعم الفرزدق ان سیقتل مربعا

ابشر بطول سلامة یا مربع

ترجمہ : فرزدق[1] نے خیال کیا کہ وہ مربع کر قتل کر ڈالے گا۔ اے مربع تجھے سلامتی، عمر مبارک ہو۔

درس سے پہلے میرا دوست بعض رموز اور عبارات کی تشریح کر دیتا تو یہ اسباق میری سمجھ میں آنے لگتے۔

ایک دن میرا یہ دوست آیا تو اس کے ہاتھ میں اخبار المؤید تھا۔ اس نے الجمیعة الخیریة الاسلامیہ کی طرف سے عربی زبان کے دو استادوں کی ضرورت کا اشتہار دکھلایا۔ اس میں امیدواروں کی قابلیت اور امتحان کے مقام کا ذکر تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ کامیاب امیدوار کو جمعیة کے مدارس میں تین پونڈ ماہوار پر مدرس رکھا جائے گا۔ اس اشتہار سے مجھے بھی شوق چرایا اور میں امتحان میں جا شامل ہوا۔ بورڈ میں وزارتِ تعلیم کی طرف سے تین عالم آئے ہوئے تھے۔

میرا نام پکارا گیا تو میں بھی کانپتا ہوا آگے بڑھا۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی کوئی امتحان نہیں دیا تھا۔ انھوں نے کتاب (ادب الدین والدنیا[2]) پڑھنے کو دی، جب میں نے کتاب کھول کر

۱۔ فرزدق (المتوفی ۱۱۰ھ) : عہد بنی امیہ کا ایک مشہور شاعر۔

۲۔ علم اخلاق میں امام ماوردی (۳۶۴ - ۴۵۰ھ) کی مشہور کتاب ہے جو ممالک عربیہ کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

پڑھی تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ لفظ مرفوع یا منصوب یا مجرور کیوں ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر انھوں نے تختہ پر یہ شعر لکھوایا۔

ستبدی لک الایام ما کنت جاھلا

و یاتیک من الاخبار من لم تزوّد

ترجمہ: زمانہ تجھ پر وہ ظاہر کر دے گا جس سے تو بے خبر تھا
اور وہ خبریں لائے گا جن سے تو نا آشنا رہا تھا۔

پھر مجھے اس شعر کی تشریح کرنے کو کہا گیا۔ میں نے "تزود" کی تشریح میں غلطی کی، پھر مجھ سے اعراب اور اس شعر کے مفرد، مثنی، جمع، مذکر، مؤنث وغیرہ پوچھنے لگے۔ نتیجے کا اعلان ہوا تو میرا تیسرا نمبر تھا، حالانکہ اُن کو چار آدمیوں کی ضرورت تھی۔ ہمیں جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کے انسپکٹر تعلیمات حسن پاشا عاصم[1] کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ مصر کے بڑے آدمی ہیں اور اپنی متانتِ خلق، حسنِ تدبیر، استقامتِ حق اور انصاف پسندی کے لیے مشہور ہیں۔ چاہے حالات کیسے ہوں۔ خدیو[2] عباس کے زمانہ میں وہ محکمہ انشاء کے انچارج تھے۔ خدیو نے اوقاف کی زمین اپنی زمین سے بدلنی چاہی۔ حسن پاشا عاصم اور شیخ محمد عبدہ اوقاف کی مجلسِ اعلیٰ کے ممبر تھے۔ انھوں نے خدیو کے اس اقدام کی مخالفت کی۔ خدیو نے حسن پاشا عاصم کو ان کے عہدہ سے برطرف کر دیا تو وہ جمعیۃ کے تعلیمی معاملات کی مفت سربراہی کرنے لگے۔ یہ نصاب تعلیم کے وضع کرنے میں بھی مدد دیتے تھے اور سختی میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایک

۱۔ حسن پاشا عاصم: سابق انسپکٹر تعلیمات مصر۔
۲۔ خدیو عباس حلمی پاشا: (۱۸۹۲-۱۹۱۴ع) والی مصر۔

دفعہ ایک بڑے رئیس نے مدرسہ کی تعمیر کے لیے مفت زمین عطا کر دی اور اخراجات کے لیے وقف بھی قائم کر دیا پھر اُس نے اپنے لڑکے کو مدرسہ میں داخل کرانا چاہا لیکن لڑکے کی عمر مقررہ عمر سے ایک مہینہ زائد تھی ۔ حسن پاشا عاصم نے لڑکے کو لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس لڑکے کے باپ نے مدرسہ کی مدد کی ہے جس کا شکریہ واجب ہے لیکن مدرسہ کے قوانین و ضوابط کے توڑنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔ جمعیۃ کے اکابرین ، شیخ محمد عبدہ اور حسن پاشا عبدالرزاق نے لڑکے کے داخلہ کے لیے اصرار کیا تو انھوں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ۔ آخر ان دونوں کو ان کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ۔ وہ سب کاموں کو اسی طرح سے انجام دیا کرتے تھے ۔ مشرق میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو انصاف اور قانون کی رعایت کر سکیں ۔ خوش قسمتی سے میں نے انھیں مدرسۃ القضاء کی انتظامیہ کمیٹی کا بھی ممبر پایا ۔ انھوں نے مدرسہ میں بھی کبھی کسی کی رو رعایت نہیں کی ۔ دوسرے ممبروں نے بھی اُن سے بہت کچھ سیکھا ۔

ہم قبۃ الغوری میں کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک رعب دار شخص نمودار ہوا جس کی ہیبت دل میں بیٹھی جا رہی تھی ۔ اس کا رنگ گندمی تھا ۔ چہرہ مہرہ سے اسیوط کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے ۔ پتلے دبلے سے تھے ۔ ہم کو متجسسانہ نظروں سے دیکھ کر معلومات عامہ کے متعلق سوالات کرنے لگے ۔ پھر اعلان کیا کہ پہلا اُمیدوار قاہرہ میں ، دوسرا اسکندریہ[1] میں اور تیسرا بعنی میں طنطا[2]

---

۱ ۔ اسکندریہ : مصر کا دوسرا سب سے بڑا شہر ۔ آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے ۔

۲ ۔ طنطا : مصر کے مغربی صوبہ کا دارالخلافہ جس کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب ہے ۔

میں مقرر کیا جائے۔ چوتھا اُمیدوار پستہ قد اور بدصورت تھا لہٰذا وہ ملازمت کے لیے ناموزوں قرار دیا گیا۔

میرے والد کو ابھی تک اس معاملے کا پتہ نہ تھا۔ میں نے بتلایا تو متحیر اور مضطرب ہوئے لیکن اس میں گھبرانے اور حیران ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کام تو آسان تھا جس کے لیے ازہر کا وظیفہ قربان کرنا پڑتا۔ اُن کا عذر تھا کہ طالب علم کا ازہر میں مستقبل تاریک ہے۔ آخرکار میرے طنطا جانے پر وہ راضی ہوگئے۔ اگر آج مجھ جیسا سولہ سالہ نوجوان سن لے کہ اُس نے سنگاپور یا ملایا یا ٹوکیو جانا ہے تو وہ اتنا نہ گھبرائے گا جتنا میں طنطا جانے سے گھبراتا تھا۔ میں نے نہ تو کبھی گاڑی میں سفر کیا تھا اور نہ اہرام دیکھے تھے۔ میری دنیا میرے گھر اور ازہر تک محدود تھی۔

میں نے بستر، کپڑے اور کتابیں باندھیں۔ رو رو کر اپنے گھر والوں کو الوداع کہا اور چل نکلا۔ جب میں طنطا کے اسٹیشن پر اُترا تو حیران تھا کہ کیا کروں۔ مجھے اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ مسافر ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔ لمبی سوچ کے بعد مجھے خیال آیا کہ ایک گاڑی لے کر جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کے دفتر میں چلا جاؤں لہٰذا میں نے یہی کیا۔ گاڑی مدرسہ کے دروازے پر رکی۔ میں نے اپنا سامان دربان کے پاس رکھا اور سپرنٹنڈنٹ مدرسہ کو جا کر سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ میں نے اُن سے ایک خالی کمرہ، مکان ملنے تک کے لیے مانگا۔ اُس نے مجھے انجان سمجھ کر میری درخواست مان لی۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے میرا ذہن میرے لڑکے کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کی عمر اب اتنی ہے جتنی میری اُس وقت تھی۔ اُس نے طلبائے جامعہ کے ساتھ یورپ کا سفر نہایت خوشی اور ذوق و شوق سے کیا ہے۔ وہ رومانیہ اور آسٹریا جا کر

وہاں کے آثار اور حالات کا معائنہ کر آیا ہے ۔ اس تھوڑے سے عرصے میں جدید نسل کی ترقی دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے ۔

بہرحال طنطا میں مکان کی تلاش کی اور بالآخر ایک محلے میں ایک کمرہ مل گیا جس کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ بھلے آدمی یہاں کی رہائش کو ناپسند کرتے ہیں ۔ جب میں کمرے میں آتا تو عورتوں کے متعلق غور و فکر کرتا جو ناگفتہ بہ حالت میں گھروں کے سامنے بیٹھی رہتی تھیں ۔ میں حیران تھا کہ کس طرح کھاؤں پیئوں اور وقت گذاروں ۔

میں مدرسہ گیا اور سپرنٹنڈنٹ صاحب سے اپنا ٹائم ٹیبل لے لیا ۔ وہاں ایک شخص اپنے لڑکے کو مدرسے میں داخل کرانا چاہتا تھا ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے حکم دیا کہ میں کاغذ اور قلم لے کر اُس کا فارم پُر کر دوں ۔ مجھے تو کبھی اس قسم کی چیزوں سے واسطہ نہ پڑا تھا ۔ سوچتا تھا کہ کیا لکھوں ۔ آخر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے لکھنا شروع کر دیا ۔ مجھے دیباچہ لکھنا نہ آتا تھا اور نہ عزتلو[۱] ، رفعتلو و سعادتلو میں کبھی فرق سنا تھا ۔ میرے خیال میں یہ سب مترادف کلمات تھے اور سمجھا کہ سعادتلو کے معنی آفندم کے ہیں ۔ میں نے یہ سب الفاظ لکھ کر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو دکھلائے تو وہ حیران سا رہ گیا اور کہنے لگا سعادتلو ۔ میں تو صرف آفندی ہوں ، بیک اور پاشا نہیں ہوں ۔ میں بھی شرما سا گیا اور محسوس کیا کہ وہ مجھے حقارت سے دیکھتا ہے ۔

مدرسہ اور گھر میں میرا وقت بُری طرح سے گذرتا ۔ میں نے

---

۱ - یہ سب ترکی القاب ہیں ، جن کے معنی عزت مآب ، رفعت مآب اور سعادت مآب کے ہیں ۔ مترجم

قاہرہ تبادلے کی درخواست دے دی، حالانکہ مجھے آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گذرا تھا ۔ جمعیۃ کی طرف سے جواب آیا کہ اگر قاہرہ سے کوئی طنطا آنا چاہتا ہو تو انہیں اس باہمی تبادلہ پر کوئی اعتراض نہیں ۔ میں نے قاہرہ جا کر ایک مدرس کی نشاندہی کی جو میرے ساتھ تبادلہ کرانا چاہتا تھا ۔ میں نے اس مدرس کے گھر جا کر اپنا حال سنایا تو اس نے طنطا جانے سے انکار کر دیا ۔ میں نے اس کو اپنی آدھی تنخواہ کی پیشکش بھی کر دی لیکن اس نے مسکرا کر انکار کر دیا ۔ اس پر میں مستعفی ہوکر قاہرہ چلا آیا اور ازہر میں دوبارہ آمد و رفت شروع کر دی ۔ میرے لیے تو یہ کافی تھا کہ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر طنطا کی زیارت کر لی اور عزتلو اور سعادتلو کا فرق بھی سمجھ لیا ۔

ازہر کا طریقہ تعلیم جو حواشی ، تقاریر ، اعتراضات اور جوابات پر مشتمل تھا مجھے کبھی بھی پسند نہیں آیا ۔ اس کے بعد میرے والد نے گھر میں ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ کر مجھے درس دینا شروع کیا جہاں میں اکیلا ہی طالب علم ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔

سچ بات یہ ہے کہ میرے والد درس پڑھانے میں خاص ملکہ اور فوقیت رکھتے تھے ۔ اُن کی گفتگو بالکل واضح اور صاف ہوتی تھی ۔ وہ مختصر طریقے سے سمجھا دیتے ۔ حواشی اور تقاریر کو وقت ضائع کرنے کا موجب سمجھتے ۔ انہوں نے سرکاری مدارس میں بھی پڑھایا تھا ۔ قلعے کے مدرسے میں بھی درس دیا تھا ۔ بعض امیروں کے لڑکے مثلاً قاسم پاشا اور سفیر امریکہ کو بھی عربی پڑھائی تھی جس کی وجہ سے ان میں تعلیم کا ذوق اور افہام و تفہیم کا ملکہ پیدا ہوگیا تھا ۔ اُن میں ایک اور بھی خوبی تھی ۔ انہوں نے ادب ، تاریخ اور لُغت کی کتابوں کو جمع کر کے بکثرت مطالعہ کیا تھا اور یہ چیزیں

ازہری علماء میں مفقود تھیں ۔

انھوں نے علم نحو میں میرے لیے اسباق مرتب کر دیے اور پڑھانے کے لیے وہ کتابیں پسند کیں جن کا کوئی حاشیہ نہ تھا تا کہ میرا ذہن پریشان نہ ہو ۔ انھوں نے مجھے شیخ خالد[1] کی شرح اجرومیہ ، اس کے بعد ابن ہشام کی قطرالندیٰ[2] ، شذورالذہب[3] اور ابن عقیل کی "شرح الفیہ ابن مالک[4]" پڑھائیں ۔ یہ سب کتابیں سلاستِ عبارت اور سہولتِ بیان کی وجہ سے ممتاز ہیں ۔ ادب میں انھوں نے امام ثعالبی[5] کی فقہ اللغۃ کے علاوہ حریری[6] کے بعض مقامات شرح و بسط کے ساتھ پڑھائے ۔ ازہر میں تو ادب اور لغت کی تعلیم کا اہتمام نہ تھا لیکن میرے والد کو ان سے خاص لگاؤ تھا ۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق دلایا اور میں نے

---

۱ ۔ شیخ خالد الازہری (المتوفی ۹۰۵ھ) : جن کی کتاب "اجرومیہ" علمِ نحو میں ممالکِ عربیہ کے اکثر مدارس میں داخلِ نصاب ہے ۔

۲ ، ۳ ۔ قطرالندیٰ اور شذورالذہب : ابنِ ہشام (متوفی ۷۶۱ھ) کی نحو میں مشہور کتابیں ہیں جو سلاستِ زبان کی وجہ سے ممتاز ہیں ۔

۴ ۔ ابنِ مالک الطائی (المتوفی ۶۷۲ھ) نے نظم میں عربی نحو کے مسائل لکھے تھے جو الفیہ ابنِ مالک کے نام سے مشہور ہیں ۔ ان کی شرح عقیل نے لکھی ہے ۔

۵ ۔ امام ابو منصور ثعالبی (المتوفی ۴۳۰ھ) : مشہور لغت نویس ، ادیب اور تذکرہ نگار جنھوں نے مترادف الفاظ میں فقہ اللغۃ لکھی ہے ۔

۶ ۔ مقامات حریری : ادب کی مشہور کتاب جو صدیوں سے عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے ۔

تاریخ ابن الاثیر[۱] وفیات الاعیان[۲]، فاکہۃ الخلفاء[۳] اور کلیلہ دمنہ[۴] وغیرہ پڑھ ڈالیں ۔ والد نے علم بلاغت میں سعد الدین[۵] تفتازانی کی شرح تلخیص المفتاح بھی پڑھائی لیکن مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی ۔ منطق اور توحید کی بھی ایک ایک کتاب پڑھا ڈالی ۔ ان سے میری ثقافت کی بنیاد پڑی ۔ فقہ ، جغرافیہ اور حساب وغیرہ پڑھنے کے لیے اس طرح میں نے بڑی ترقی حاصل کر لی ۔ مجھے ازہر میں اپنے ہمدرسوں پر تفوق کا احساس بھی پیدا ہو چلا تھا ۔ بعضوں کے کہنے پر میں نے الموید کی مسجد میں شرح ابن عقیل[۶] بھی پڑھائی ۔ میرے بعض دوست ادبی ذوق رکھتے تھے ۔ ہم مسجد میں اکٹھے ہو کر مقامات بدیع الزمان[۷]

---

۱ ۔ عزالدین ابن الاثیر (المتوفی ۶۳۰ھ) : تاریخ الکامل کے مصنف ۔

۲ ۔ ''وفیات الاعیان لابن خلکان'' (المتوفی ۶۸۱ھ) : تذکرہ اور تراجم کی معتبر کتاب ۔

۳ ۔ فاکہۃ الخلفاء : قصص و حکایات کا مجموعہ جس کے مصنف ابن عرب شاہ ہیں ۔

۴ ۔ کلیلہ دمنہ : ابن المقفع (المتوفی ۱۴۲ھ) کی بے مثل ادبی کتاب ۔

۵ ۔ سعدالدین تفتازانی (۷۲۲ - ۷۹۱ھ) : مشہور معقولی عالم اور حاشیہ نگار ۔ مختصر المعانی ، مطول معانی اور بلاغت میں آن کی مشہور عالم کتابیں ہیں ۔

۶ ۔ ابن عقیل مصری نحوی (۶۹۴ - ۷۶۹ھ) : جنھوں نے الفیہ ابن مالک کی شرح لکھی ہے جو سلاست زبان کی وجہ سے ممتاز ہے ۔

۷ ۔ بدیع الزمان الھمذانی (المتوفی ۳۹۸ھ) : مقامات بدیعی کا مصنف اور اپنے زمانے کا زبردست ادیب ۔

اور اُس کے رسائل ، امالی القالی[1] اور امثال المیدانی[2] کا انتخاب حفظ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے شیخ ابراہیم الیازجی[3] کی کتاب "تحفۃ الرائد" کا پتہ دیا جو اُس وقت نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ عربوں نے ایک موضوع پر جو کچھ لکھا تھا اُس میں جمع تھا۔ مثلاً شجاعت ، بزدلی ، بخشش ، بخیلی ، حلم اور غضب وغیرہ۔ ہم نے اس کو خریدا اور یاد کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت میرے بعض دوست مدرسہ دارالعلوم میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہے تھے۔ داخلہ کے لیے قرآن پاک اور الفیہ ابن مالک کے حفظ کی شرط تھی اور یہ دونوں کتابیں مجھے یاد تھیں۔ میرے خیال کے مطابق دارالعلوم کے اغراض و مقاصد متعین تھے۔ طالب علم یہاں داخل ہو کر چار سال تک بہترین اُستادوں سے پڑھتا اور سرکاری مدارس میں مدرس مقرر ہو جاتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ امتحان کے لیے طبی معائنہ ہونا تھا اور میری نظر کمزور تھی۔

میں ایک انگریز ڈاکٹر کے پاس گیا ، اُس نے میری آنکھوں کا معائنہ کرکے ایک موٹی عینک تجویز کر دی۔ میں نے امتحان دیا لیکن فیل ہو گیا اور میرے دوست امتحان میں پاس ہو کر داخل ہو گئے جس کی وجہ سے مجھے قلق رہا۔

---

۱ - "امالی القالی" : امام ابو علی قالی بغدادی (۲۸۸ - ۳۵۲ھ) کی علم ادب میں شہرۂ آفاق کتاب۔

۲ - امثال المیدانی : امام میدانی (المتوفی ۵۱۸ھ) کی امثالِ عرب میں مشہور کتاب۔

۳ - "ابراہیم الیازجی" (۱۸۴۷ - ۱۹۰۶ء) : لبنان کے مشہور لغوی اور ادیب۔

(۲)

شیطان نے دوبارہ میرے کان میں پھونک ماری - ہوا یہ کہ میں نے ایک اخبار میں وزارتِ تعلیم کی طرف سے ادب کی تعلیم کے لیے استادوں کی ضرورت کا اشتہار پڑھا جن کی تنخواہ چار پونڈ ماہوار مقرر تھی - اس کے لیے میں نے بھی زبانی اور تحریری امتحان دیا اور کامیاب ہو گیا - اس مرتبہ میں اسکندریہ میں محکمۂ تعلیم کی نگرانی میں تھا - میری عمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی - میں گاڑی کا سفر کر چکا تھا اور طنطا کی طرح اسکندریہ سے مرعوب نہ تھا لیکن پھر بھی میں نے سفر میں بہت تکلیف اٹھائی - میرے والد نے مصر میں میری تعیناتی کے لیے بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی - میں نے اس سفر میں پہلی دفعہ سمندر کو دیکھا اور جلد ہی اس سے مانوس ہو گیا - اس کی موجوں کو دیکھ کر میں غم غلط کرنے کی کوشش کرتا - اس کے کنارے کتابیں پڑھنے چلا جاتا - وہاں میں نے امام غزالی[1] کی بعض کتابیں پڑھیں اور تصوف سے آشنا ہوا - نہج البلاغہ[2] کا محکم اسلوب بھی پسند آیا جس کی وجہ سے بیشتر کتاب حفظ کر ڈالی - اشہر مشاہیر الاسلام مصنفہ رفیق[3] بک المعظم کا بھی مطالعہ کیا - بہادرانِ اسلام کا حال پڑھ کر مجھ میں بھی جوش اور ولولہ پیدا ہوا - مصنف نے ان کے زمانے کے واقعات کی جس طرح فلسفیانہ توجیہ اور ان کی شخصیات کی تحلیل بیان کی تھی وہ بھی بے حد پسند آئی -

---

۱ - امام غزالی (۵۰ہ - ۵۱۵ھ) : مسلمانوں کے مایہ ناز عالم ، فلسفی اور متکلم -

۲ - نہج البلاغہ : حضرت علیؓ کے خطبات اور رسائل کا مجموعہ ہے جس کے مؤلف شریف رضی - (۳۵۹ - ۴۰۶ھ) ہیں -

۳ - رفیق بک المعظم (۱۸۷۸ - ۱۹۲۵ع) کے مشہور صحافی -

میں نے مسجد البومیری کے پاس ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا اور وہاں اپنے کپڑے ، کتابیں اور نقدی وغیرہ رکھ دی ۔ ایک دن مدرسہ سے واپس آیا تو کمرے کو خالی صفا چٹ پایا ۔ ایک مدرس دوسرے مدرسہ میں ملازم تھے ان سے مل کر ایک اور کمرہ کرایہ پر لے لیا ۔ اس مکان کے دروازے پر چوکیدار رہا کرتا تھا ۔ میرا یہ ساتھی کنوارا تھا ۔ کمزور جسم کا زرد رو ، با ریش اور دیندار تھا ۔ بڑا لمبا وضو کرتا اور لمبی نماز پڑھتا ۔ اوراد اور اذکار میں بڑا وقت لگاتا ۔ شذالصرف نامی صرف کی کتاب کا مطالعہ جاری رکھتا ۔ گھر سے نکلتے وقت بھی یہ کتاب اس کی بغل کے نیچے رہتی ۔ دو سال تک اس کا یہی حال رہا ۔ نہ تو کتاب ختم ہوتی اور نہ وہ کتاب چھوڑتا ، حالانکہ یہ کتاب بالکل چھوٹی سی تھی اور دو تین دنوں میں پڑھی جا سکتی تھی ۔

میں اسکندریہ میں ایک اور مضبوط شخصیت سے متعارف ہوا جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا ۔ یہ مدرسہ راس التین میں مدرس تھے ۔ میرے ایک عزیز نے انہیں تعارفی خط لکھا تھا ۔ انہوں نے دارالعلوم میں تعلیم پائی تھی ۔ عمر بیالیس کے قریب ہوگی جبکہ میری اٹھارہ سال کی تھی ۔ یہ دراز قد ، معتدل الجسم اور خوبصورت کالی داڑھی والے تھے اور ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے ۔ میں ان سے ملا تو پہلی نظر میں ہی وہ مجھے پسند آ گئے ۔ انہوں نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنا لیا اور میں بھی ان کو بڑے بھائی کی مانند سمجھنے لگا ۔ وہ دیندار بلکہ صوفی قسم کے انسان تھے ۔ طریقہ نقشبندیہ میں بیعت تھے ۔ اس طریقہ میں تقالید اور ظاہری شعائر کا گذر نہیں ۔ ایک نقشبندی جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اپنے دل سے کرتا ہے نہ کہ زبان سے ، اس کا پہلا سبق اسمِ اللہ کا نور

سے دل پر نقش کرنا اور زبان کو بغیر کسی حرکت کے حلق کے اوپر لے جانا ہوتا ہے۔ میں نے تصوف کو بڑی مدت کے بعد اُن کی صحبت سے پہچانا۔ صوفی ہونے کے باوجود وہ آزاد خیال تھے۔ خرافات اور اوہامات کے معتقد نہ تھے۔ شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی دعوت کے حامی تھے۔ مدرسہ میں محبوب اور محترم تھے۔ شاگرد اُن کی تعظیم و تکریم کرتے۔ وہ بے حد غیرت مند تھے۔ نکاٹر سے مجتنب رہتے۔ اپنے شاگردوں سے محبت کرتے۔ بات چیت اور نکتہ چینی کی ان کو اجازت دے رکھی تھی۔ وہ صرف عربی زبان کے مدرس نہ تھے بلکہ فکر، سوسائٹی اور زندگی کے دوسرے معاملات کے ناقد تھے۔ اُن کی آزاد خیالی، راست گوئی اور وسعتِ فکر و نظر کی وجہ سے شاگرد اُن کو شیخِ انگریزی کہتے۔ اُن کی صحبت نے میرے نقائص کی اصلاح کی۔ میری ذات اور میرے ذہنی اُفق کو وسعت عطا کی۔ میں اردگرد کی دنیا سے بے خبر تھا، انھوں نے مجھے خبردار کیا۔ میں سوائے کتاب کے، کسی دوسری چیز سے نا آشنا تھا، انھوں نے مجھے اُس دنیا کا پتہ دیا جو کتاب میں نہیں ہے۔ میرے والد اور میرے اُستاد مجھ سے بچوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیا گویا کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ میرے فراغِ خاطر کو پُر کیا۔ تنہائی میں میرے مونس بنے۔ عصر کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملتے یا مجھے اپنے گھر کے قریب ایک دوکان میں جمعہ کے دن اُن کا انتظار رہتا۔ یہ دوکان احمد الشربتلی کی تھی جہاں لیموں کا شربت نہایت صفائی اور پاکیزگی سے تیار ہوتا تھا۔ یہ دوکان چھوٹی سی تھی جس کی لمبائی اور چوڑائی پندرہ فٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ جب ملنے والے زیادہ آ جاتے تو وہ دوکان کے سامنے بیٹھ جاتے۔ اس کے علاوہ یہ دوکان دار شعر اور ادب کا بھی مدعی تھا۔ دوکان میں بیٹھنے

والوں کو شعر بھی سناتا ، جب قافیہ کی تلاش میں سرگرداں ہوتا تو کسی شاعر قسم الساں کی آمد کے انتظار میں رہتا اور اُس سے قافیہ پورا کراتا - ہر روز اخبار میں اشتہار پڑھتا ، اگر کوئی شعر سمجھ میں نہ آتا تو عصر کا انتظار کرتا اور اپنے دوستوں سے اُس کے معنٰی پوچھتا اور بحث و مناقشہ کرتا - اس کے ساتھ وہ صاحبِ ذوق بھی تھا ، اگر کسی کا بیٹھنا ناگوار خیال کرتا تو اُس کو بیٹھنے نہ دیتا اور لیموں کا شربت پلا کر چلتا کر دیتا - اس کی دوکان ادیبوں اور ظریفوں کی نشست گہ تھی - جب میرے فاضل دوست یہاں آ نکلتے تو ہم کسی قہوہ خانہ میں جا بیٹھتے یا کسی دوسری جگہ چلے جاتے - جہاں ہم موسیقی سے لطف اندوز ہوتے اور سمندر کے کنارے جا کر سمندر کے منظر سے حظ اُٹھاتے - اُن کے ساتھ ان کے ایک دو دوست بھی ہوتے - راستے میں پُرلطف باتیں ہوتیں - سوسائٹی پر نقد ہوتا - زراعت ، اقتصادیات ، سیاست اور اجتماع پر تبصرہ ہوتا کیونکہ اُن کی معلومات اور تجربات وسیع تھے - میں اُن کے گھر جاتا تو دارالعلوم کے اساتذہ کرام مثلاً شیخ حسین المرصفی[1] ، شیخ حسن الطویل[2] ، شیخ حمزہ[3] فتح اللہ وغیرھم کا تذکرہ رہتا ، اُن کی خوبیاں اور برائیاں بتاتے - نئی کتابوں کے متعلق گفتگو کرتے یا پھر دلائل الاعجاز[4] اور اسرار البلاغۃ[5] پڑھ کر سناتے - ہمارے ساتھ ایک خوش طبع دوست بھی ہوتے جو

---

۱ - شیخ حسین المرصفی : (المتوفی ۱۹۳۱ع) مشہور لغوی و ادیب -

۲ - شیخ حسن الطویل : (۱۸۳۴ - ۱۸۹۹ع) اُستاد دارالعلوم -

۳ - شیخ حمزہ فتح اللہ : (المتوفی ۱۹۱۲ع) مشہور ادیب اور انسپکٹر مدارس -

۴ ، ۵ - ''دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ'' : معانی و بیان میں امام عبدالقاہرالجرجانی (المتوفی ۴۷۰ھ) کی مایہ ناز کتابیں ہیں -

اسکندریہ کے کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ وہ بات بات میں لطائف و ظرائف نکالتے۔ میں تو حیران تھا کہ وہ روز روز کہاں سے نئے لطائف لے آتے ہیں۔ وہ شہر اسکندریہ کے زبردست مداح تھے اور قاہرہ پر اس کو ترجیح دیتے تھے۔ میرے لیے یہ سب نئی باتیں تھیں۔ میری نکتہ پسندی میں اُن کا کافی دخل ہے۔ مختصر طور پر اگر والد میرے پہلے اُستاد تھے تو یہ دوسرے۔ مجھے احساس ہوا کہ انھوں نے مجھے دوسری زندگی عطا کی ہے۔ میری طبیعت بجھی بجھی سی رہتی تھی انھوں نے مجھے بیدار کیا۔ میں اندھا تھا انھوں نے مجھے بصیرت اور بصارت دی۔ میں تقالید کا غلام تھا انھوں نے مجھے آزاد کیا۔ میں تنگ دل تھا انھوں نے مجھے حوصلہ کی فراخی عنایت کی۔ یہ دوستی کوئی دو سال رہی۔ وہ اسکندریہ سے قاہرہ آتے تو تجدید وفا ہوتا رہتا۔ اتفاق سے ہم مدرسۃ القضاء میں پھر اکٹھے ہو گئے اس طرح دوستی اور پکی ہو گئی۔ میں اُن کے علم، تجربات اور حُسنِ بیان سے فائدہ اُٹھاتا۔ مصر میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو مجھ میں جوانوں جیسا جوش تھا لیکن اُن کا نظریہ بوڑھوں کا تھا۔ وہ محاذِ آزادی کے رہناؤں پر کڑی تنقید کرتے لیکن مجھے یہ نقد و تبصرہ بُرا لگتا۔ میں حب الوطنی کے جوش میں ایک دوسرے اُستاد پر طعن و تشنیع کرتا لیکن وہ اس کو ناپسند کرتے تھے کہ ایک شاگرد، اُستاد کی اس طرح عیب جوئی کرے۔ ہم اُلجھتے اور روٹھ جاتے پھر آپس میں صلح صفائی ہو جاتی لیکن جلد ہی موت نے اُن کو آ گھیرا۔ اُن کی یاد کی حسرت آج بھی میرے دل میں قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرے۔

میں اسکندریہ میں راتب پاشا کے مدرسہ میں چوتھی جماعت کو پڑھاتا تھا اور یہ چیز میرے لیے مایۂ افتخار تھی۔ میں قواعد صرف

و نحو میں خوب ماہر تھا ۔ وزارتِ تعلیم نے قواعد کی جو کتابیں لکھی تھیں میں نے اُن میں غلطیاں بھی نکالی تھیں لیکن مضمون نویسی میں مجھے زیادہ درک نہ تھا ، بلکہ میرے بعض شاگرد مجھ سے اچھا لکھ لیتے تھے کیونکہ مجھے لکھنے کی زیادہ مشق نہ تھی ۔ میں نے مقامات[1] بدیع الزمان اور اس کے رسائل یاد کر رکھے تھے لہٰذا بلا قصد مسجع عبارت لکھنے لگتا ۔

میں نے مدرسہ میں وہ پرنسپل اور اُستاد دیکھے جن سے مجھے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا گویا وہ ایک ڈرامے کے عجیب و غریب کردار تھے ، جن میں سے کوئی تو منافق تھا اور میرے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا اور مجھے خیال آتا کہ یہ میرا دوست ہے لیکن پرنسپل کے پاس جا کر دسیسہ کاری سے کام لیتا ۔ اور کوئی بد باطن خبیث تھا ، دنیا اور اُس کی تمام چیزوں سے نفرت کرتا ۔ اور کوئی مدرسہ کا مال ناؤ و نوش میں ضائع کرتا ۔ مدرسہ کا فراش ایک حبشی غلام تھا ، کثرت شراب نوشی سے اس کی آنکھیں سرخ رہتیں اور فتنہ و شرارت برساتیں ۔ میرا حال اُس سادہ لوح کا تھا جسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی اور اُس کو لوگوں سے کبھی بھی پالا نہ پڑا تھا ۔

شاگردوں سے میرا برتاؤ دوستانہ تھا ۔ میں اُن سے اور وہ مجھ سے محبت کرتے تھے ۔ ہم سب کی عمر ایک تھی کیونکہ اُس وقت چوتھی جماعت کے طالب علم آج کل کی طرح چھوٹی عمر کے نہ ہوتے تھے ۔ جماعت میں لڑکوں کی تعداد پندرہ سے لے کر بیس تک ہوتی ۔ میں قواعد صرف و نحو سے الگ ہو کر انہیں ادبی قصے سناتا ۔ بعض

---

۱ ۔ بدیع الزمان الھمدانی : (المتوفی ۳۲۸ ھ) مقامات بدیعی کا مصنف اور اپنے زمانے کا مشہور ادیب ۔

باتیں جو میں نے اپنے فاضل استاد سے سنی ہوتیں انھیں بھی سناتا ۔ چھٹیوں میں شاگردوں کی یاد تازہ رہتی ۔ میں اُن کا مشتاق رہتا اور وہ میرے ۔ سخت تربیت کی وجہ سے میری دینداری میں لچک پیدا نہ ہو سکی ۔ میں نماز وقت پر پڑھتا ۔ اگر کبھی قہوہ خانہ میں نماز کا وقت آ جاتا تو پاس کی مسجد میں جا کر نماز پڑھ آتا ۔ اگر کسی فیشن زدہ (فرنگی) علاقے میں مسجد سے دور ہوتا تو کسی بڑے گھر میں حبشی چوکیدار سے چٹائی لے کر نماز پڑھ لیتا ۔ اگر یہ بھی میسر نہ ہوتا تو اپنا جبہ بچھا کر نماز پڑھ لیتا اور جھاڑ کر اس کو پہن لیتا ۔ نماز جمعہ کبھی تو بومیری کی مسجد میں اور کبھی ابوالعباس اور سیری بشر میں پڑھتا ۔ اپنے کمرے میں روزانہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتا ۔

اس وقت میری وطن دوستی کچھ زیادہ نہ تھی کیونکہ میں انگریزی تسلط کے چار سال بعد پیدا ہوا تھا پھر اس وقت مصریوں پر خوف و ہراس بھی طاری تھا ۔ انگریز بھی عظمت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے ۔ انگریز فوجی ہمارے علاقے سے گذر کر قلعہ کی طرف جایا کرتے تھے ۔ میں ان کی سرخ جاکٹیں اور نیلی پتلونیں دیکھتا تو ڈر کے مارے اُن کے راستہ سے ہٹ جاتا ۔ میرے والد سیاست کے بارے میں بہت کم گفتگو کرتے ۔ اگر کبھی اس موضوع کو چھیڑتے تو اور لوگوں کی طرح یہ کہتے ”یہ تو اللہ کا عذاب ہے کیونکہ مصری ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی میں اس کی نافرمانی کرتے ہیں ۔ لٰہذا اللہ تعالیٰ نے مصریوں کو عذاب دینے کی خاطر انگریزوں کو اُن پر مسلط کر دیا ہے اور جب تک ہم راستی کی راہ پر آ کر انصاف اور دینی احکام کی پیروی نہ کرنے لگیں ان سے چھٹکارا ممکن نہیں“۔ لیکن وہ دیسی

حاکموں اور انگریزوں پر تنقید و تبصرہ سے محترز رہے۔ میں نے ایک دن اُن سے پوچھ لیا کہ کیا انگریز بھی اللہ تعالیٰ کی تابعداری کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔ اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے اور مجھے جھڑک کر خاموش ہو رہے۔

اسکندریہ کے فاضل اُستاد کا سیاست میں علیحدہ فلسفہ تھا۔ وہ شیخ محمد عبدہ کے حامیوں میں سے تھے۔ اس فلسفے کی رُو سے داخلی اصلاح سب سے مقدم تھی۔ صالح تعلیم کی اشاعت سے عوام کے اخلاق کی اصلاح کے بعد ہی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے، برخلاف مصطفیٰ کامل پاشا[1] کی سیاست کے کہ وہ داخلی اصلاح کے لیے انگریزوں کا مصر سے اخراج اور مصر کی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے۔ شیخ محمد عبدہ کا جذبہ حب الوطنی عقل پر مبنی تھا اور مصطفیٰ کامل کا جذبات پر۔ اس طرح میں اپنے فاضل اُستاد کے کلام سے متاثر ہو کر اُن سے متفق ہو گیا۔

میں بچپن میں اخبارات پڑھنے کا عادی نہ تھا اور نہ ہی ہمارے گھر میں کوئی اخبار آتا تھا۔ میں نے قہوہ خانوں میں جا کر بھی کبھی اخبار نہ پڑھا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ علی یوسف[2] مالک اخبار المؤید کا، سیدہ صفیہ کے ساتھ نکاح کا واقعہ پیش آیا جو ایک بڑے نامی گرامی سید کی صاحبزادی تھی۔ ایسے واقعات ہر روز ہوتے رہتے تھے اور کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا، لیکن اس خاص واقعے نے خدیو مصر سے لے کر معمولی جھاڑی فروش تک سب ہی کو ہلا ڈالا۔

۱۔ مصطفیٰ کامل: (۱۸۷۴-۱۹۰۸ء) مصر کے مشہور سیاسی رہنما۔
۲۔ شیخ علی یوسف: (المتوفی ۱۹۱۳ء) مشہور صحافی، ادیب اور اتحادِ اسلامی کے داعی۔

ایک جوان عورت نے برضا و رغبت اپنے والدین کی رضامندی کے بغیر ادھیڑ عمر کے ایک شخص سے شادی کر لی تھی اور اس کے والد اس شادی پر معترض تھے ، لیکن اس واقعے کو اہمیت کیسے حاصل ہو گئی ؟ ہوا یہ کہ سیاسی نزاع اور دینی تحفظ کے بہانے یہ مسئلہ عوامی مسئلہ بنا دیا گیا ۔ فسخ نکاح کے لیے مقدمہ دائر ہوا کیونکہ خاوند اور بیوی کی ذات برادری ایک نہ تھی ۔ بیوی سیدانی تھی تو میاں سید نہ تھے ۔ اس ہنگامے میں قاضی ، سیاسی لیڈر اور ارباب ادب سب ہی شریک تھے ۔ مقدمے کی کارروائی پڑھنے کے لیے لوگ اخبار دیکھتے ۔ اخبارات اس موضوع پر شاعروں اور ظریفوں کے نتائج فکر شائع کرتے ۔ یہ سب چیزیں لوگوں کے ہیجان اور اشتعال مگر اخباروں کی ترقی اشاعت کا باعث بنتیں ۔ اس وقت میں نے بھی اخبارات دیکھنے شروع کئے ۔ احمد شربتلی کے قہوہ خانہ میں جا کر اللواء ، المؤید اور المقطم پڑھتا ۔ اللواء حب الوطنی کی آگ بھڑکا رہا تھا اور میرا دل اس سے متفق نہ تھا ۔ المقطم اس تحریک کا مخالف تھا لیکن المؤید کا دینی رنگ کبھی کبھی پسند آ جاتا ۔

اس کے بعد دانشوای کا حادثہ پیش آیا[۱] اس رات کی یاد آج

---

۱ ۔ دانشوای کا حادثہ اس طرح پیش آیا کہ انگریز فوجیوں کا ایک دستہ اپنے محافظ کے ساتھ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہا تھا ۔ جب وہ منوف کے علاقے سے گزرے تو پانچ سپاہی کبوتروں کا شکار کرنے کے لیے قصبہ دانشوای کی طرف چلے گئے اور شکار کھیلنے لگے ۔ اتفاق سے گولی ایک عورت کو جا لگی ۔ اس عورت کے خاوند نے مشتعل ہو کر اس سپاہی کو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر قصبے میں لے جانے لگا ۔ سپاہی کو چھڑانے کے لیے اس کے دوسرے ساتھی آ گئے ۔ قصبے کے دوسرے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

بھی دل میں باقی ہے - اسکندریہ میں ہمارے دوست نے رات کے وقت اپنے مکان کی چھت پر دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا (یہ واقعہ ۲۷ جون ۱۹۰۶ع کا ہے) کہ اخبارات آئے اُن میں مذکور تھا کہ اہلِ دانشوای کے چار آدمیوں کو پھانسی، دو کو عمر قید، ایک کو پندرہ سال قید، چھ کو سات سال قید اور پانچ کو پچاس پچاس کوڑوں کی سزا دی گئی ہے - اس سے ہماری خوشی بالکل کافور ہو گئی اور یہ خوشی کی محفل ماتم میں بدل گئی - خبر پڑھنے کے بعد بہت سے تو باقاعدہ رونے لگے - اُس وقت سے میں المؤید اور المقطم کو چھوڑ کر اللواء کا حامی بن گیا -

دو برس کے بعد میرے والد کی دوڑ دھوپ سے، مجھے مدرسہ والدہ عباس پاشا اول میں مدرسی مل گئی - یہ اکتوبر ۱۹۰۶ع کا واقعہ ہے - میں نے بچپن میں اس مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اور ازہر کی طالب علمی کے زمانے میں بھی اس کی یاد برابر قائم رہی تھی - چھ سال کے بعد دوبارہ اس مدرسہ سے میرا تعلق قائم ہو گیا - میرے زمانے کے شاگرد اور اُستاد ابھی تک اس میں موجود تھے - اب اس مدرسہ میں عمارتوں کی کثرت اور طالب علموں اور اُستادوں کا ہجوم تھا - پہلی اور دوسری جماعت کی تعلیم میرے سپرد کی گئی کیونکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لوگ بھی جمع ہو گئے - فوجیوں نے نہتے عوام پر گولی چلا دی جس سے چند آدمی مارے گئے - عوام نے مشتعل ہو کر فوجیوں پر حملہ کر دیا اور اُن کو ڈنڈوں سے خوب پیٹا چنانچہ دو سپاہی مارے گئے اور تیسرے نے جو زخمی ہو چکا تھا بھاگ کر جان بچائی لیکن یہ بھی تھوڑی دور جا کر مر گیا - انگریزوں کو پتہ چلا تو انھوں نے اہلِ دانشوای کو سخت سزائیں دیں جس سے ملک میں قیامت برپا ہو گئی -

میرے اُستاد اُس وقت چوتھی جماعت کو پڑھاتے تھے۔ مضمون نویسی کو چھوڑ کر میری قابلیت قواعد صرف و نحو میں نمایاں تھی اس بھید کو میں آج تک نہیں پا سکا۔ سال کے آخر میں درجہ ابتدائیہ کا نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ پرنسپل صاحب بہت خوش ہوئے۔ اُن کو ایسے مدرس کی تلاش تھی جو اس واقعہ کو لکھ کر محکمہ اوقاف میں بھیج دے اور جس میں دیگر مدارس کے مقابلہ میں اس مدرسہ کی فوقیت مذکور ہو۔ خوش قسمتی سے مجھے دلائل الاعجاز کا مقدمہ زبانی یاد تھا۔ اس مقدمہ میں علمِ بلاغت کی دوسرے علوم پر برتری دکھلائی گئی ہے۔ میں نے دلائل الاعجاز کے مقدمہ کا اسلوبِ بیان چرا کر اپنے مدرسہ کی دیگر مدرسوں پر فضیلت ثابت کر دی۔ پرنسپل صاحب اس سے بہت ہی خوش ہوئے اور اُن کی نظروں میں میری انشا پردازی کا معیار بلند ہو گیا۔

اسی سال میں میعادی بخار میں مبتلا ہوا۔ مرض نے شدید صورت اختیار کر لی۔ اُس زمانے میں مریضوں کی خبرگیری کی طرف دھیان کم ہوتا تھا۔ گھر والے مریض کو ہسپتال بھیجنے کے روادار نہ تھے نہ تو چھوت چھات سے بچنے کے لیے مریض کو علیحدہ رکھنے کا رواج تھا اور نہ ہی کسی ماہر طبیب یا ڈاکٹر سے علاج کرایا جاتا تھا۔ مجھے اللہ کے سپرد کر کے فرش پر چٹائی بچھا کر لٹا دیا گیا۔ کسی ڈاکٹر کو بھی بلانے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے کھانا پینا اچھا نہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی گھر میں محلے کی بڑی بوڑھیاں آتیں اور مختلف قسم کے علاج تجویز کرتیں۔ بعضوں کو میری والدہ قبول کر لیتی اور بعض کو رد۔ کام پر جانے سے پہلے میرے والد میرے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے۔ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور معوذتین پڑھتے اور ان الفاظ پر ختم کرتے

"میں نے تجھے اُس زندہ اور قائم رہنے والے خدا کی حفاظت میں دیا جسے کبھی بھی موت نہیں آتی ، اور کئی لا کھ لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ العلی العظیم سے تجھ سے برائی کو دور کیا" یہ کہہ کر مجھ پر دم کرتے۔ شام کو جب واپس آتے تو یہی دعا دہراتے۔ میں مرنے کے بالکل قریب ہو چلا تھا لیکن اس دعا کی برکت سے حیرت انگیز طور پر شفایاب ہو گیا۔ اس کے بعد کمزوری بڑی دیر تک قائم رہی۔ میں اس مدرسہ میں سال بھر رہا۔ ۱۹۰۷ء میں مدرسۃ القضاء الشرعی کے کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے مقاصد میں شرعی قاضیوں کا اُن قاضیوں کی جگہ پیدا کرنا تھا جن سے لوگ شاکی تھے۔ محکمہ شرعیہ کی تفتیش اور اُن کے عیوب کی نشاندہی شیخ محمد عبدہ کے سپرد کی گئی۔ انھوں نے اس کام کو بڑی صلاحیت سے انجام دیا اور ایک بڑی رپورٹ لکھ کر پیش کی جس میں محکمہ قضاء کے نقائص کی وضاحت اور اس کی اصلاح کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اس پر حکومت کو ایک مدرسہ کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس خیال کے بانی مبانی سعد پاشا زغلول[1] انسپکٹر تعلیمات تھے جو شیخ محمد عبدہ کے اصلاحی خیالات کے امین تھے لیکن خدیو عباس[2] اس سارے سلسلے کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس سے ازہر کی عزت اور اُس کا وقار خطرے میں پڑتا تھا۔ اس سے پہلے دارالعلوم کے کھلنے سے ازہری علماء زبانِ عربی کی مدرسی سے محروم ہو چکے تھے۔ ازہر اور دیوانِ اوقاف ہی ایسے دو ادارے تھے جن پر خدیو کا قبضہ تھا۔ اُن پر زور اور غلبہ خدیو کے لیے طاقت اور قوت کا ذریعہ تھا۔ مدرسۃ القضاء الشرعی شیخ محمد عبدہ کے اصلاحی افکار

---

۱ - سعد پاشا زغلول : (۱۸۶۳ - ۱۹۲۷ء) جو بعد میں وفد پارٹی کے سربراہ مقرر ہوئے۔

۲ - خدیو عباس : (۱۸۹۲ - ۱۹۱۴ء) مصر کے والی۔

کا نتیجہ تھا اور سعد زغلول اس منصوبہ کو پروان چڑھانے والے تھے لیکن خدیو مصر، دل سے اس منصوبے کو ناپسند کرتے تھے۔ مجلسِ انتظامیہ کا جلسہ ۲۷ فروری ۱۹۰۷ء کو بلایا گیا جس کے صدر خود خدیو تھے۔ انھوں نے اس منصوبے پر اعتراضات شروع کر دیے اور اس پر نظر ثانی کی درخواست کی لیکن سعد پاشا نے ایک قادرالکلام وکیل کی طرح مدافعت کی۔ پھر رائے لی گئی۔ ناظر اشتغال کے علاوہ سب ممبروں نے سعد پاشا کی تائید کی تو خدیو کو ان کی موافقت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا اور اس طرح یہ تجویز قانون بن گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام سیکریٹریوں نے خدیو کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جب تک اس کو رد و قبول کی اجازت نہ ہوگی وہ مجلسِ مشاورت میں شریک نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے خدیو نے مدرسۃ القضاء کے کھولنے کی سخت مخالفت کی تھی۔

بہرحال مدرسۃ القضاء میں داخلہ، قبول کی شرائط اور مضامین کے امتحان کا اعلان کیا گیا۔ میں نے بھی امتحان دیا لیکن ڈاکٹری معائنے کا ڈر لگا رہا۔ میں نے کسی طرح سے وہ تختی حاصل کر لی جس سے ڈاکٹر آنکھوں کا معائنہ کرتے وقت کام لیتے ہیں۔ میں نے پہلی دو سطروں کی علامات کو چھوڑ کر باقی تمام سطور کی علامات زبانی یاد کر لیں۔ پہلی علامت دائیں ہاتھ سے مفتوح۔ دوسری بائیں ہاتھ سے اور تیسری اوپر سے تھی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرا گمان غلط نکلا۔ ڈاکٹر نے چوتھی سطر کی علامات کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا کہ یہ اول ہے یا دوم۔ کہنے لگا کہ اس پر عصا رکھا ہوا ہے لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا اور معائنہ میں فیل ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ اپنی زندگی اسی معمولی مدرسی میں گزار دوں گا لیکن

ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو خواب و خیال سے باہر تھا ۔ عاطف بک نے جب بہت سے امیدواروں کو آنکھوں کے معائنہ میں فیل ہوتے دیکھا تو تمام امیدواروں کا دوبارہ امتحان لینے کو کہا ۔ اس امتحان میں دو سو کے قریب امیدوار شامل ہوئے جن میں بعض نے کئی سال ازہر میں گذارے تھے ۔ ہمارا امتحان نحو ، صرف ، فقہ ، بلاغت ، حساب ، ہندسہ ، جغرافیہ اور تاریخ میں لیا گیا ۔ یہ امتحان بہت سخت تھا ۔ پانچ کے سوا سب امیدوار فیل ہو گئے ۔ پاس ہونے والے امیدواروں میں میرا تیسرا نمبر تھا ۔ پرنسپل صاحب نے میری سفارش کر دی اس طرح دو دوسرے امیدوار ، ازہری علماء کو راضی رکھنے کی خاطر پاس کر دیے گئے ۔ یہ امیدوار علمائے ازہر کے صاحبزادے تھے ۔ مجھے تو روشن مستقبل نظر آنے پر بے حد خوشی ہوئی کیونکہ قومی مدارس سے چھٹکارا پا کر ایک منظم مدرسہ میں پڑھنے کی صورت نظر آ رہی تھی جس میں برخلاف ازہر کے کوشش اور ہمت سے کام لینا ضروری تھا ۔

مدرسہ قضاء شرعی کے قیام میں یہ خیال کارفرما تھا کہ طلبہ کو دینی ثقافت ، تفسیر ، حدیث ، فقہ ، اصول فقہ ، توحید وغیرہ اور ادبی ثقافت مثلاً نحو ، صرف ، ادب اور جدید قوانین نظام قضا کی تعلیم دی جائے ۔ جغرافیہ ، تاریخ ، فزکس ، کیمسٹری ، حساب ، الجبرا اور جیومیٹری وغیرہ مضامین بھی نصاب میں شامل تھے ۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ نصاب تعلیم وضع کرنے والے فزکس کا اصلی نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے مبادا علماء ازہر ناراض ہو جائیں ۔ انھوں نے علوم طبیعیہ اور کیمیاء کا نام " علوم خواص جو اللہ تعالیٰ نے اجسام میں ودیعت کر رکھے ہیں " رکھ دیا ۔ اس مدرسہ کے سرپرست سعد زغلول پاشا تھے جو اس وقت محکمہ تعلیم میں انسپکٹر تھے ۔

انھوں نے بڑی دیکھ بھال کے بعد عاطف بک برکات کو مدرسہ کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا تھا ان دونوں نے مل کر ہر مضمون کی تعلیم کے لیے بہترین اُستادوں کا انتخاب کیا ۔ دینی علوم کی تدریس کے لیے بہترین علماء ازہر کی خدمات حاصل کیں ۔ مدرسہ میں مختلف اقسام کے مدرس تھے اس میں ازہری شیوخ بھی تھے جن کی دنیا ازہر اور اُس کے ملحقات تک محدود تھی ۔ اُن کے ساتھ تاریخ اور فزکس کے بھی اساتذہ تھے جنھوں نے انگلستان اور فرانس جا کر تعلیم حاصل کی تھی ۔ مدرسہ کے پرنسپل ، ازہر ، دارالعلوم اور انگلستان کے تعلیم یافتہ تھے ۔ سب طلبہ کو اپنے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے تھے ۔ میں ایک مدرس کے اسباق میں شریک ہوتا تو معلوم ہوتا کہ میں قرونِ وسطیٰ کے کسی اُستاد سے پڑھ رہا ہوں پھر دوسرے مدرس کے پاس جاتا تو گمان ہوتا کہ میں کسی غیر ملکی یونیورسٹی کا طالب علم ہوں ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ عربی میں پڑھاتا تھا ۔ ایک کا موضوع قدیم اور دوسرے کا جدید تھا ۔ اُستادوں کا بھی یہی حال تھا ۔ قدیم دانشوروں نے تو کبھی جغرافیہ کا نام بھی نہ سنا تھا اور نہ ان کو معلوم تھا کہ دنیا کے بر اعظم پانچ ہیں ۔ اگر کسی نے نئی بات کہہ دی اور اپنے آپ کو زمانہ حاضرہ کا انسان بنا کر ظاہر کر دیا اور کہہ دیا کہ دنیا کی تین قسمیں ہیں ، ایشیا ، افریقہ اور یورپ ۔ کتابوں میں جو کچھ آیا تھا اُس کو بلکہ خرافات اور اوہام تک کو مقدس مانتے تھے ۔ صحت رائے کے لیے سب سے بڑی دلیل اُن کے پاس یہ تھی کہ اس کا ذکر کتبِ قدیم میں آیا ہے ۔ جدید علوم کے اصحاب نے بہترین مغربی اساتذہ سے استفادہ کیا تھا ۔ انھوں نے یورپ میں ایک عرصہ گذارا تھا ۔ جب تک کسی فکر و نظر کو کوئی دلیل ثابت نہ کر دے یا تجربات اُس کے ثبوت کی تصدیق نہ کر سکیں وہ اس کو ماننے کے

لیے تیار نہ تھے ۔ بعض اساتذہ نے دونوں مدارسِ فکر سے فائدہ اُٹھایا تھا ۔ اساتذہ کی اس معجون مرکب سے طلبہ کو واسطہ پڑا کہ وہ اپنی استعداد اور فطرت کے مطابق فائدہ اُٹھائیں ۔ ان سب پر حاوی پرنسپل صاحب تھے جو قاعدہ اور قانون کے بے حد پابند تھے۔ کسی کو بھی ضابطہ اور قانون کی حد سے باہر نہ جانے دیتے تھے ۔ صبح گھنٹہ بجنے پر دروازے بند کر لیے جاتے ، پھر کسی طالب علم کو اندر جانے کی اجازت نہ ملتی ۔ اساتذہ اپنے اپنے سبقوں میں مشغول ہو جاتے ۔ لڑکے اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھتے ۔ ڈیسک کھولتے ، کتابوں اور دواتوں کو موجود پاتے ، کسی چیز کی کمی بیشی نہ ہوتی ۔ طلبہ اور اساتذہ کے معاملے میں انصاف برتا جاتا تھا ۔ پاس اور فیل ہونا عین انصاف کے مطابق ہوتا ۔ اساتذہ کی ترقی میں بھی کسی رعایت اور سفارش کا دخل نہ ہوتا ۔ ہر ایک طالب علم کو اُس کے اساتذہ اور پرنسپل صاحب جانتے تھے۔ ایک بڑے رجسٹر میں ہر ایک کے کوائف درج رہتے ۔ اس میں اُس کا نام ، خطا ، جن کا وہ مرتکب ہوا اور جزا و سزا وغیرہ کا اندراج ہوتا ۔ جو کوئی نئی خطا کا مرتکب ہوتا وہ پرنسپل صاحب کے پاس جاتا ۔ وہ رجسٹر کا صفحہ کھول کر اُس کا نام نکال لیتے ۔ مدرسہ میں صفائی کا نہایت عمدہ انتظام تھا ۔ ایک خوبصورت باغیچہ بھی تھا جو پھولوں سے لدا رہتا ۔ خدمت گار ہمیشہ اُس کی آرائش میں مصروف رہتے ۔ مدرسہ کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی ۔ بڑے بڑے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ مشرق سے عموماً وہ لوگ آتے جن کو تعلیم اور اصلاح کی فکر رہتی ۔

—:o:—

۱۱

مدرسۃ القضاء الشرعی

۱

میں مدرسہ کے اونچے درجے میں داخل ہوا تھا ۔ اس درجے میں تعلیم کی مدت چار سال تھی ۔ جماعت میں چوبیس طالب علم شریک تھے جن میں سے اکثر کی عمر تیس سال کے قریب تھی ۔ بعض شادی شدہ اور صاحبِ اولاد بھی تھے ۔ طلبہ بھی اساتذہ کی طرح تھے ۔ بعض سادہ لوح ازہری تھے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے ۔ بعض شہری اور گھاگ قسم کے تھے ۔ بعض ان دونوں کے درمیان تھے ۔ بہترین ازہری عالم ہمیں تفسیر ، حدیث اور توحید کی تعلیم دیتے ۔ اُن کا طرزِ تعلیم ازہر جیسا تھا ۔ بعض زرد رنگ کی کتاب لے کر متن پڑھتے پھر اس کی تشریح کرتے پھر اعتراضات کے جوابات دیتے ۔ ہم نے اس سال بہت کم پڑھا تھا ۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ امتحان ، پڑھی ہوئی کتابوں میں سے ہوگا ۔ یہ اساتذہ برابر ازہر ، اُس کے نظام تعلیم اور پرانے زمانے کو یاد کرتے رہتے اور ہمارے دماغوں میں احتمالات اور تاویلات ٹھونستے رہتے ۔ ہم میں بے سوچے سمجھے مولفوں اور اُن کی تالیف کی تقدیس پیدا کرتے رہتے ۔ مولف کا غلطی کرنا مشکل تھا اور تاویل کر کے اُس غلطی کو سو طرح سے صحیح ثابت کیا جا سکتا تھا ۔ صاف بات یہ ہے کہ اس طریقۂ تعلیم میں خوبیاں بھی تھیں جس سے تعبیر میں باریکی ، بات میں ایجاز اور منطقی بیان

کے التزام کی عادت پڑتی تھی ۔

ان کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے بہترین اساتذہ لیکچر دیتے تھے ۔ یہ شیخ محمد خضری[1] اور شیخ مہدی تھے۔ یہ لوگ نظم کلام اور وضاحت بیان کے عادی تھے ۔ کتابوں کو چھوڑ کر موضوع سے بحث کرتے۔ ان لوگوں نے شیخ محمد عبدہ کی صحبت اُٹھائی تھی اور اُن کے خیالات اور افکار کے حلقہ بگوش تھے ۔ یہ اساتذہ قدیم کتب پر اعتماد کر کے لیکچر جدید شکل میں پیش کرتے ۔ اُن کا دنیاوی علم ازہریوں سے زیادہ تھا ۔ انھوں نے اپنے اعمال اور مناصب سے تجربات بھی اٹھائے تھے جن کو وہ اسباق کے ساتھ پیش کرتے ۔ شیخ محمد الخضری نے ہمیں اصول فقہ پڑھایا ۔ وہ ذہین و فطین ، خوش بیان مقرر ، عالم ِ متبحر اور حاضر جواب تھے ۔ ادب ِ عربی کے متعلقات اور تاریخ ِ اسلام کے ماہر تھے ۔ ان چیزوں کو جدید اور عام فہم اسلوب ِ بیان میں پیش کرنے پر انھیں کمال حاصل تھا ۔ شیخ محمد مہدی ادب ِ عربی کا درس دیتے تھے ۔ ادب کی یہ شاخ مصر میں نئی نئی رائج ہوئی تھی ۔ لوگ صرف کتاب الاغانی[2] ، عقدالفرید[3] اور امالی[4] وغیرہ کے ادب سے

---

۱ ۔ شیخ محمد خضری (۱۸۷۲ - ۱۹۲۷ع) عالم اور ادیب ۔ نصف درجن کے قریب کتابوں کے مصنف جن میں محاضرات ِ تاریخ الاسلامی اور تاریخ تشریع الاسلامی زیادہ مشہور ہیں ۔

۲ ۔ کتاب الاغانی : ادب کی بے مثل کتاب جو الفرج الاصفہانی (المتوفی ۳۵۶ھ) نے پچاس سال کی مدت میں جمع کی تھی ۔

۳ ۔ عقدالفرید : مؤلفہ ابن عبد ربہ (المتوفی ۳۲۸ھ) ادب ِ عربی کی دلچسپ کتاب ہے ۔

۴ ۔ امالی القالی : ادب ِ عربی کی مشہور کتاب ۔ مؤلفہ امام ابو علی القالی البغدادی (۲۸۸ - ۳۵۶ھ) ۔

واقف تھے لیکن عہد بعہد کے ادب کی تاریخ ، شعراء کے تراجم ، نثر نگاروں کے حالات اور اُن کی خصوصیات اور ممیزات سے بالکل ناواقف تھے ۔ جب استاد حسن توفیق العدل کا زمانہ آیا تو انھوں نے ادب کی اس شاخ کو دارالعلوم کے نصاب میں داخل کرایا ۔ انھوں نے جرمنی میں تعلیم پائی تھی ۔ اس بارے میں المانوی علماء نے جو کچھ لکھا تھا اُس سے استفادہ بھی کیا تھا ۔ اُن کے شاگرد محمد مہدی نے ہمارے لیے بڑے مفصل لیکچر تیار کئے ۔ اُن کی بڑی خصوصیت ، ادب کی ذوق شناسی ، اچھے اور برے کی پرکھ اور شعر کو خوش الحانی سے ادا کرنا تھا ۔ اکثر درس میں شیخ محمد عبدہ کی دعوت ، عدم زیارت قبور ، انبیاء اور اولیاء کے انکار شفاعت کا تذکرہ کرتے ۔

شیخ محمد زید کا بھی دارالعلوم کے علماء سے تعلق تھا ۔ آپ خود شناس اور خود نگر تھے ۔ ہم کو فقہ پڑھاتے ۔ لاء کالج میں بھی اسی مضمون کا درس دیتے رہے تھے ۔ کتب ازہریہ سے فقہ پڑھاتے جن کا اعتماد کلی قواعد وضع کرنے کے لیے جزئیات پر ہوتا ہے ۔ لیکچر کی زبان سلیس ہوا کرتی لیکن انھیں اطناب کا شوق تھا ۔

جدید تعلیم یافتہ اساتذہ محکمہ دیوانی سے تعلق رکھتے تھے ۔ ہمیں مقدمۃ القوانین ، عدالتوں کا نظام اور اُن کی خصوصیات وغیرہ پڑھاتے ۔ ہمارے ذہنوں کو دیوانی قانون کی طرف ، فقہ اسلامی کو قانون وضعی کی طرف اور اصول فقہ کو اصول قوانین کی طرف مائل کرتے ۔

احمد فہمی العروسی بک نے مصر اور فرانس میں تعلیم پائی تھی ۔ ہمیں فزکس (طبیعیات) پڑھاتے تھے ۔ پہلے نظریہ کی تشریح کرتے ، اس کے بعد اُس کی تطبیق لیبارٹری میں ہوتی ۔ پھر ہم سے تجربے کراتے ۔

کتاب ہاتھ میں نہ لینے دیتے بلکہ ہم نے جو کچھ سمجھا ہوتا ہم سے لکھواتے اور آلات جن سے کام لینا ہوتا اُن کی تصویریں کھنچواتے۔ یہ طریقہٴ تعلیم اگرچہ سخت تھا لیکن مفید بھی تھا ۔ وہ موضوع درس کو چھوڑ کر ہمارے طرزِ تعلیم اور نظریہ حیات پر نقد و احتساب بھی کرتے ۔ ان معاملات میں مصر اور فرانس کا مقابلہ کرتے ۔ اُن کی رائے میں یہ باتیں فزکس اور کیمسٹری سے زیادہ سود مند تھیں کیونکہ یہ دونوں مضامین خشک روٹی کی مانند ہیں جس کو ذائقہ دار بنانے کے لیے مکھن اور مربے کی ضرورت پڑتی ہے ۔

علی ملک فوزی نے مدرسة المعلمین اور پھر انگلستان جا کر تعلیم پائی تھی ، ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے ۔ کبھی تاریخ یونان و روما اور کبھی جدید یورپ اور کبھی تاریخ اسلام کا درس دیتے۔ یہ عجیب و غریب اطوار کے ہنس مکھ آدمی تھے۔ قد چھوٹا تھا ، لمبی ٹوپی پہنتے تھے۔ انگریزی ، فرانسیسی ، فارسی اور ترکی خوب جانتے تھے۔ فصیح عربی میں گفتگو کرتے ۔ بغل میں کتابوں کا پشتارہ دبائے داخل ہوتے جن کا وزن اُن کے وزن سے زیادہ ہوتا ۔ فرنچ زبان میں لکھی ہوئی کتاب کھول کر فصیح عربی زبان میں نوٹس لکھواتے ؟ درس کے موضوع سے ہٹ کر مشرق اور مغربی تہذیب کا موازنہ کرتے ۔ فلسفہٴ زندگی پر بھی اپنے خیالات پیش کرتے ۔

محمد بک زکی حساب ، الجبرا ، جیومیٹری پڑھاتے ۔ وہ بڑے سرعت پسند تھے ۔ ہم تھوڑے ہی عرصہ میں ٹریگنومیٹری ، ہندسہ فراغیہ ، توافیق اور تبادیل تک پہنچ گئے ۔

عاطف بک برکات ایک دن ہماری کلاس میں آئے ۔ اُس وقت شیخ حسن منصور ہمیں کتاب ادب الدنیا والدین سے اخلاق کا درس دے رہے تھے ۔ ان کو یہ تعلیم پسند نہ آئی ۔ وہ خود اس مضمون

کو میکنزی[1] اور جان سٹورٹ مل[2] کی کتابوں سے پڑھانے لگے ۔ اُن کی نظیر دوسرے مدرسوں میں نہیں پائی جاتی تھی ۔

مدرسہ کا نظام نہایت سخت تھا ۔ دوبارہ امتحان کا رواج نہ تھا جو طالب علم سال کے آخر میں فیل ہو جاتا وہ مدرسہ سے نکال دیا جاتا ۔ ہر سہ ماہی کے بعد امتحان ہوتا ۔ اس امتحان میں فیل ہونے والے کو وظیفہ سے محروم کر دیا جاتا جو ڈیڑھ پونڈ ماہانہ ملتا تھا فیل ہونے والے طلبہ کا جمع شدہ وظیفہ اچھے نمبر پانے والوں کو مل جاتا ۔ کچھ رقم اُن کو مل جاتی جنھوں نے ہر مستقل مضمون میں سب سے زیادہ نمبر پائے ہوتے اور باقی رقم اُس کو دی جاتی جو کتابوں کا زیادہ مطالعہ کرتا مثلاً مقصورہ[3] ابنِ دُرید اور اُس کی شرح ، مختصر صبح الاعشیٰ[4] اور ۱۹ ویں صدی کا امیل[5] وغیرہ ۔ ایک ہوشیار طالب علم ان انعامات سے تیس پونڈ کما سکتا تھا ۔ میں ہر سال تقریباً ۲۵ پونڈ اس طرح کے انعامات سے حاصل کر لیتا تھا جس کی وجہ سے ساری عمر فخر کرتا رہا ۔ اس کے علاوہ اچھے نمبر پانے والے کو انعامات سے بھی سرفراز کیا جاتا ۔ ہر تیسرے دن عصر کے وقت صحن

---

۱ ۔ مسٹر میکنزی : مشہور عالم اخلاق ۔

۲ ۔ جان سٹورٹ مل : منطق اور فلسفہ کے عالم ۔

۳ ۔ مقصورہ ابن درید : امام محمد بن حسن درید (۲۲۳ - ۳۲۰ھ) کا اخلاقی منظوم جس کی بے شمار علماء نے شرحیں لکھیں ہیں ۔

۴ ۔ صبح الاعشی قلقشندی (المتوفی ۸۲۱ھ) کا ادب اور انشا میں بے نظیر انسائیکلوپیڈیا ۔

۵ ۔ الیسویں صدی کا امیل : الفونس ایکروس ایک فرانسیسی نے تعلیم و تربیت کے اصول ، افسانے کے طرز پر لکھے ہیں ۔ اس کتاب کا عربی اور اردو میں ترجمہ ''التربیۃ الاستقلالیہ'' کے نام سے ہو چکا ہے ۔

مدرسہ میں کرسیاں بچھائی جاتیں اور بیرونی مدرس یا کسی ہوشیار طالب علم کو کسی دیے ہوئے مضمون پر تقریر کرنے کو کہا جاتا ۔ ان جلسوں میں کبھی کبھی سعد زغلول[1] یا قاسم امین[2] اور دوسرے بڑے حضرات شامل ہوتے مثلاً رفیق بک "فرد اور جماعت کے مقدمہ کے فیصلہ پر" شیخ محمد الخضری[3] "ابو مسلم خراسانی[4] ، غزالی[5] اور زیاد بن ابیہ[6] " اور عمروسی بک ہربرٹ سپنسر[7] اور ہستہ لوزی[8]" پر لیکچر دیتے۔

کبھی کبھی عاطف بک برکات لائبریری میں بعض طلبہ کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کوئی موضوع چھیڑ دیتے ۔ موضوع شاخ در شاخ چلا جاتا ۔ بحث و مناقشہ طول پکڑ جاتا اور گھنٹہ بج جاتا ۔ آن کا درس سقراط کے طریقہ پر تھا ۔ بحث و مباحثہ میں آن کا استدلال زور دار ہوا کرتا ۔ وہ نہ کبھی تھکتے تھے نہ کبھی اکتاتے ۔ یہ مزاح سعد پاشا زغلول کے گھرانے کا رہا ہے مثلاً سعد زغلول ،

---

۱ ۔ سعد زغلول : مصر کے سیاسی رہنما (المتوفی ۱۹۲۷ع) اور سابق وزیر اعظم ۔
۲ ۔ قاسم امین (المتوفی ۱۹۰۸ع) حریت نسواں کے داعی ۔
۳ ۔ شیخ محمد الخضری (المتوفی ۱۹۲۷ع) مشہور عالم ، مؤرخ اور ادیب ۔
۴ ۔ ابو مسلم خراسانی (۱۰۰ - ۱۳۷ھ) عباسیوں کا مشہور سپہ سالار اور ہواخواہ ۔
۵ ۔ امام غزالی (۴۵۰ - ۵۰۵ھ) اسلام کا مایۂ ناز عالم ، فلسفی اور مؤرخ ۔
۶ ۔ زیاد ابن ابیہ (المتوفی ۵۳ھ) عہد بنی امیہ کے مشہور مدبر اور سیاست دان ۔
۷ ۔ ہربرٹ : سپنسر (۱۸۲۰ - ۱۹۰۳ع) مشہور مفکر اور ماہر تعلیم ۔
۸ ۔ پستالوزی (۱۷۴۶ - ۱۸۲۷ع) سوئزرلینڈ کے مشہور مفکر اور ماہر تعلیم ۔

فتحی زغلول[1] ، عبدالرحمان زغلول[2] ، عاطف برکات ۔ بحث و مباحثہ میں لذت پاتے تھے ، اس کی فروعات اور گہرائیوں میں چلے جاتے تھے ۔ اس سے حامی اور مخالف دونوں حظ اٹھاتے ۔

اس مدرسہ میں سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی ۔ نہ یہاں مزاح کا گذر تھا اور نہ اس میں کسی قسم کی آرام پسندی کو دخل تھا ۔ دن کو پڑھائی اور رات کو اگلے درس کی تیاری کرنا پڑتی تھی ۔ کھیل کود کا گھنٹہ بھی شاق گذرتا ۔ اگر اس کو فوجی مدرسہ کا نام دیا جائے تو عین مناسب ہوگا ۔ میں صبر و ثبات سے پڑھائی میں لگا رہتا ، حتیٰ کہ دن اور رات ، جمعہ اور عید کو بھی چین نہ پاتا ۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی کبھی آرام نہ کیا ۔ مقابلہ اور مسابقہ کے لیے جو کتابیں مقرر تھیں اُن کو لے کر مطالعہ کرتا رہتا ۔ ہم کلاس میں دو طالب علم تھے ، جو بغیر کسی تکان کے آگے دوڑنے کی فکر میں مشغول رہتے ۔ مرحوم شیخ عبدالسلام منصور علوم ازہریہ میں مجھ سے آگے تھے اور میں علوم عصریہ میں ۔ وہ پہلے دو سالوں میں مجھ سے بازی لے گئے اور میں آخری سالوں میں ۔ جب وہ مجھ سے ترقی لے جاتے تو وفورِ غم سے میرے آنسو نکل آتے ۔ اس ہمدرس سے آگے بڑھنے کی دھن میں ، میں نے جو مشقت اٹھائی ہے وہ سارے مدرسہ میں کسی نے نہیں اٹھائی ۔

میں کبھی کبھی دریائے نیل کے کنارے ہوا خوری اور منظر دیکھنے کے لیے چلا جاتا ۔ پھر میں دائیں ہاتھ کو ہو کر درختوں اور نہروں والے علاقے سے گذرتا ہوا مسجد پہنچتا اور مغرب یا عشاء کی

---

۱ ۔ فتحی زغلول : (۱۸۶۳ ۔ ۱۹۱۴ء) مصر کے مشہور وکیل اور قانون دان ۔

۲ ۔ عبدالرحمان زغلول : صحافی اور مترجم ۔

نماز پڑھ کر واپس آتا ۔

میں کبھی کبھار جمعہ کی رات اپنے دوست شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق[1] کے گھر چلا جاتا ۔ امیر گھرانوں کی طرح آن کا گھر بھی قدیم رسومات کا مرکز تھا جہاں دسترخوان صبح و شام بچھا رہتا ۔ رات گئے تک گپ بازی ہوتی رہتی ۔ شیخ صاحب کے نوجوان دوست آن کے گھر میں علیحدہ علیحدہ کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں ازہری نوجوان طالب علم یورپ پلٹ نوجوانوں سے ملتے ۔ مختلف دینی ، فلسفیانہ ، سیاسی اور اجتماعی مسائل پر تبادلۂ افکار ہوتا ۔ قدامت پرست ، احراریوں سے آلجھتے ، بے پردگی کے حامی پردہ کے حامیوں سے جھگڑتے۔ محبِ وطن رجعت پسندوں پر غراتے ۔ لذت حکایت کا یہ سلسلہ نصف شب تک جاری رہتا ۔

دو تین مرتبہ میں ہمت اور حوصلہ کر کے غنا میں بھی سننے گیا ۔ ازبکیہ میں ایک مغنیہ جس کا نام ست توحیدہ تھا ، گایا کرتی تھی ۔ میں نے چھپ کر بیٹھنے کی ہر ممکن کوشش کی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر مدرسہ والوں کو اس کا پتہ چل گیا تو میری خیر نہ ہوگی ۔ بس میری تفریح کی یہی ساری کائنات تھی ۔ باقی سارا وقت مدرسہ اور پڑھائی کے لیے وقف تھا ۔

ایک دوسری قسم کے شوق نے پھر مجھے تکلیف میں ڈالا ۔ ہوا یہ کہ مجالس اور اخبارات میں بڑی بحث و تمحیص کے بعد جامعۂ مصریہ کا افتتاح بھی آسی سال ہوا تھا جس سال مدرسۃ القضاء کھلا تھا ۔ اس سارے جھگڑے اور نزاع کا موضوع بھی عجیب و غریب اور مضحکہ خیز تھا ، یعنی مصر کا فائدہ پرائمری اور ابتدائی

---

۱ ۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق (۱۸۸۵ - ۱۹۴۶ع) سابق شیخ ازہر ۔

تعلیم کی توسیع میں ہے یا اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے جامعہ کی تاسیس ضروری ہے گویا یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد تھیں جن کا اجتماع نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو عوام میں اہل الرائے حضرات کے پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ اس وجہ سے اس نے اپنی فکر ابتدائی تعلیم پر مرکوز رکھی۔ یہ فکری نزاع طول پکڑتی گئی۔ لارڈ کرومر (برطانوی ہائی کمشنر) بھی ابتدائی تعلیم میں توسیع کے حامی اور جامعہ کی تاسیس کے مخالف تھے۔ اضلاع کے حاکموں اور رئیسوں نے بھی انگریزوں کا اشارہ پا کر پرائمری مدارس جاری کرنے شروع کر دیے تھے۔ آخرکار ایک فیاض شخص آگے بڑھے اور جامعہ کے اخراجات کے لیے پانچ سو پونڈ کی رقم اس شرط کے ساتھ پیش کر دی کہ دوسرے حضرات بھی مال و متاع سے اس کار خیر میں حصہ لیں۔ بعض اکابر نے ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں سعد زغلول، قاسم امین، شیخ عبدالعزیز شاویش[1] اور محمد فرید[2] وغیرہ شریک ہوئے، انھوں نے پانچ ہزار پونڈ کا چندہ لکھوایا۔ اس طرح جامعہ مصریہ کی داغ بیل پڑی۔ سعد زغلول کو رئیس جامعہ (چانسلر) منتخب کیا گیا۔ جب وہ محکمہ تعلیم میں چلے گئے تو شہزادہ احمد فواد[3] (بعد میں شاہ فواد) کو رئیس جامعہ مقرر کیا گیا۔

جامعہ کا دائرۂ کار بڑھتا گیا۔ یورپ سے بڑے بڑے مشرق فاضل منگوائے گئے اور جامعہ کے لیے وہ عمارت پسند کی گئی جہاں

۱۔ شیخ عبدالعزیز شاویش (المتوفی ۱۹۲۲ء) مشہور عالم دین اور کئی کتابوں کے مصنف۔

۲۔ محمد فرید وجدی (۱۸۷۸ - ۱۹۵۴ء) مصنف دائرۃ المعارف۔

۳۔ احمد فواد (المتوفی ۱۹۳۲ء) سابق شاہ مصر۔

آج کل جامعۂ امریکیہ ہے ۔ مجھے استاد نلینو[1] کے خطبات "علم ہیئت اور عرب" پر ، استاد سانتلانا[2] کے خطبات "فلسفۂ اسلامیہ" پر ، استاد گوئیڈی[3] کے محاضرات "عرب جغرافیہ" پر بے حد پسند آئے ۔ یہاں میں نے تعلیم کا دوسرا رنگ دیکھا یعنی بحث میں استقصاء ، درس میں عمق ، مختلف مصادر اور مراجع کی طرف مراجعت ، علمائے عرب اور فرنچ کے اقوال میں محاکمہ اور اس بحث سے خاموش نتائج کا استخراج ۔

مدرسہ کا آخری امتحان نہایت جانکاہ تھا ۔ ممتحن حضرات کی مختلف کمیٹیاں تھیں ۔ ان میں سے ایک کمیٹی ازہر کے علمائے کبار پر مشتمل تھی جس میں شیخ المالکیہ ، شیخ الحنابلہ اور بعض بڑے بڑے قاضی تھے ۔ ملکی قوانین کی کمیٹی میں فتحی پاشا زغلول[4] اور عبدالعزیز پاشا فہمی[5] شامل تھے ۔ عصری علوم کی کمیٹی میں حساب ، فزکس اور تاریخ کے علماء تھے ۔ تحریری امتحان تو بڑی آسانی سے ہو گیا اور میں اول آیا لیکن نحو ، بلاغت ، اصولِ فقہ اور منطق کا زبانی امتحان ازہری علماء نے لیا ۔ موضوعِ امتحان ہر ایک کے ایک یا دو جملے ہوتے جن کا

---

۱ ۔ استاد نلینو (Nellino) مشہور اطالوی فاضل جو ۱۹۰۲ سے لے کر ۱۹۰۹ع تک جامعۂ مصریہ میں تاریخ کے استاد تھے ۔

۲ ۔ سانتلانا (Santillana) ۱۸۴۵ - ۱۹۳۱ع سابق استاد فلسفہ جامعۂ مصریہ ۔

۳ ۔ استاد گوئیڈی : (۱۸۴۴ - ۱۹۳۵ع سابق استاد جغرافیہ جامعۂ مصریہ کتاب الاغانی کی فہرست بھی اسی فاضل نے بنائی ہے ۔

۴ ۔ فتحی پاشا زغلول (۱۸۶۳ - ۱۹۱۴) مصر کے ایک قانون دان ۔

۵ ۔ عبدالعزیز پاشا فہمی : (۱۸۷۰ - ۱۹۵۱ع) مصر کے سابق وزیر قانون و انصاف ۔

تعین امتحان سے دس دن پہلے ہو جاتا ۔ میں نے ان موضوعات کی تیاری دو دنوں اور دو راتوں میں کر لی ۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا کہ باقی کے آٹھ دن کیسے گزاروں ۔ تین دنوں کے بعد ایک ازہری عالم ہمارے گھر یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ میں کس طرح تیاری کر رہا ہوں ۔ انھوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھا جس کا جواب دینے سے میں قاصر رہا ۔ میں ڈرا کہ میں امتحان میں فیل نہ ہو جاؤں ۔ تین دن کے بعد پھر وہی عالم آئے اور مجھ سے عجیب و غریب سوالات پوچھنے لگے لیکن میں کچھ زیادہ نہ سمجھا ۔ امتحان کے دن چھ سات اساتذہ تکیوں کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور میں ان کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ رہا ۔ میں نے جوں ہی ایک کتاب پڑھ کر نفسِ مضمون کی تشریح کی تو چاروں طرف سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی ۔ میں کبھی تو جواب دیتا اور کبھی پسینہ سے شرابور ہو جاتا ۔ ان سوالات میں سے مجھے ایک سوال آج بھی یاد ہے کہ مصنف نے "ای" کیوں کہا اور "اعنی" کیوں نہیں کہا ؟ ان سوالات کا تو وہی امیدوار جواب دے سکتے تھے جنھوں نے ازہری نصاب کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہو ۔ میں نے تو اپنے والد سے پڑھا تھا اور اس قسم کے سوالات کا عادی نہ تھا ۔ میں کھائے پیئے بغیر اس امتحان میں چھ گھنٹے بیٹھا رہا ۔ ممتحن حضرات تو کبھی کبھی باہر نکل کر چل پھر لیتے ۔ قہوہ اور شربت لیموں بھی پی لیا کرتے تھے لیکن مجھے یہ چیزیں نصیب نہ تھیں ۔ بالآخر مجھے چھٹکارا ملا اور باہر آنے کی اجازت ملی ۔ میں جب کھڑا ہونے لگا تو اپنے پاؤں سیدھا نہیں کر سکتا تھا اور نہ اچھی طرح کھڑا ہو سکتا تھا ۔ ایسا کرنے میں مجھے بڑی دیر لگی ۔ اس حالت میں گھر جانا مجھے دشوار معلوم ہوتا تھا ۔ خیر جو ہوا سو ہوا

میں امتحان میں کامیاب تو ہو گیا لیکن میرا نمبر چھٹا آیا تھا ۔ اس قسم کا سخت امتحان مدرسۃ القضاء میں سب سے پہلا اور آخری تھا بعد میں عاطف برکات کی مداخلت پر امتحان نرم کر دیا گیا ۔ اس کی مدت بھی کم کر دی گئی اور ممتحن حضرات نے بھی کلاسوں میں نرمی سے امتحان لیا ۔

(۲)

میں مدارس ابتدائیہ میں مضمون نویسی میں سب سے پیچھے تھا لیکن مدرسۃ القضاء میں میرا معاملہ اس کے برعکس تھا ۔ مدرسہ میں ہمارے داخل ہونے کے ایک مہینہ بعد استاد ادب نے "تدوین علوم پر قرآن پاک کا اثر" کے موضوع پر لکھنے کو کہا ۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اس مضمون کے لکھتے وقت شاملِ حال رہی ۔ مضمون ایسا عمدہ بندھا کہ جب کوئی مدرسہ میں آتا تو عاطف بک یہ مضمون پڑھ کر سناتے ۔ اس طرح میری مضمون نویسی کی دھاک بیٹھ گئی ۔ وہ میری برابر حوصلہ افزائی کرتے رہتے ، بغیر کسی استحقاق کے مجھے اول نمبر پر رکھتے ۔ وہ پرچہ جواب سے زیادہ دل کی بات پڑھ لیتے تھے ۔ اس طرح میں نے اپنی قدر و منزلت کو ساری تعلم کے دوران میں قائم رکھا ۔ اس سے مجھے شوق چرایا کہ میں اخبارات میں بھی مضامین لکھا کروں ۔ مدرسہ میں ایک طالب علم میرا دوست تھا جس کی جان پہچان شیخ علی یوسف ایڈیٹر الموید سے تھی ۔ اس طالب علم کے مقالات پہلے صفحہ پر شائع ہوا کرتے تھے ۔ میری درخواست پر اس نے میرا تعارف شیخ علی یوسف سے کرایا ۔ ان کے کہنے پر میں نے ایک مضمون خطا العقلاء[1] کے نام سے لکھا ۔

---

۱ ۔ عقلمندوں کی غلطیاں ۔

اس میں سعد پاشا کے محکمہ تعلیم کو چھوڑنے اور دوسرے محکمہ میں جانے پر نقد و احتساب کیا تھا کیونکہ وزارت معارف میں رہ کر جدید تعلیمی پالیسی وضع کرنے کے لیے انہیں انگریزوں کی مخالفت مول لینا پڑتی تھی لیکن اس نئے محکمہ میں اس قسم کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور کام بھی سہل تھا ۔ شیخ علی یوسف نے نامعلوم مصلحتوں کی بناء پر اس مضمون کو شائع نہیں کیا ، بہرحال میرے زمانہ طالب علمی کا یہ پہلا اور آخری مضمون تھا ۔ میں تعلیم میں ازہری حواشی چھوڑ کر ہر چیز سے خوش تھا ۔ ہر جماعت میں حساب ، الجبرا ، جیومیٹری میں اول آتا اور ہر سال انعام پاتا ۔

میں مدرسہ کے تیسرے سال میں تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے حادثہ میں پھنسا لیا ۔ ہو سکتا تھا کہ اس مدرسہ سے میرا رشتہ منقطع ہو جاتا اور بڑی مشکل کے بعد دوبارہ داخلہ ملتا ۔ ہوا یہ کہ ۱۹۱۰ء میں سنہ ہجری کی یادگار میں ایک بڑا جلسہ ہوا ۔ جلسہ کے منتظمین نے مجھے کوئی موضوع لینے کو کہا ۔ میں نے "مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب" کو پسند کیا اور اپنے مقالہ کی بنیاد دو اسباب پر رکھی (۱) بلادِ اسلامیہ میں نظامِ حکومت کا بگاڑ جس کی وجہ سے رعیت پر ظلم و ستم ہو رہا ہے اور حکام لوٹ کھسوٹ اور ذاتی منفعت میں مشغول ہیں ۔ (۲) علمائے دین جو ظالم حکومتوں کی تائید کرتے ہیں ۔ ان کی سازش سے عوام کو قسمت پر شاکر رہنے اور دنیاوی نعمتوں سے محروم رہ کر آخرت کی آسائش پانے کی تلقین کرتے رہتے ہیں ۔ یہ سب ان کی کمزوری اور ذلت کے اسباب ہیں اور عوام کی اصلاح بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ حکام اور علمائے دین کی اصلاح ہو جائے ۔

میں نے تقریر ختم کی تو جلسہ گاہ تالیوں سے گونج اٹھی لیکن

عاطف بک نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو ایسی باتیں کہتے ہو“ انھوں نے مجھ سے تقریر لے لی اور شیخ الخضری کے پاس جا کر اُن کے کان میں کچھ کہا۔ شیخ صاحب نے کھڑے ہوکر کہا کہ ”مقرر کا اشارہ سابقہ حکومتوں اور علماء کی طرف تھا۔ حکومتِ مصر پر تو کوئی مواخذہ نہیں کیونکہ وہ انصاف پسند ہے۔ اُس نے مدرسة القضاء الشرعی کھول رکھا ہے۔ اُس پر دل کھول کر خرچ کر رہی ہے۔ طلبہ بھی انعامات سے سرفراز ہوتے رہتے ہیں اور علمائے دین بھی پاکیزگی، صفائی اور ترقی کی عمدہ مثال ہیں“۔ جب جلسہ برخاست ہو گیا تو عاطف بک نے کہا کہ اب تیرا مدرسہ میں ٹھہرنا قضاء و قدر کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ اگر اخبارات نے یہ تقریر شائع کر دی اور اس کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا تو تجھے قربانی کا بکرا بننا پڑے گا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس معاملہ میں عاطف بک بھی معذور تھے۔ خدیو مصر مدرسہ کے سخت دشمن اور اس کے خلاف جوڑ توڑ میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اربابِ ازہر بھی اس سے سخت ناراض تھے۔ مدرسہ کی بقا تو حکومتِ مصر اور انگریزوں کی خوشنودی پر منحصر تھی۔ اگر دونوں ہی ناراض ہو جائیں تو مدرسہ کا اللہ والی تھا۔

مدارس میں سیاسی گفتگو شجرِ ممنوعہ تھی حتیٰ کہ جب تک انسپکٹر مدارس یہ تصدیق نہ کر دیں کہ یہ کتاب سیاسی مباحث سے خالی ہے تو وہ کتاب مدارس میں لگ نہیں سکتی تھی۔ اشعار کے منتخبات بھی انسپکٹروں کی چھان بین کے بعد ہی کلاسوں کے لیے

مقرر ہوتے تھے۔ متنبی[1] کا یہ شعر:

سادات کل الناس من نفوسہم
و سادۃ المسلمین الاعبد القزم

ترجمہ:

کل لوگوں کے سردار ان سے ہیں
مگر مسلمانوں کے سردار ذلیل غلام ہیں

یا بشار[2] کے مشہور شعر جو شوریٰ کی تعریف میں آتے ہیں یا کسی دوسرے شاعر یا نثر نگار کی تخلیقی کاوش جس کا تعلق نظام حکومت اور آزادی کی قدر و قیمت سے ہوتا، سب ممنوع چیزیں تھیں جس پر حکومت انگریزی کے تعلیمی مشیر مسٹر ڈنلوپ سخت سزائیں دیا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مدرسہ نے اپنی لائبریری کے واسطے کتابیں خریدیں۔ ان میں قرآن شریف بھی تھا۔ انھوں نے مدرسہ والوں سے اقرار کرا لیا کہ اس میں سیاست نہیں ہے۔ یہ بیماری ہر جگہ پھیل گئی تھی۔ ہم نے بھی دوران تعلیم، سیاست اور حکومت پر نقد و احتساب یا انگریزوں کے تصرفات کے متعلق کوئی لفظ نہیں سنا۔ ہاں اخباروں سے ان باتوں کی بھنک ہمارے کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ میں روزانہ اللواء اور المؤید دیکھتا اور ان سے متاثر ہوتا۔

مدرسہ میں دو دفعہ سٹرائیک (ہڑتال) بھی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ تو عام تھی۔ ہم ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو اوقات درس کے بعد مرحوم مصطفیٰ کامل کے جنازے کے ساتھ گئے تھے اس دن ساری

۱۔ متنبی: (۳۰۳۔ ۳۵۴ھ) عربی زبان کا زندہ جاوید شاعر۔
۲۔ بشار بن برد: (۹۵۔ ۱۶۷ھ) عباسی دور کا ایک غزل گو شاعر جس کو مہدی نے زندقہ کے الزام میں قتل کروا دیا تھا۔

قوم بچشم گریاں اور دل بریاں شریک جنازہ تھی۔

دوسری دفعہ اسباق کے اختتام پر ایک واقعہ پیش آیا۔ مدرسہ میں ورزشی کھیلیں لازمی تھیں۔ پرنسپل صاحب نے ان کے لیے ایک خاص جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ اُس وقت گرمی کا موسم تھا اور وہاں دھوپ چمکی ہوئی تھی۔ طلبہ نے سائے میں کھیلنے کی اجازت مانگی۔ پرنسپل صاحب نے اس بناء پر انکار کر دیا کہ طلبہ کو صبر و شدائد کی عادت ڈالنی چاہیے۔ طلبہ اپنی بات پر اڑے رہے اور سایہ میں کھڑے رہے۔ جب پرنسپل صاحب کو علم ہوا تو بہت ناراض ہوئے کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ مغلوب الغضب ہو کر آئے اور طلبہ سے کہا کہ وہ اپنی اپنی کلاس میں چلے جاویں۔ طلبہ نے انکار کر دیا۔ انھوں نے پھر کہا لیکن طلبہ کھڑے رہے۔ پرنسپل صاحب نے ایک لحظہ سوچا کہ کیا کیا جائے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ سب سے تخاطب بے سود ہے۔ ایک طالب علم کو جس میں انھوں نے ڈر اور تابعداری کی علامات دیکھ لی تھیں پکار کر حکم دیا کہ وہ جماعت میں چلا جائے اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو وہ کلاس سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے گا۔ سب طلبہ کو پرنسپل صاحب کی صداقت، وعدہ کی سچائی اور وعید کا یقین تھا، وہ جانتے تھے کہ اُن کے حکم سے پیچھا چھڑانا کس قدر مشکل ہے۔ اُس طالب علم نے تھوڑے سے توقف کے بعد کلاس کی راہ لی۔ پھر انھوں نے دوسرے کو اسی طرح آواز دی پھر ساری کلاس کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھ کر کہا کہ اس کے بعد ہڑتال فضول ہے۔ اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جاؤ۔ اس طرح یہ ہڑتال ختم ہو گئی۔

مدرسۃ القضاء میں میرا دینی شعور حب الوطنی کے جذبہ سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ مدرسہ میں مجھے طلبہ سُنّی کہتے اور دوسروں

کو فیلسوف اور زندیق - مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے ایک آستاد نے آنحضرت صلعم کی انگلیوں سے پانی نکلنے کے معجزہ کا انکار کیا تھا تو میں نے خوب تکرار اور بحث کی تھی - بحث و مباحثہ نے شدت اختیار کر لی تو میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں اپنے آستاد سے سخت ناراض ہوا لیکن وہ اس کے مقابلے میں حلم اور مسکراہٹ سے پیش آتے رہے -

ایک دفعہ میں ایک صوفی بزرگ مرحوم شیخ جاد علوان کی خدمت میں حاضر ہوا - یہ بزرگ ظریف الطبع اور پاکباز تھے - آن سے کوئی کرامت تو ظاہر نہ ہوتی تھی مگر آن کا چہرہ دمکتا رہتا اور دل کی رقت آن کی حرکات سے ظاہر ہوتی - وہ پیشہ کے لحاظ سے عطار تھے - طب کی قدیم کتابیں پڑھ کر بعض دوائیں تیار کر لیتے تھے جو امراض کے لیے شافی ہوتیں ، گردہ میں پتھری کا بھی علاج کر لیتے - ادب پسند بھی تھے ، شعر کا ذوق رکھتے تھے اور مزاحیہ زجل بھی کہہ لیتے تھے - غزل کے اشعار سن لیتے لیکن صوفیانہ ذوق سے سمجھتے اور تصوف کی بنا پر آس کی تاویل کرتے - ایک دن مجھے شعر سنانے کو کہا جب میں نے ابو تمام[1] کا یہ شعر سنایا :

و انجدتمو من بعد اتہام دارکم
فیا دمع انجدنی علی ساکن نجد

ترجمہ : تم اپنے گھر کی پستی کے بعد بلندی کی طرف چلے گئے ، کاش کہ آنسو ساکنان نجد کے مقابلہ میں میری مدد کرتے -

---

۱ - ابو تمام : (۱۸۸ - ۲۳۱ھ) عربی زبان کا ایک شاعر اور دیوان الحماسہ کا جامع -

شعر سن کر مجھے ٹھہرنے کو کہا ، پھر کئی دفعہ یہ شعر پڑھوا کر سنا ۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے تھے ۔ دوسرے دن مجھے اس کا مخمس سنایا ۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے اہلِ تصوف کا طریقہ سکھا دیں اور مجھے مرید کر لیں ۔ انھوں نے جمعہ کے دن امام شافعیؒ کے مزار کے پاس مجھے مرید کرنے کا وعدہ کیا ۔ ہم وہاں جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئے ۔ اُنھوں نے مجھے عہد پڑھ کر سنایا جو میں نے بھی دہرایا پھر اُنھوں نے تصوف کے طریقہ کی تعلیم دی ۔

طالب علموں کی شرارتیں تعلیم کی سختی بھلا دیتی تھیں ۔ کلاس میں بعض شیطان قسم کے حیلہ باز طالب علم تھے جو دنیا کی اُونچ نیچ سے خوب واقف تھے ۔ وہ دریدہ دہن اور مسخرے بھی تھے ۔ بعض بالکل سادہ لوح مگر نیک دل تھے ۔ بعض ان دونوں کے بین بین تھے ۔ ہمیں مدرسہ میں داخل ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس بن گئے اور ہر ایک کی عقلی ، خلقی قوت اور کمزوری جان گئے ۔ جیسا کہ اس دنیا کا قاعدہ ہے ۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو مطیع کر لیا ۔ طاقتور کمزوروں کو چھیڑتے اور اُن کو اُنگلیوں پر نچاتے ، اُن کی غلطیوں اور حماقتوں کو ظاہر کرکے اُن کا خوب مذاق اُڑاتے ۔ کبھی تو کسی بیوقوف کی غفلت پر ہنستے ۔ کبھی کسی کے بخل کو نشانہ تضحیک بناتے ۔ کبھی کسی جلد غصہ باز کو غصہ دلا کر اُس کی گالیاں سنتے اور اُس کی حرکات سے لطف اندوز ہوتے ۔ کبھی کوئی رومی مرغ کی طرح چلتا اور ہنستا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گدھا آواز نکال رہا ہے ۔ اس قسم کے مضحکہ خیز واقعات سے ہم اپنی پڑھائی کا بوجھ ہلکا کر لیتے ۔

ایک دن مدرسہ کے پڑوس میں ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے

بڑا متاثر کیا ۔ مدرسہ کے پاس ایک بڑے رئیس کا مکان تھا ۔ اُس کی زرعی اور سکنی بڑی جائیداد تھی ۔ وہ بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا ۔ اُس کی نیک دلی اُسے خیراتی کاموں پر آمادہ کرتی ، لیکن اُس کی سادگی سے فائدہ اُٹھا کر بعض دھوکہ بازوں نے اُس کے مال پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیے ۔ اُس کی شان و شوکت کا اس اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب ریلوے ٹرام کی لائن اُس کے گھر کے سامنے بچھنے لگی تھی تو اُس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ یہ ساری زمین اُس کی ملکیت تھی ۔ جب تک پاشا کے لڑکے مدرسہ نہ چلے جاتے ٹرام بند رہتی اور گاڑیاں قطار در قطار کھڑی رہتیں ۔ شیخ علی یوسف نے اس موضوع پر مقالہ بھی لکھا تھا ۔

لیکن پاشا فضول خرچی سے باز نہ آتا ۔ اپنے مال کو بے دریغ اُڑاتا رہتا ۔ جب جائیداد کی پیداوار سے آمدنی ناکافی ثابت ہوئی تو اس نے ادھار لینا شروع کردیا آخرکار اس کی تمام جائیداد قرض میں چلی گئی ۔ ایک دن میں حسب معمول مدرسہ جا رہا تھا ۔ راستے میں ، میں نے دیکھا کہ چند لوگ گھنٹی بجا بجا کر پاشا کے گھر کے اسباب اور مال و متاع کی فروختگی کا اعلان کر رہے تھے اور گھر کا مالک ، مکان خالی کر چکا تھا ۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں ایک دن مدرسہ سے واپس آ رہا تھا ۔ پاشا ٹرام کے سٹیشن پر کھڑے ٹرام کا انتظار کر رہے تھے حالانکہ کبھی ٹرام اس کے لڑکوں کی گاڑی کے انتظار میں رہتی تھی کہ گاڑی نکل جائے تو وہ آگے بڑھے ۔

—:O:—

۱۲

بھائی کی وفات

یہ تو میرے مدرسے کا حال تھا لیکن ہمارے گھر میں امن و اطمینان اور سعادت کا دور دورہ تھا جس کو رنج و تکلیف سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ مزاح اور مذاق کا کبھی گذر نہ ہوا تھا کیونکہ میرے والد حد درجہ سنجیدہ، متین اور عزلت گزین تھے۔ وقت کا زیادہ حصہ مطالعہ میں گذارتے۔ گھر میں والدین، میں، بڑا بھائی، دو بڑی بہنیں، ایک چھوٹا بھائی اور بہن تھی۔ میرا چھوٹا بھائی نوجوان، ذہین اور خوش باش تھا۔ وہ گھر کی رسومات پر برستا اور گھر دیر سے آتا۔ زیادہ وقت لہو و لعب میں گذارتا جس کی وجہ سے والد ناراض رہتے۔ دونوں میں تکرار رہتی جو کبھی مار پیٹ پر ختم ہوتی۔ والد نے میری طرح اس کو بھی تعلیم دی تھی۔ اس نے محکمہ اوقاف کے ایک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، پھر مزید تعلیم کے لیے مدرسۃ القضاء کے درجہ ادنیٰ میں داخل ہوا۔ مدرسہ کے دو درجے تھے۔ درجہ ادنیٰ اور درجہ اعلیٰ۔ درجہ ادنیٰ میں پڑھائی کی مدت سات سال تھی اور درجہ اعلیٰ جس میں، میں نے تعلیم پائی تھی وہاں تعلیم کی مدت چار سال تھی۔ میرا بھائی مدرسہ میں داخل ہوا تو اس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ مدرسہ کا پہلا سال تو اس نے کامیابی سے ختم کر لیا اور کھیلوں میں انعام بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو میں ایک دوست کے ہاں چلا گیا وہاں سے واپس آیا تو دیکھا کہ بھائی صاحب کمرے کے

وسط میں ایک چٹائی پر پڑے بخار کی وجہ سے کراہ رہے ہیں ۔ گھر میں سب فکرمند تھے ۔ میں باہر جا کر ڈاکٹر کو بلا لایا ۔ اس نے آ کر مریض کو اچھی طرح دیکھا اور کہا کہ ٹائیفائیڈ (میعادی بخار) ہو گیا ہے اور مریض کی حالت خطرے سے خالی نہیں ۔ اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ دیکھ بھال کے لیے مریض کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے ۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے دوائی بتلائی اور چلا گیا ۔ میں گھبرایا ہوا والدین کے پاس گیا اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ بھائی کو ہسپتال بھیج دیں ۔ اس وقت یہ بات لوگوں کے ذہن میں جمی ہوئی تھی کہ ہسپتال کا دوسرا نام موت ہے ۔ میں والدین کو ہسپتال کے فوائد ، وہاں مریضوں کی دیکھ بھال کے انتظامات اور چھوت چھات سے بچاؤ کے متعلق لاکھ سمجھاتا رہا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور بھائی کی بیماری میں اضافہ ہوتا رہا ۔ اس کے ساتھ میری اذیت بھی بڑھتی گئی ۔ پریشانی کے عالم میں کبھی تو میں گھر سے باہر نکل جاتا اور کبھی واپس آ جاتا ۔ دوا دارو سے کچھ بھی افاقہ نہ ہوا ۔ مریض کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی اور آخرکار وہ مر گیا ۔ گھر میں قیامت برپا ہو گئی ۔ والدہ نے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا اور رو رو کر بے ہوش ہو گئی ۔ والد نے صبر و سکون کے ساتھ بھائی کے کفن دفن کا انتظام کیا لیکن ماتم کرنے سے انکار کر دیا ۔ ہر جمعرات کے جمعرات گھر میں مستورات جمع ہوتیں اور نالہ و شیون کرتیں ۔ جب چالیسواں گذر گیا تو والدہ دوسری جگہ جا کر ماتم کر آتیں ۔ بھائی کا کمرہ ہو یا اس کی لائبریری ، کتابیں ہوں یا اس کے دوست ، یا اس کے مدرسہ آنے جانے کے اوقات ہوں ، وہ ان سب چیزوں کو دیکھتی اور یاد کر کے روتی ۔ رہے میرے والد تو انھوں نے اس حادثہ کو بڑے حوصلہ اور صبر سے

برداشت کیا ۔ وہ قرآن پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچاتے اور صبر و تسکین حاصل کرتے ۔ انھوں نے امام سیوطی[1] کی کتاب (فضل الجلد عند فقد الولد) "یعنی لڑکے کی موت پر صبر کی فضیلت" کا نام سنا تھا ۔ وہ یہ کتاب لے آئے اور اس کی کتابت کرتے رہے ۔ لیکن اس حادثہ فاجعہ نے دنیا میری نظروں میں اندھیر کر دی تھی ۔ مجھے اب رونا دھونا ہی اچھا لگتا تھا ۔ فاختہ جب کوکتی تو میں رو دیتا ۔ اس واقعہ نے دنیا کی قدریں میرے نزدیک بدل دیں ۔ کسی کو محنت مزدوری کرتے دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ بے فائدہ کام ہے ۔ لوگوں کو لڑتے جھگڑتے یا ہنستے بولتے دیکھتا تو یہ خیال آتا کہ یہ سب پاگل ہیں ۔ دنیا میرے نزدیک ایک حقیر سی چیز تھی ۔ وہی لوگ اچھے لگتے جن کو ان چیزوں کی پروا نہ تھی ۔ یہ غم و حزن مجھ پر ہفتوں بلکہ مہینوں طاری رہا ۔ مدرسہ میں مجھے غمزدہ شہزادہ کہہ کر پکارتے ۔ مدرسہ میں یہ غم بھول جاتا تو گھر آ کر تازہ ہو جاتا ۔ میں ایک دفعہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا ۔ مدرسہ میں کھیلوں کے انعامات تقسیم کرنے کی تقریب تھی ۔ میرے متوفی بھائی کو بھی انعام ملنا تھا ۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ انعام میرے والد کو مل سکتا تھا لیکن میں نے اپنے باپ سے اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا کیونکہ اس سے ان کا غم و حزن تازہ ہو جاتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا ۔

اس واقعہ کو ایک سال اور کئی ماہ گذر گئے اور رنج و الم کی آگ دھیمی پڑ گئی لیکن آئندہ ماہ رمضان میں یہ زخم جو مندمل

---

۱ ۔ امام جلال الدین سیوطی : (۸۴۹ - ۹۱۱ھ) مشہور مفسر ، محدث اور عالم دین ۔

ہو چکا تھا پھر ہرا ہو گیا اور آگ جو ٹھنڈی پڑ گئی تھی پھر بھڑک اٹھی ۔

میرے بڑے بھائی کی عمر کوئی پینتیس سال کی ہوگی وہ نکوکار اور پرہیزگار تھا ۔ چہرے پر تندرستی کی سرخی جھلکتی تھی لیکن اس کے ساتھ سادہ مزاج بھی تھا ۔ میرے والد نے میری طرح اس کی تعلیم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی ۔ حفظِ کلام پاک کے بعد اس نے چند چھوٹے چھوٹے رسالے بھی یاد کر لیے تھے ۔ اس کے بعد ازہر میں داخلہ لے لیا ۔ دو سال کے لگ بھگ وہ پڑھتا رہا ۔ سالانہ امتحان کا وقت آیا تو شش و پنج میں پڑ گیا ۔ ارادے باندھتا اور توڑ ڈالتا ۔ اس کو دلیاوی شہرت یا اور کسی قسم کا لالچ نہ تھا ۔ اس کی شادی بھی ہو چکی تھی جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی ۔ گھر سے لے کر مسجد اور مسجد سے لے کر ازہر تک اس کی زندگی محدود تھی ۔ جب رمضان کا مہینہ آتا تو وہ دن کو روزہ رکھتا ۔ مسجد میں نماز تراویح پڑھ کر گھر چلا آتا ، اور کبھی اکیلا اور کبھی اپنے نابینا دوست کے ساتھ سحری تک کلامِ پاک کی تلاوت میں لگا رہتا ۔ پھر صبح سے لے کر ظہر تک سویا رہتا ۔ یہ اس کی عادت تھی ۔

اواخر رمضان کا ذکر ہے کہ وہ حسبِ معمول نماز عشاء و تراویح سے فارغ ہو کر گھر آیا اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گیا ۔ اس کے بعد سحری کھائی اور ہم سب سو گئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دلدوز چیخ سنی ۔ ہم ڈر کر اٹھ کھڑے ہوئے اور آواز کی طرف لپکے ، دیکھا کہ بھائی صاحب بے حس و حرکت فرش پر پڑے ہوئے ہیں ۔ ان کی بیوی چِلا رہی ہے ۔ ہم نے ان کو چارپائی پر لٹا دیا اور ساری رات ناقابلِ بیان پریشانی و اضطراب میں گذاری ۔

ہم روتے تھے اور پرانا غم تازہ ہو جاتا تھا۔ صبح ہوئی تو میں ایک مشہور یوروپین ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ وہ میرا قلق دیکھ کر میرے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر آ کر اس نے مریض کو اچھی طرح سے دیکھا۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انھوں نے بیماری کا نام فالج بتلایا جس سے دایاں حصہ متاثر ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا بتلائی اور چلے گئے۔ میں دوا لا کر علاج معالجہ اور دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مریض کو افاقہ ہونے لگا۔ زبان میں بھی گویائی پیدا ہو گئی۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے لگا اور بچوں کی طرح چلنے لگا۔ ڈاکٹر کبھی کبھار آ کر دیکھ جاتا لیکن دو ماہ کے بعد دوبارہ شدید حملہ ہوا۔ میں پھر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے ہتھیلیاں الٹا پلٹا کر بتلایا کہ اب مرض انتہا کو پہنچ چکا ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں رہی۔ یہ صدمہ جانکاہ تھا۔ مصیبت پر مصیبت آ رہی تھی۔ میرے والدین نے تسلی پانے کے لیے حج و زیارت مدینہ کا قصد کیا۔ وہاں آنحضرت صلعم کے روضۂ مبارک کو پکڑ کر اپنے لیے صبر اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی۔

—— :o: ——

۱۳

مدرسۃ القضاء کے استاد

میں آخری امتحان میں پاس ہوا تو میرا چھٹا نمبر تھا لیکن پرنسپل صاحب نے ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے اول نمبر پر آنے والے تین طالب علموں کے ساتھ مجھے بھی مدرس رکھ لیا۔ اس وقت مدرسہ میں ایک نیا نظام چلا تھا جس سے مصری آشنا تھے۔ یہ نظام مصریوں کا تھا یعنی ہر پروفیسر کے ساتھ ایک مددگار استاد (اسسٹنٹ پروفیسر) ہوتا۔ یہ پروفیسر کے ساتھ مل کر سبق کی تیاری کرتا اور کلاس میں بھی ساتھ جاتا۔ مددگار استادوں کی تقسیم ان کے ذوق اور میلان کے مطابق ہوتی تھی۔ کوئی فقہ کے پروفیسر کے ساتھ تھا تو کوئی لٹریچر (ادب) کے پروفیسر کے ساتھ۔ مجھے علم الاخلاق کے پروفیسر کے ساتھ لگایا گیا۔ اس وجہ سے ہمارا ربط بہت بڑھا اور میں نے عاطف برکات سے بہت کچھ حاصل کیا۔ میں ان کے گھر چلا جاتا، اسباق کی تیاری کرتا۔ وہ انگریزی کتابیں پڑھ کر مجھے عربی میں لکھاتے جاتے۔ کبھی خود ترجمہ کر کے مجھے سناتے۔ اسباق پڑھانے سے پہلے ہم آپس میں خوب بحث بھی کر لیتے۔ یہ بحث و مباحثہ کبھی کبھی اجتماعی، دینی اور سیاسی مسائل کا رُخ اختیار کر لیتا۔ وہ اپنی رائے پیش کرکے میرا مجادلہ سنتے۔ دینی معاملات میں عقل کو کارفرما کرنے میں انھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں اس وقت جذبات سے کام لیتا تھا نہ کہ عقل سے، کیونکہ میرے خیال میں دین کا معاملہ عقل سے بالا تر ہے۔ اگر کوئی بات

عقل سے سمجھ میں نہیں آ سکتی تو ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم سب سے زیادہ ہے۔ وہ ہمارے نفع و نقصان کو خوب سمجھتا ہے اور وہ افہام و تفہیم کے لیے عقل اور بحث و مباحثہ ناپسند نہیں کرتا لیکن پروفیسر صاحب کو بحث و مباحثہ کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ وہ دیر تک حجت بازی میں مصروف رہتے اور سننے والا چپ ہو جاتا اگرچہ اس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا۔ اس بحث و مناقشہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں دینی تفصیلات اور ان کی جزئیات کو عقل کے پیمانے سے ناپنے لگا۔ رہا دین کے جوہر کا معاملہ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کی عظیم الشان قدرتوں پر ایمان لانا تو یہ میرے دل کی گہرائیوں میں ٹھہرا رہا اور اس کو کسی قسم کا بحث و مباحثہ یا مطالعہ اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا یہ اثر نکلا کہ میں اب مخالفوں اور معارضوں کے ساتھ رواداری سے پیش آتا ہوں۔

ان کی وجہ سے میرے خیالات کی تنگ نائے میں وسعت پیدا ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے ازہر، دارالعلوم اور پھر انگلستان جا کر تعلیم پائی تھی۔ وہ مختلف مجالس میں شریک رہے تھے۔ سعد زغلول، فتحی زغلول اور قاسم امین کی صحبت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے بہت سے معاملات اور حالات سے مطلع تھے۔ بحث و مباحثہ اور مختلف آراء کے پرکھنے کے بعد انھوں نے اپنے معتقدات قائم کیے تھے۔ میں نے ان کے خلق سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ وہ حد درجہ صاف گو تھے اگرچہ اس سے تکلیف ہی اٹھانی پڑے۔ غایت درجہ منصف مزاج تھے اگرچہ اپنی ذات کا معاملہ ہو۔ ایک نظام کے پابند تھے اگرچہ وہ اور ان کے ساتھی تنگدل ہوں۔ مجھے ایک واقعہ آج بھی یاد ہے۔ مدرسہ والوں نے شیخ محمد مہدی کو اعلیٰ گریڈ دینا چاہا۔ خدیو مصر

نے بھی اس کی منظوری دے دی لیکن عاطف بک کے خیال میں دوسرا آدمی اس اضافہ کا مستحق تھا۔ انتظامیہ کمیٹی شیخ جامع الازہر کی صدارت میں اکٹھی ہوئی۔ اس کے ارکان میں عبدالخالق پاشا ثروت وغیرہ بھی شامل تھے۔ سب کی یہ رائے تھی کہ اس معمولی معاملے میں خدیو مصر سے اختلاف بے سود ہوگا۔ سب ارکان نے اعلیٰ گریڈ دینے پر اتفاق کیا لیکن عاطف بک اپنی رائے پر اڑے رہے، جب دیکھا کہ ان کی مخالفت کارگر نہیں ہے تو یہ اصرار کیا کہ جلسہ کی کارروائی میں اُن کا اختلافی نوٹ بھی شامل کیا جائے۔ جب شیخ مہدی کو اعلیٰ گریڈ ملا تو وہ شکریہ ادا کرنے گئے۔ عاطف بک نے کہا کہ آپ میرا شکریہ نہ ادا کریں، میں نے تو مخالفت کی تھی۔ شیخ مہدی نے جواب دیا کہ پھر تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ عاطف بک الصاف کے معاملہ میں کسی بڑے رئیس کی بھی سفارش منظور نہیں کرتے تھے۔

جب وہ محکمۂ تعلیم میں نائب تھے تو حمد پاشا الباسل کے لڑکے نے مدرسہ میں داخل ہونا چاہا لیکن اُس کی عمر مقررہ حد سے زیادہ تھی۔ عاطف بک نے لڑکے کو لینے سے انکار کر دیا۔ جب سعد پاشا نے اصرار کیا تو کہا "یا تو قانون تبدیل کر دیا جائے یا سب کو اس عمر میں داخل کیا جائے۔"

علم الاخلاق پڑھانے کے لیے میں نے کئی سال عاطف بک کے ساتھ کام کیا۔ جب میں نے اسباق کی تیاری میں ترقی کر لی تو وہ اس علم کی تدریس کا بوجھ مجھ پر آہستہ آہستہ ڈالنے لگے۔ میں کبھی کبھی فقہ اور تاریخ اسلام بھی پڑھانے لگتا۔ پڑھانے میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے بھی زیادہ محنت کرتا۔ مختلف مصادر سے کام لے کر ایک سبق کی تیاری میں کئی گھنٹے صرف کرتا اور طلبہ

کے لیے نوٹس وغیرہ تیار کرتا ۔

ان ایام میں اپنے دوست اور اُستاد احمد بک امین سے بھی راہ و رسم بڑھی ۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ہمیں قانون کے بعض اسباق پڑھائے تھے ۔ جب میں فارغ التحصیل ہوا تو یہ شاگردی، دوستی میں بدل گئی ۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے اصولِ فقہ میں ایک کتاب پڑھنے پر اتفاق کیا تاکہ سول لاء کا اصولِ فقہ سے مقابلہ کریں ۔ ہم صبح مل بیٹھتے اور تقریباً دو گھنٹے تک امام شاطبی[1] کی کتاب الموافقات پڑھتے رہتے ۔

ایک دن اُنھوں نے عجیب و غریب درخواست کی ۔ وہ یہ تھی کہ اصول فقہ ایک گھنٹہ پڑھنے کے بعد قاہرہ کے اسلامی آثار کا بھی مطالعہ کریں ۔ ہم نے علی پاشا مبارک کی خططِ مصریہ منگوا لی ۔ اس میں قاہرہ کے موجودہ آثار قدیمہ از قسم مساجد، تکایا، شاہرات اور قدیم مکانات کا مطالعہ کرتے اور نماز عصر کے بعد ہر مسجد میں داخل ہوکر خطط کے بیانات کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ۔ اُس کی تاریخ اور اُس کے بنانے والے کا پتہ چلاتے ۔ پتھر کے کتبوں کو پڑھتے جن سے اس قسم کی معلومات میں مدد ملتی تھی ۔ اس طرح ہم نے تین ماہ میں قاہرہ کے آثار کا مطالعہ ختم کر لیا ۔ یہ درس بہت مفید ثابت ہوا ۔

اس کے ساتھ مجھے غیر ملکی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ مدرسہ میں علومِ عصریہ کے اُستاد اجنبی زبانوں کی واقفیت پر اتراتے تھے ۔ کوئی تو فرانسیسی زبان جاننے پر فخر کرتا، اور کوئی انگریزی

---

۱ ۔ الموافقات فی اصول الاحکام : امام شاطبی الاندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اصول فقہ میں اہم کتاب ہے ۔

ہر ۔ یہ اُستاد اسباق کی تیاری میں ان زبانوں پر اعتماد کرتے اور کہتے کہ یہ زمانے کا ساتھ دیتی ہیں ، حتیٰ کہ کوئی علمی کتاب دس سال پہلے کی لکھی ہوئی آج مشکل سے قابلِ مراجعت قرار پا سکتی ہے ، برخلاف کتب ازہریہ کے جن کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ہر زمان و مکان کے لیے مناسب ہیں ۔ اساتذہ ہمیشہ یہ کہتے رہتے کہ عربی پڑھنے والا دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے اور جب وہ دوسری زبان سیکھ لیتا ہے تو دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے ۔ اسی بناء پر احمد بک امین[1] نے مجھے کہا کہ علی پاشا مبارک[2] نے بہت سے آثار کا ذکر خطط میں نہیں کیا ، شاہبندر سوداگر کی حویلی جو حوش قدم میں ہے ، اس کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا ۔ یہ حویلی اُس زمانے کی اجتماعی زندگی کی مظہر تھی جبکہ وہ بنی تھی ۔ اس کا پتہ مجھے ایک انگریزی کتاب میں چلا جس کو ہدیسکر نے اطالوی زبان میں لکھا تھا اور اُس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ۔ اس وجہ سے مجھے بھی غیر ملکی زبان سیکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن حیران تھا کہ انگریزی سیکھوں یا فرانسیسی ۔ میں نے فرانسیسی زبان سیکھنے کو ترجیح دی کیونکہ اس کے مبادیات سے میں بچپن میں واقف ہو چکا تھا اور مدرسہ والدہ عباس میں چوتھی جماعت تک اس کی تعلیم بھی پائی تھی ، اس لیے بہ نسبت دوسری غیر ملکی زبانوں کے فرانسیسی زبان مجھے آسان معلوم ہوئی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مجھے اچھا استاد نہیں مل سکا ۔ ماسٹر صاحبان نہ تو وعدہ کی پابندی کرتے اور نہ درس کی طرف دھیان دیتے ۔ اس پر بھی

---

۱ ۔ احمد بک امین المتوفی ۱۹۳۶ع مشہور مصری قانون دان ۔

۲ ۔ علی پاشا مبارک (۱۸۲۳ - ۱۸۶۹ع) : سابق وزیرِ تعلیم اور خطط توفیقیہ کے مصنف ۔

میں نے بہت زیادہ صبر کیا اور بالاخر اکتا کر پڑھنا چھوڑ دیا۔

اس وقت میری شناسائی حزب الامۃ سے ہوئی جو کہ حزب وطنی اور حزب الاصلاح کی مدِمقابل تھی۔ حزب الاصلاح کی طرف سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کا نام الجریدہ تھا، اس کے چیف ایڈیٹر استاد احمد لطفی السید[1] تھے۔ ان کے کمرے میں پڑھے لکھے نوجوان موجود ہوتے، کبھی کبھی سیاسی خطبات بھی دیے جاتے جن پر بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتا جب استاد احمد لطفی السید لیکچر دے رہے تھے۔ جلسہ میں بہت سے سیاسی رہنما بھی شامل تھے۔ ان میں شیخ علی یوسف[2] اور ابراہیم الھلباوی[3] بھی موجود تھے۔ لاء کالج کے طلبہ نے ابراہیم الھلباوی کو تنگ کرنے کے لیے ایک کبوتر چھوڑ دیا کیونکہ وہ حادثہ[4] دانشوای میں انگریزوں کے وکیل تھے اور اس واقعہ کا سبب کبوتر ہی تھے۔ اس پر افرا تفری پھیل گئی۔ ڈر لگتا تھا کہ کہیں شیخ علی یوسف اور ابراہیم کو کسی قسم گزند نہ پہنچ جائے۔ پولیس بلائی گئی اور ان دونوں کو سلامتی سے نکال کر باہر لے گئی۔ استاد احمد لطفی السید کی باتوں سے سیاسی اور اجتماعی فوائد حاصل ہوئے۔ دوسرے تعلیم یافتہ حضرات کی صحبت بھی نفع سے خالی نہ رہی۔

میں مدرسۃ القضاء میں دو سال تک مدرس رہا۔ وہاں یہ مشکل پیش آئی کہ ضعفِ بصارت کی وجہ سے میں طبی معائنہ میں کامیاب

۱۔ استاد احمد لطفی السید: عالم اور ادیب۔ جامعہ[5] مصریہ کے چانسلر (المتوفی ۱۹۶۳ع)۔

۲۔ ابراہیم الھلباوی: عالمِ دین۔

۳۔ شیخ علی یوسف: المتوفی ۱۹۱۳ع، ایڈیٹر المؤید۔

نہ ہو سکا ۔ میں عارضی طور پر کام کرتا رہا ۔ رئیس شعبہ کے ایک اشارے سے میری ملازمت ختم کی جا سکتی تھی ۔ مستقل کام کرنے والے کو پنشن کا حق پہنچتا تھا اور اس کو تادیبی کمیٹی ہی ملازمت سے علیحدہ کر سکتی تھی ۔ یہ مراعات معمولی نہ تھیں ۔ میں فطری طور پر مدرسی کو قضاء پر ترجیح دیتا تھا لیکن عاطف بک کو میری مصلحت اور بہتری کا زیادہ خیال رہتا تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے قاضی لگ جاؤں کیونکہ قاضی کے لیے طبی معائنہ کی شرط نہ تھی اور وہاں میری تقرری بھی مستقل طور پر ہوگی ۔ اگر وہاں سے تبدیلی دوبارہ مدرسہ کی ہو جائے تو پھر یہاں بھی ملازمت پکی ہوگی لیکن ایک دوسری مشکل پیش آئی ۔ شرعی عدالتوں کے مدیر کا اصرار تھا کہ باہر ریگستانی علاقہ میں میری تقرری بطور قاضی کے عمل میں آئے ۔ یہ جگہ بہت دور تھی اور دو لڑکوں کے انتقال کے بعد میرے والدین میرے وہاں جانے پر رضامند نہ تھے ۔ میرے والد اور عاطف بک نے بہتیری کوشش کی کہ میرا تقرر کسی دوسری جگہ ہو جائے لیکن کامیابی نہ ہو سکی ۔ میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے سفر خرچ لیا اور ریگستانی علاقے میں جانے کی تیاری شروع کر دی ۔ میں نے وہاں تین ماہ گزارے اور معلوم نہیں کہ وہاں روزانہ ڈائری کیوں لکھتا رہا ۔ اس سے بعض واقعات لے کر یہاں نقل کرتا ہوں :

۲۳ اپریل ۱۹۱۳ع :

ریگستانی علاقے کی طرف عزم کی غرض سے اسٹیشن گیا ۔ مدرسہ کے بہت سے طلبہ اور مدرسین نے الوداع کہا ۔ پرنسپل صاحب کو دوسری جگہ جانا تھا اس لیے انھوں نے معذرت کر دی ۔ اس الوداع میں خوشی و غمی کے ملے جلے جذبات تھے ۔ میں وفاداری اور خلوص

کے ان مظاہر سے بہت خوش ہوا ۔ گاڑی حرکت میں آئی تو طلبہ ساتھ ساتھ چلنے لگے ۔ اُن کے چہروں پر غم و حزن برستا تھا ۔ مجھے اپنے والدین کی جدائی کا بہت غم تھا ۔ اسیوط تین بجے رات کو پہنچا اور پاس کے ہوٹل میں اترا ۔ صبح ہوئی تو محکمۂ شرعیہ کو ڈھونڈنے لگا ۔ یہ محکمہ بڑی عالیشان عمارت میں تھا ۔ محکمہ کے رئیس اچھی طرح سے پیش آئے اور مجھے کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ شام کو بعض رئیسوں اور اونچے گھرانے والوں سے آپ کی ملاقات کرا دی جائے گی ۔ حسبِ وعدہ ہم ہلالی کے گھر گئے ۔ پھر دوسرے گھر گئے تو وہاں اسیوط کے حاکم موجود تھے ، وہاں اور بھی بڑے بڑے لوگ تھے ۔ انہوں نے ہمارا شاندار استقبال کیا ۔ حاکم صاحب بات چیت میں مصروف ہو گئے اور لوگ خاموشی سے اُن کی باتیں سننے لگے ۔ ہر بات میں اُن کی تائید کرتے ۔ تردید کرنے کا کسی کو حوصلہ نہ تھا ۔ گفتگو کا موضوع اسیوط کے قبطیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ تھا کیونکہ قبطی مال کمانے میں زیادہ محنت کرتے تھے ۔ جمع کرنے میں زیادہ حریص اور اپنی اولاد کی تعلیم میں زیادہ کوشاں رہتے تھے ۔ انہوں نے جدید تمدن کو بھی زیادہ اختیار کر لیا تھا اور مسلمانوں کے لیے واجب اور مناسب تھا کہ اُن جیسا طرزِ عمل اختیار کریں ۔

۲۶ اپریل :

میں اسیوط میں دو دن ٹھہرا ۔ اس اثناء میں وہاں کی عمارتیں ، دوکانیں ، مساجد اور واٹر ورکس وغیرہ دیکھے ۔ رات کے تین بجے اسیوط سے سوار ہو کر واحات[1] کے اڈے پر صبح سات بجے پہنچ گیا ۔

---

۱ ۔ ریگستان میں جہاں نخلستانوں کے پاس آبادی ہو جاتی ہے اُن علاقوں کو واحات کہتے ہیں ۔ مترجم

قافلہ آہستہ آہستہ چلنے لگا ۔ آگے دیکھا تو ایک وسیع صحرا نظر آیا ۔ حدِ نظر تک ریت ہی ریت تھی ۔ کبھی کبھی ٹیلے بھی نظر آ جاتے ۔ ہم ایک علاقے سے گزرے جس کا نام غیط البطیخ تھا کیونکہ اس میں پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے ۔ ریت کا رنگ بدلتا رہتا ۔ کبھی سرخ رنگ کی ریت نظر آتی تو کبھی زرد رنگ کی ۔ تین بجے بعد دوپہر عماریق پہنچے ۔ یہاں جلاوطن رہتے تھے ۔ چار بجے خارجہ پہنچے ۔ راستہ نو گھنٹے کا تھا ۔ اگر قافلہ تیز چلے تو تین گھنٹوں میں مسافت طے ہو سکتی ہے ۔ راستہ بھر مجھے بوڑھے والدین کا خیال ، اشتیاقِ وطن اور مسافری کا غم ستاتا رہا ۔ راستہ میں ایک انگریزی فرم کا دفتر دیکھا جس نے اس علاقے کی اراضی کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا ۔ انگریز دھوپ میں کھڑے مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہے تھے ۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ انگریز ، سرد ملک سے رزق کی خاطر گرم ملکوں میں آتے ہیں اور ہنسی خوشی وقت گزارتے ہیں ۔ ایک میں ہوں جو مصر کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں آ کر گھبرا رہا ہوں حالانکہ ان دونوں شہروں میں ایک دن کی مسافت ہے ۔ اس پر میں بہت شرمندہ ہوا ۔ مجھ پر ان کی کامیابی اور اپنی ناکامی ، ان کی امارت اور اپنی غربت کے اسباب روشن ہو گئے ۔

۲۹ اپریل :

میں نائب حاکم کے ہاں دو دن مہمان ٹھہرا رہا ۔ علاقہ کا حاکم موجود نہ تھا بلکہ نائب حاکم کام چلاتا تھا ۔ میں رہائش کے لیے مکان ڈھونڈتا رہا ۔ آخر ایک مکان مل گیا جس کا کرایہ اسی قرش تھا ۔ دیواریں کچی اور چھت کھجور کے تنوں کی تھی ۔ دریچوں کو پتھر سے سہارا دیا ہوا تھا ۔ مکان بالکل سادہ تھے ۔ سمندری جانب خرما ، کشمش اور نارنگی کے دو باغ تھے ۔ جنوبی طرف صحرا پھیلا

ہوا تھا - تھوڑی سی استراحت کے بعد میں نے دروازے کے کھٹکھٹانے کی آواز سنی - نوکر نے کہا کہ ماذون صاحب تشریف لائے ہیں - میں نے اندر آنے کی اجازت دے دی - وہ داخل ہوئے تو اُن کے ساتھ دو غلام تھے - جنھوں نے ایک سینی میں گوشت اور دوسری میں کچھ چاول رکھے ہوئے تھے - کہنے لگے کہ ماذون صاحب نے ہدیہ بھیجا ہے - میں نے ادب سے معافی چاہی لیکن وہ ہدیہ اور اس کے قبول کرنے کی فضیلت میں احادیث بیان کرتے رہے - میں نے سختی سے انکار کر دیا - گھنٹے دو گھنٹے کے بعد پھر کسی نے دروازے پر دستک دی - دیکھا کہ ایک پادری کا غلام دس نارنگیاں لایا ہے - یہ اُن کی نظر میں قیمتی تحفہ تھا کیونکہ اس علاقے میں نارنگیوں کا موسم جا چکا تھا - میں نے معذرت کر دی -

۳۰ اپریل :

میں نے خارجہ دیکھا - شہر کے لوگوں کی تعداد ۸۳۸۳ تھی - اس علاقے کے بڑے بڑے شہر خارجہ ، باریس اور بولاق تھے جن کی آبادی علی الترتیب پانچ ہزار ، ڈیڑھ ہزار اور ایک ہزار چار سو کے قریب تھی - کھجور اُن کی بڑی کمائی تھی - گندم ، جو ، چاول ، کشمش ، زیتون اور تربوز کی کاشت کی جاتی تھی - گندم اور چاول کے بیج لوگوں اور جانوروں کی طرح کمزور تھے - کسان صعید سے تقاوی پر بیج لاتے تھے ، اگر وہ اپنے ہاں کی گندم کا بیج ڈالتے تو پیداوار کم ہوتی - گھر مصر کے تمام دیہاتوں کی طرح معمولی مٹی اور کھجور کی شاخوں سے بنے ہوتے - بعض بازار مسقف تھے - بعض جگہ چھت اتنی نیچی ہوتی کہ لوگوں کو جھک کر چلنا پڑتا - شام کو آدمی اور لڑکے بچھوؤں کے ڈر سے مشعلیں لے کر چلتے تھے - کئی نابینے ماشکیوں کا کام کرتے تھے - چشموں سے مشکیں بھر کر گھروں میں لاتے -

چشموں کا نظارہ قابلِ دید تھا ۔ ان چشموں سے پانی نکل کر کھیتوں کی کیاریوں میں پھیل جاتا ۔ بعض نہریں قدرتی اور مصنوعی یا چھوٹی بڑی تھیں ۔ بعض پتہ دیتیں کہ وہ رومی عہد کی یادگار ہیں ۔ لوگ گھنٹوں کے حساب سے پانی لیتے ۔ بعض ہفتہ میں دو تین گھنٹے تک اپنے کھیتوں کو پانی دیتے تھے ۔

۷ مئی :

میں نے ایک مکتب دیکھا ۔ یہ مخروطی شکل کی عمارت تھی ۔ جس میں دروازے کے سوا روشنی کے اندر جانے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا ۔ فرش سخت مٹی کا تھا ۔ میں نے مولوی صاحب کو ڈھونڈا تو انھیں غیر موجود پایا ۔ بچے پتھر کی روغنی تختیوں سے پڑھتے ۔ اُن کو مٹا کر دوبارہ لکھ لیتے ۔ میری نظر ایک بڑے لڑکے پر پڑی ۔ اُس کی تختی لے کر دیکھا تو اُس پر معوذتین لکھی ہوئی تھی اور اُس کے بعد یہ تھا : "اس قرآن کی چھپائی فلاں مطبع میں ہوئی" لڑکا اس کو قرآن سمجھ کر حفظ کر رہا تھا ۔

۹ مئی :

جمعہ کی نماز شہر کی مسجد میں ادا کی ۔ خطبہ میں زہد کی ترغیب اور گرمیوں میں یورپ جانے کی عدم ترغیب بیان کی گئی تھی ۔ حالانکہ اہلِ نخلستان طبعی طور پر نیک ہیں اور اُن کا گزارا بڑی مشکل سے چلتا ہے ۔ اُن بے چاروں نے تو کبھی یورپ کا نام بھی نہ سنا تھا اور نہ اُن کے دل میں اس قسم کا کوئی خیال گزرا تھا لیکن خطیب صاحب نے چھپا ہوا خطبہ بلا سوچے سمجھے پڑھ ڈالا ۔ اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں نمازِ جمعہ کے بعد تقریر کروں ۔ میں نے تقریر میں لوگوں کو کام کرنے پر ابھارا اور سستی کے نقصانات بیان کیے ۔ میرا یہ اعتقاد رہا کہ جب تک معاشرے کی

اصلاح نہ ہو جائے ان باتوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔

۱۰ مئی :

میں آج پہلی دفعہ مجلس قضاء میں بیٹھا ہوا کچھ ڈر سا محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں نے فقہ اور اصول فقہ کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ نظام قضاء میں ملکی اور شرعی قوانین دونوں شامل تھے ۔ ہمارے سامنے بہت سے نظائر پیش کیے گئے ۔ اس کے بعد ہم قاضیوں سے ملنے گئے اور بہت سے مقدمات سنے ۔ بہت سے مشکل مقدمات مطالعہ کیے لیکن اس کے باوجود مجھے مجلس قضاء سے ڈر لگتا تھا اور میں دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا ۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں ۔ ایک مقدمے میں ایک عورت نے اپنے غیر حاضر شوہر کے خلاف گزارے کی درخواست دی تھی ۔ سررشتہ دار میری دائیں جانب بیٹھا تھا ۔ اردلی نے مدعیہ کو آواز دی اور وہ حاضر ہو گئی ۔ مدعا علیہ غیر حاضر تھا ۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ سررشتہ دار کو کیا لکھواؤں ۔ میں نے املا سے بچنے کے لیے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا اور سررشتہ دار کو کہہ دیا کہ وہ انتظار کرے اور عدالت برخواست کر دی ۔ پھر دوسرے نظائر ڈھونڈ کر سررشتہ دار کو فیصلہ لکھا دیا ۔ اس صورت حال سے میں سخت شرمندہ ہوا ۔ سچ تو یہ ہے کہ علم اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں ۔

۱۳ مئی :

میرے دوست و استاد احمد بک امین نے ایک ظرافت آمیز اور دلچسپ خط لکھ کر بھیجا کہ لفظ "واحہ" قدیم مصری لفظ ہے جس کے معنی کفن یا مومیائی کے ہیں ۔ پھر اس لفظ کا اطلاق نیک بندوں کی قبروں پر ہونے لگا ۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ واحات خارجہ نکوکاروں اور واحات داخلہ بد روحوں کے مسکن ہیں ۔ میں نے کبھی

پڑھا تھا کہ آپ کے ہاں ایک شہر تادروہ نامی ہے جس میں تین مندر ہیں جو بطالسہ اور رومی عہد کی یادگار ہیں اور یہ عیسائیت کے ابتدائی عہد سے آن عیسائی زاہدوں کے ٹھکانے تھے جو دنیا سے منقطع ہو کر عبادت میں مصروف ہو جاتے تھے ۔ ان آثار میں ایک بڑا مقبرہ ہے جس میں سو قبریں ہیں ۔ بعض قبروں پر آج بھی خوبصورت نقش و نگار پائے جاتے ہیں ۔ اس خط سے میں بے حد متاثر ہوا اور عزم کر لیا کہ ان آثارِ قدیمہ کو اسی طرح دیکھوں گا جس طرح ہم نے قاہرہ کے اسلامی آثار دیکھے تھے ۔

۱۴ مئی :

بعض سرکاری عہدہ دار متعہ کی قسم کا نکاح کر لیتے۔کسی حسین لڑکی کو دیکھ کر شادی کر لیتے ، جب دوسری پسند آ جاتی تو پہلی کو طلاق دے کر دوسری سے شادی رچا لیتے ۔ تبادلے تک وہ اُس کے پاس رہتی ۔ اس کے بعد وہ عہدہ دار تھوڑا سا مال دے کر عورت کو راضی کر لیتا اور طلاق دے دیتا ۔ ان سے اولاد بھی ہو جاتی ۔ بعض اپنی عورت اور بچوں کو وہیں چھوڑ جاتے اور بعض ساتھ لے جاتے یا اکیلی اولاد لے جاتے لیکن اکثریت بچے پیدا کرنے سے بچتی تھی ۔ اس کے لیے بانجھ یا دودھ پلانے والی عورتیں پسند کرتے تاکہ ان سے اولاد نہ ہو ۔ میں ایسے چھ سرکاری ملازموں کو جانتا تھا جنھوں نے تین دفعہ شادی کی تھی ۔ مجھ کو بھی اس قسم کی شادی کی پیشکش ہوئی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میرے اعتقاد میں ایسی شادی مروت کے منافی تھی اور اللہ تعالٰی کی مہربانی سے میں ضبطِ نفس پر قادر تھا ۔

۲۹ مئی :

میں اُن سرکاری ملازموں کے نرغے میں تھا جو لوگوں کی

غیر حاضری میں اُن کی برائیاں کرتے تھے۔ میں اُن سے اللہ کی پناہ مانگتا تھا۔ اس کا یہ سبب تھا کہ حکومت اُن لوگوں کو ان دور دراز علاقوں میں بھیجا کرتی جن کو سزا دینا مقصود ہوتا۔ بے چارے اس علاقے کے باشندوں نے کوئی نیک حاکم نہیں دیکھا تھا۔ مجھ پر یہ قاعدہ نہیں لگ سکتا تھا۔ جب شرعی قاضیوں کو اس علاقے میں تعینات کیا جاتا تو وہ ڈاکٹری سارٹیفکیٹ پیش کر دیتے کہ اس علاقے کی آب و ہوا اُن کے مزاج کے ناموافق ہے۔ محکمۂ شرعیہ کا ڈائرکٹر ان بہانوں سے تنگ آ گیا تو اُن نئے قاضیوں کا تقرر ہونے لگا جو عمدگی صحت کا سارٹیفکیٹ پیش کر دیتے۔ یہ سرکاری ملازم جب بھی ایک جگہ جمع ہوتے تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے۔ بعض اوقات ہاتھاپائی کی بھی نوبت آ جاتی۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ ان کے قول و فعل کی موافقت نہ کروں گا اور سوائے اشد ضرورت کے اُن سے بچ کر رہوں گا۔

۲۸ مئی:

محکمہ میں کام بہت تھوڑا تھا۔ بعض بعض دن تو بالکل کام نہ ہوتا۔ بہت سے مقدمات سربراہ فیصلہ کر دیتے تھے۔ میں ہر روز صبح ساڑھے آٹھ بجے دفتر جاتا۔ وہاں ملازمت پیشہ حضرات اور دوسرے لوگ آ جاتے۔ بارہ بجے واپس آ کر کھانا کھا کر سو رہتا پھر بیدار ہو کر چھ بجے تک مطالعہ کرتا۔ اس کے بعد اپنے گھر کے سامنے بیٹھ جاتا۔ کسی آنے والے سے ملتا یا صحرا نوردی کے لیے باہر چلا جاتا۔ پھر گھر واپس آتا۔ کھانا تناول کرتا۔ دس بجے تک مطالعہ کرتا رہتا اور سو جاتا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے اُٹھ بیٹھتا۔ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد کوئی کتاب دیکھتا، اس کے بعد دفتر جانے کا وقت ہو جاتا۔ زندگی ایک جیسی بسر ہو رہی تھی۔ مجھے

منگل کے دن کا انتظار رہتا اس کے بعد دنوں میں ہفتہ کے دن کا کیونکہ منگل کا دن آنے میں دو روز رہ جاتے، اُس روز عصر کا انتظار رہتا کیونکہ اُس وقت ہر ہفتے قاہرہ سے ڈاک آتی تھی۔

۳۱ مئی:

میں نے شہر اروبیا کی سیر کی۔ میرے ساتھ ایک مقامی آدمی بھی تھا۔ وہ ایک قسم کی نباتات لینے آتا جو اردگرد کے پہاڑوں پر اُگتی تھی۔ لوگ ایک گٹھا بیس قرش میں بیچا کرتے تھے۔ یہ نباتات دوائیوں میں پڑتی تھی اور وہ شخص اس نباتات کو دساور بھیجا کرتا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اس سے کیا کماتا تھا۔ اجنبی ہمیشہ ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں اور ہم قلیل نفع پر قناعت کر لیتے ہیں۔

اس علاقے میں پسو نام کو بھی نہیں، اگرچہ موسم برسات میں مکھیاں اور مچھر بڑھ جاتے ہیں۔ پہلے ہفتے تو میں نے ایک بچھو بھی دیکھا اور اُسے مار ڈالا۔ کل شام کو گھر کے نزدیک ایک سانپ دیکھا جس کا طول پچاس سنٹی میٹر اور عرض اڑھائی سنٹی میٹر تھا۔ نوکر نے پھنکار سنی تو وہ چراغ لے آیا اور اُس کا پیچھا کر کے مار ڈالا۔ اس سے مجھے وسوسہ سا رہنے لگا اور ہر گھڑی اور ہر لمحہ بچھو اور سانپ کا ڈر لگا رہتا۔

مجھے اسلام، عربی زبان، اُس کی قوت اور اشاعت پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ان علاقوں کے رہنے والے مسلمان تھے اور اُن کی زبان عربی تھی۔

میں یہ ڈائری تین مہینے لکھتا رہا لیکن قاری کے ملال سے اس کو نظرانداز کرتا ہوں۔ وہاں مجھے کافی وقت مل جاتا تھا۔ ان تین مہینوں میں مختلف اقسام کے نو مقدمات پیش ہوئے تھے۔ میں فرصت

کے اوقات دو چیزوں میں گزارتا ، یعنی مطالعہ آثار اور کتب بینی میں - مجھے ہمیشہ آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رہی ہے لیکن میری معلومات محدود تھیں - اس شغف کا باعث اسلامی آثار سے میری محبت تھی - جب کہ میں اپنے دوست احمد امین بک[1] کے ساتھ قاہرہ کے مختلف آثار دیکھا کرتا تھا - بعض اوقات میں کسی واقف کار کو بھی ساتھ لے جاتا اور ان معلومات کو ڈائری میں درج کرتا رہتا - یہ آثارِ قدیمہ ایرانی ، مصری اور رومی عہد کی یادگار تھے - بعض مقابر مسیحیوں کے تھے جن میں ان کے جسم اور کفن تک محفوظ تھے - حنوط کی عمدگی کی وجہ سے مردوں کے سر کے بال اور ٹھوڑی تک محفوظ و سالم تھیں - بعض کے چہرے سیاہ ، پیشانی تنگ اور دانت باہر نکلے ہوئے تھے - اکثر کا چہرہ سفید اور منہ کھلا ہوا تھا -

میں نے باریس کی سیر سے بھی بہت فائدہ اٹھایا - یہ قصبہ ہے تو چھوٹا سا لیکن اس کا نام بہت بڑا ہے - مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا نام باریس کیسے پڑا - یہ خارجہ سے ۱۲ کیلومیٹر کی مسافت پر ہے - ہم نے اس سفر کے لیے پانی اور خوراک جمع کر لی اور تین اونٹ تیار کرائے - عصر سے اگلے دن تک سفر کرتے رہے - دوپہر ہوئی تو خیمہ لگا کر آرام کرنے لگے -

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ راستے میں گرمی شدید ہو گئی - ہوا بالکل بند ہو گئی تھی - ہم نے ثقیل کھانا کھایا ہوا تھا جو سفر کے لیے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا ، پھر جب ہم سوار ہوئے تو مجھ کو سخت پیاس لگی - اونٹ کی حرکت سے میرے پیٹ میں پانی

---

۱ - احمد امین المتوفی ۱۹۳۶ع : مصری قانون دان اور کئی قانونی کتابوں کے مصنف -

گڑگڑانے لگا ۔ پیاس لگتی جاتی تھی اور میں پانی پیتا جاتا تھا جب میں پیتے پیتے تنگ آ گیا تو جیب سے لیموں نکال کر اسے کاٹا اور چوسنے لگا ۔ اس سے میرا گلہ خشک پڑ گیا ، میں کچھ بے قابو سا ہونے لگا ۔ میں نے ایک ڈاکٹر کو مدد کے لیے پکارا ۔ اس نے زمزمی سے پانی نکال کر میرے حلق میں ڈالا ، اگر کچھ دیر یہی حالت رہتی تو میرا اللہ والی تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں بچ گیا ۔

راستے میں ہم نے بعض آثارِ قدیمہ اور رومی عہد کے چشمے دیکھے ۔ شام کو قصبہ میں پہنچ گئے ۔ اس کے گرد و نواح کی زمین بہت عمدہ تھی ۔ کھلے میدان تھے جن میں زراعت کے لیے پانی رواں تھا ۔ قصبے میں بے شمار بچے تھے جن کا کوئی والی وارث نہ تھا ۔ پچھلے سال میعادی بخار کی وبا نے ان کو یتیم کر دیا تھا ۔

یہ سب عربی النسل تھے ۔ ان کا لب و لہجہ بھی عربی تھا ۔ میں ان کی گفتگو کی سماعت سے لذت پاتا ۔ خصوصاً ان مستورات کے کلام سے جو اپنے خاوندوں کی شکایت لے کر آتی تھیں ۔ میاں بیوی میں کشمکش رہا کرتی اور میں یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ انھوں نے باہمی عناد کی وجہ سے پچھلے سال اپنی زمین میں کسی قسم کی کاشت نہیں کی ۔ میں نے یہاں بہت سے قیمتی آثار دیکھے اور ان سے متاثر ہوا ۔

ان لوگوں کی بعض عادات عجیب و غریب تھیں ۔ اگر کوئی بڑا آدمی مر جاتا تو اس کی بیوی عمدہ لباس پہنتی ، اگر مرنے والے کی کوئی تلوار یا بندوق ہوتی تو اس کی عورت یا کوئی قریبی رشتہ دار عورت یہ چیزیں ہاتھ میں تھام کر نوحہ کرتی اور اس طرح اپنے ہاتھ سے زخمی ہو جاتی ۔ بارہس سے واپسی پر سراب دیکھا ۔ اس سے پہلے میں نے کا ہے کو دیکھا تھا ۔ ریت کا ایک وسیع سمندر تھا جس میں

پودے یا درخت نام کو نہ تھے - ہوائیں گونج رہی تھیں جس سے مجھے خیال ہوتا کہ کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے یا باتیں کر رہا ہے - میں نے یہ گمان کیا کہ یہی سراب ہے جس کے متعلق عرب کہا کرتے تھے کہ میں نے جنوں سے یہ سنا ہے یا اس سے کلام کیا ہے -

راستہ میں نشانِ راہ ملتے - یہ چلنے والوں کے قدموں سے پیدا ہوتے تھے - جب پتھریلی زمین پر پہنچے تو یہ نشانات گم ہو گئے - خارجہ میں ایک جماعت کا حال سنا تھا جو راستہ بھول کر پیاس سے ہلاک ہو گئی تھی - ہم نے راستہ سے تھوڑا سا انحراف کیا اس کے بعد سیدھے راستہ تک پہنچ گئے -

میں فراغت میں کتب بینی کرتا - اس اثناء میں تین بہترین کتابوں کا مطالعہ کر لیا - ایک استاد نلینو[1] کی لکھی ہوئی عربوں کے علمِ ہیئت کی تاریخ تھی جو میں نے اڑے غور اور دھیان سے پڑھی - اس کتاب سے ایک مشرق فاضل کے طریقۂ بحث، صبر و استقلال، خاص اشغال اور استنباطِ نتائج کا پتہ چلتا تھا، اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس کتاب سے میں نے علمی بحث کا طریقہ سیکھا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا -

دوسری کتاب اصولِ فقہ میں شیخ خضری[2] کی تھی - طالب علمی کے زمانے میں اس کا کچھ حصہ پڑھا تھا - میں نے اس کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا - عاطف بک برکات سے بے لاگ تنقید و تبصرہ کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سیکھا تھا وہ میں اصولِ فقہ پر منطبق کرنے لگا - میں ایک ایک فصل پڑھتا - اس پر اچھی طرح سے غور

---

۱ - استاد نلتینو (Nellino) (۱۸۷۲ - ۱۹۳۸ع) ایک اطالوی مستشرق اور استاد جامعۂ مصریہ -

۲ - شیخ محمد الخضری (۱۸۷۲ - ۱۹۲۷ع) : مشہور عالم اور مؤرخ -

و خوض کرتا اور اپنے آپ سے پوچھتا کہ یہ درست ہے یا نادرست۔ اگر غلط ہے تو پھر صحیح کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہر فصل کے آخر میں اپنی رائے اور تبصرہ لکھتا جاتا۔

تیسری ادبی کتاب تھی۔ یہ دیوان الحماسہ[1] اور اس کی شرح تھی۔ میں ایک قصیدہ یا کوئی قطعہ پڑھتا، اس کے الفاظ کے لغوی معنی سمجھتا پھر دوبارہ اس کو پڑھتا۔ دیوان میں جو کچھ پسند آتا اس کو زبانی یاد کر لیتا۔

میں ان اشغال سے اطمینان و تسلی حاصل کیا کرتا تھا۔ تین ماہ کے بعد مجھے اسیوط کے محکمۂ شرعیہ کی جانب سے ایک خط ملا۔ اس میں مدرسۃ القضاء میں میری دوبارہ تبدیلی کی خبر تھی۔

——:o:——

۱۔ دیوان الحماسہ: جس کی شرح ابو ذکر خطیب تبریزی (۴۲۱ - ۵۰۲ھ) نے لکھی ہے۔

۱۴

مدرسۃ القضاء کی ملازمت

دوبارہ مدرسہ پہنچ کر میں درس و تدریس میں مشغول ہو گیا۔ میں علم الاخلاق پڑھاتا تھا۔ ساتھ ہی فقہ، تاریخ اور منطق کا بھی درس دیتا۔ میں نے دوبارہ کسی غیر ملکی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ علم الاخلاق میں میرے لیکچروں کا مصدر عاطف بک کے نوٹس (Notes) تھے جن کو انھوں نے انگریزی سے نقل کیا تھا، میں ان میں توسیع کرنا چاہتا تھا۔ جدید علوم کے اساتذہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے مدد لے کر اپنے لیکچر تیار کر لیا کرتے تھے۔ میں فرانسیسی زبان کی تحصیل میں ناکام ہو چکا تھا۔ اب انگریزی میں قسمت آزمائی کا خیال تھا۔

ایک دن مجھے احمد بک امین مل گئے۔ ہم قہوہ خانہ میں جا بیٹھے اور مختلف قسم کی باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے ایک امریکی مستشرق جس کا نام میکڈانلڈ[1] تھا، کی انگریزی کتاب (Theology of Islam) کا ذکر کیا اور بتلایا کہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ اسلام میں نظامِ حکومت، دوسرا تاریخ فقہ اسلامی اور تیسرا مذاہب اور عقائدِ اسلامیہ پر ہے۔ وہ کتاب کی تعریف اور اُس کی بعض آراء نقل کرنے لگے۔ موضوع نے میرے شوق کو برانگیختہ کیا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اسی وقت ایک

۱۔ مسٹر میکڈانلڈ: امریکی مستشرق۔

انگریزی مدرسہ میں میرے ساتھ چلیں ۔ میں نے قسم کھائی کہ انگریزی سیکھ کر اس کتاب کو اس کی اصلی زبان میں مطالعہ کروں گا ۔ ہم مدرسہ گئے ۔ ہر ہفتہ تین اسباق کا فیصلہ ہوا جن کی فیس ایک سو پچیس قرش ماہوار طے پائی ۔ میں نے انگریزی کی پہلی کتاب خرید لی اور ایک انگریز خاتون سے انگریزی پڑھنے لگا ۔ یہ خاتون مفلوک الحال تھی ۔ انگریزی جانتی تھی اور ضروری ثقافت سے بھی بہرہ‌ور تھی ۔ میں نے پڑھائی میں بڑی محنت کی ۔ گھر میں پڑھتا ، راستہ میں سبق یاد کرتا جاتا ۔ امتحان میں سپروائزر یا کھیلوں کا نگران ہوتا تو سبق کا ورد جاری رکھتا ۔ پڑھائی مشکل معلوم ہوتی تھی کیونکہ غیر منظم تھی اور میرے ساتھ کوئی دوسرا طالب علم بطور معاون نہ تھا ۔ گھر میں ہمارے کان بھی اس زبان سے ناآشنا تھے ۔ شیخ خضری کہا کرتے تھے کہ دارالعلوم کے سینکڑوں طالب علموں نے یہ تجربہ کیا ہے لیکن کسی نے زیادہ ترقی نہیں کی ۔ کامیاب وہی ہو سکا جس نے انگلستان جا کر تعلیم پائی ۔ میں نے گزارش کی کہ میں بھی یہ تجربہ کروں گا لیکن ضرور کامیاب ہوں گا ۔ دو ماہ کے بعد میں سید امیر علی[۱] کی کتاب لے آیا جس کا نام الاسلام (Islam) تھا ۔ میں نے کہا کہ میں اس موضوع سے واقف ہوں اور موضوع کی واقفیت سے کتاب آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے ۔ میں نے پہلا صفحہ پڑھا تو سمجھ میں نہ آیا ۔ میں نے تین گھنٹے صرف کر دیے ۔ انگریزی عربی لغت میں ہر لفظ دیکھتا حتٰی کہ من اور عن کے معنی بھی کمال صبر و ثبات سے تلاش کرتا ۔ اس

---

۱ ۔ سید امیر علی (المتوفی ۱۹۲۸) سابق جج کلکتہ ہائی کورٹ و پریوی کونسل و مصنف تاریخ اسلام ۔ سپرٹ آف اسلام اور محمڈن لا وغیرہ ۔

طرح ایک سال گزر گیا ۔ اس اثناء میں انگریزی کی پہلی اور دوسری کتاب ختم کر لی ۔ دوسرے سال تیسری کتاب شروع کی ۔ اس میں انگریزی ادب اور اُس کی تاریخ پر چند فصلیں تھیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ مدرسہ تاریخ ادب کی تعلیم کے لیے ناموزوں ہے ۔ میں نے دوسرے مدرسہ اور مدرس کی تلاش شروع کر دی ۔ مس پاور پچپن سال کی خاتون تھی ۔ جسم بھاری اور چہرہ گول تھا ۔ شکل سے رعب و داب ٹپکتا ۔ اچھے لباس اور زیب و زینت کی دلدادہ تھی ۔ انگریزی ، فرانسیسی اور جرمن زبانیں اچھی طرح جانتی تھی ۔ اس کی رائے قابلِ اعتماد ہوتی ۔ ٹائمز میں اُس کے مضامین کی بڑی قدر تھی ۔ اُس نے دُنیا کو کتابوں کے علاوہ حقیقت کی نظر سے بھی دیکھا تھا ۔ فرانس ، جرمنی اور امریکہ میں کئی سال گزارے تھے جس کی وجہ سے اُس کے تجربات مکمل اور ذہنی اُفق وسیع ہو گیا تھا ۔ مصر آئی تو یہاں کی آب و ہوا پسند آئی لیکن گزر اوقات کے لیے اُس کے پاس کچھ نہ تھا ۔

اُس نے ازہر کے میدان میں ایک خالی مکان لے لیا جس کے فرش فروش کو آراستہ کر کے اُسے کرایہ پر دے دیا جس سے اُس کو تیس پونڈ ماہوار کی آمدنی ہو جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ وہ مصور اور فن کار بھی تھی ۔ وہ تصویر کشی کے آلات لے کر اہرام چلی جاتی اور وہاں بیٹھ کر اُس کے خوبصورت منظر کی روغنی تصویریں بناتی رہتی ۔ ان منظروں کی تصویر کشی میں کئی مہینے لگ جاتے اور یہ تصویریں بڑی قیمت پاتیں ۔ وہ ایک وزیر کی صاحبزادیوں کو بھی ڈرائنگ اور تصویر کشی کی تعلیم دیتی تھی ۔ آخر دو پونڈ ماہوار پر وہ مجھے انگریزی پڑھانے پر آمادہ ہو گئی ۔ میرا اور اُس کا معاملہ استاد اور شاگرد کا سا نہ تھا بلکہ ماں اور بیٹے کا سا تھا جس میں تربیت

کے لحاظ سے بہت سے عیوب ہوں ۔

میں نے اُس سے انگریزی کی تیسری کتاب شروع کی ۔ میں پڑھتا جاتا ، وہ مشکل مقامات کی تشریح کرتی اور میری غلطیوں کی اصلاح کرتی جاتی ۔ پھر میں کتاب رکھ کر کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتا ۔ زیادہ گرمی کا موسم ہوتا تو میں اپنے سر پر سے پگڑی اتار دیتا لیکن وہ ہمیشہ پگڑی رکھنے کی تاکید کرتی رہتی ۔ ہم دو گھنٹوں تک بات چیت میں مصروف رہا کرتے ۔ وہ کبھی کبھار میرے فائدے کی خاطر خرچ بھی اٹھا لیتی ۔ اپنے انگریز دوستوں ، مردوں اور عورتوں کو چائے پر مدعو کرتی اور اُن سے بات چیت کرنے پر مجھے اکساتی ۔ میں ان کے لب و لہجے کو سنتا ، اس طرح میرے کان ان کی گفتگو سے آشنا ہوگئے ۔ میں ان کی آراء اور افکار کو دھیان سے سنتا اور ان کی تقلید کرتا ۔ کبھی وہ مجھے اپنی سہیلی کے پاس بھیجتی جو مریض تھی ۔ میں اس کی چارپائی سے لگ کر باتیں کیا کرتا ۔ اس طرح وہ تکلیف بھول جایا کرتی اور اسے ایک گونہ تسلی حاصل ہوتی تھی ۔ میں دیکھتا کہ وہ باتیں کرتے نہ تھکتی تھی لیکن میں باوجود اکتانے کے اس کی باتیں سنتا رہتا ۔

ہم دونوں میں تعلقات بڑھتے گئے گویا میں اُس کے خاندان کا فرد تھا ۔ وہ تعلیم کے علاوہ میرے آداب و اخلاق کی بھی نگران تھی ۔ اُس نے مجھ میں دو بڑے عیب بتائے جن کی اصلاح کی میں نے بہت کوشش کی ۔ اُس نے مجھے دو بنیادی باتیں بتلائیں جن کا ہر مناسبت کے لحاظ سے میں تکرار کیا کرتا تھا ۔

اُس نے مجھے دیکھا کہ میں ستائیس سالہ نوجوان ہوں لیکن بوڑھوں کی طرح حرکت کرتا اور متانت اور وقار سے چلتا ہوں ۔ موسیقی ، تھیئٹر وغیرہ کھیلوں سے ناآشنا ہوں ۔ درس و مطالعہ میں

سارا وقت گزارتا ہوں یا انگریزی سیکھتا ہوں ۔ اس کے ساتھ وہ مجھے افسردہ اور تنگدل بھی پاتی تھی ۔ نہ مجھے زندگی کی مسرتوں سے بہرہ ملا تھا اور نہ کسی خوشی و انبساط کا میرے دل میں گزر ہوتا تھا۔ اُس نے مجھے بتلایا کہ یاد رکھو "تم بالکل نوجوان ہو" ۔ یہ مجھے وقتاً فوقتاً یاد کراتی رہتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے دیکھا کہ نہ مجھے پھول کی خوبصورتی کا خیال ہے اور نہ کسی صورت اور فطری جمال کی طرف دھیان ہے اور نہ کسی ترکیب و ترتیب کی نزاکت کا احساس ۔ اس نے دوسری بات یہ بتلائی کہ یاد رکھو "تمھاری نگاہ فن کار ہونی چاہیے ۔" جب میں اس کے کمرہ میں داخل ہو کر پڑھنے لگتا اور کسی موضوع کے متعلق گفتگو کرتا تو وہ پوچھا کرتی کیا تم نے خوبصورت پھول بھی رکھے دیکھے ہیں جو تمھارے لیے باعثِ کشش و حیرت ہوں ۔ بس ان کے متعلق بات چیت کرو ۔ اس کو پھولوں سے عشق تھا ۔ ان کی خرید و آرائش کا بڑا اہتمام کرتی ۔ اس کو اس بات کا رنج تھا کہ میں یہ پھول دیکھ کر نہ تو متعجب ہوتا ہوں اور نہ ہی ان کی ترتیب و تنسیق پر اس کو مبارکباد دیتا ہوں ۔

ایک دن میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے پھول کی قسموں ، بنفشہ ، یاسمین اور دوسرے موجودہ پھولوں کے متعلق لیکچر دینا شروع کر دیا پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی کیا تمھاری نگاہ فن دان نہیں ہے ۔ میں نے اس بات پر تعجب کیا ۔ وہاں نئے پھول آئے ہوئے تھے ۔ پھر پوچھنے لگی کیا تم نے نئی چیز دیکھی ہے ۔ میں نے کمرہ میں نظر دوڑائی تو سوائے پھولوں کے کوئی نئی چیز نظر نہ آئی ۔ کہنے لگی کیا تم نے کمرے کو بدلا ہوا نہیں پایا ۔ میں اِس کی قدیم وضع سے تنگ آ گئی تھی اور میری آنکھ ایک ہی

منظر دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھی۔

میں چار سال اس سے پڑھتا رہا۔ اس کی دانشمندی سے بے حد فائدہ اٹھایا۔ لیکن مجھے یہ گمان نہیں کہ اسی تکرار سے کہ "میں تو ابھی جوان ہوں" کوئی فائدہ اٹھایا ہو۔

میں نے تیسری کتاب بھی ختم کر ڈالی۔ اس سے کبھی اخلاق اور کبھی علم الاجتماع کی کتابیں پڑھتا۔ آخری مرحلہ پر افلاطون[۱] کی جمہوریت کے انگریزی میں چند اسباق پڑھے۔ یہ کتاب اس کی عقل اور تجربات کی وسعت پر دال تھی۔ میں ایک فصل پڑھتا وہ اس کی تشریح کرتی اور بتلاتی جاتی کہ افلاطونی افکار کتنے بدلے ہیں اور کتنی رائیں آج تک بجنسہ قائم رہی ہیں اور کس طرح مختلف قوموں نے ان اصولوں کو جدید تمدن پر منطبق کیا ہے۔

اس کے بعد معلوم نہیں کہ اس پر کون سی افتاد پڑی۔ وہ عالمِ ارواح کے متعلق کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ مجھ سے ذکر کرتی کہ وہ ہر روز دو گھنٹے کے لیے اپنا کمرہ بند کر کے پردے لٹکا لیتی اور آنکھیں بند کر کے کسی مریض کے معالجہ میں اپنی روح مرکوز کر لیتی۔ مریض اپنے گھر ہوتا اور یہ اپنے کمرے میں۔ کوئی دوسرا تجربہ کرتی۔ اپنے خاوند کو لاسلکی اشارے سے متنبہ کرتی کہ وہ آئے یا نہ آئے۔ یہ کرے وہ نہ کرے۔ بعض دفعہ ان امور میں اس کو کامیابی بھی ہو جاتی۔ وہ اس کامیابی کو اتفاق پر نہ محمول کرتی بلکہ سمجھتی کہ اس نے اس عمل کی شرائط کو پورا کر دیا ہے۔ اگر ناکامی ہوتی تو ساز و سامان کی عدم تکمیل کو ذمہ دار

۱۔ افلاطون: یونان کا مشہور فلسفی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۴۲۷ سال قبل ہوا ہے۔

گرداتی ۔ اس کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گئی ۔ اپنی روح کو مرکوز کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ۔ میں اس کو نصیحت کرتا کہ اس عمل میں زیادہ انہاک نہ رکھے لیکن وہ ایک نہ سنتی ۔ اسے کسی بھاری کامیابی کی امید تھی ۔ . . . میں ایک دن ملنے گیا تو دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہو رہا ہے ، اعصاب بھڑکے ہوئے ہیں ۔ آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی ہیں ۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ وہ قعرالنیل کی طرف دریائے نیل میں چھلانگ لگانے کے لیے گئی تھی ۔ پھر کہنے لگی کہ اس دفعہ تو اسے خودکشی سے ڈر لگا ہے لیکن دوسری دفعہ وہ ضرور کامیاب ہوگی ۔ میں روتا ہوا اس کے پاس سے اٹھ کر دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس کو بلا لایا ۔ اس نے مجھے لیڈی کو فوراً پاگل خانے بھیجنے کا مشورہ دیا ۔ میں نے ایسا ہی کیا ۔ اس کے بعد میں کبھی کبھی اس کے پاس ہسپتال چلا جاتا ۔ اس کے پاس بیٹھتا تو وہ معقول باتیں کیا کرتی ۔ آخرکار میں نے اس سے پوچھا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے ۔ کہنے لگی ”کچھ بھی نہیں ، سوائے اس کے کہ میرا ارادہ گم ہو گیا ہے ۔ معلوم نہیں کہ کہاں چلا گیا ہے ۔“ اس کے بعد انگریزی قنصل نے اس کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کو اس کو وطن بھجوا دیا ۔ دو سال کے بعد مدرسۃ القضاء کے پتہ پر اٹلی سے مجھے خط آیا ۔ کھول کر دیکھا تو وہ مس پاور کا خط تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ صحت یاب ہو چکی ہے اور اس وقت روما میں مناظر ، فنون اور کلیساؤں کے جمال سے لطف اندوز ہو رہی ہے ۔

اس دوران میں مجھے ایک دوست نے بتلایا کہ ایک انگریز کنبہ جو میاں بیوی پر مشتمل ہے ، عربی سیکھنا چاہتا ہے ۔ میں نے ٹیوشن اس شرط پر منظور کر لی کہ وہ مجھے انگریزی پڑھائیں گے

اور میں عربی ۔

یہ خاتون بالکل نوجوان اور نہایت خوبصورت تھی ۔ آنکھوں سے نیکی ، پاکیزگی اور اعتماد برستا ۔ اپنے خاوند کے ساتھ جو مدرسہ خدیویہ میں ماسٹر تھا ، آرام کی زندگی بسر کر رہی تھی ۔ میاں بیوی ہر روز عصر کے بعد گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے تھے ۔ اپنی خالگی زندگی سے مطمئن اور خوش تھے ۔ ہفتہ میں دو دفعہ اسباق ہوتے ۔ میں ایک گھنٹہ انگریزی پڑھتا اور ایک گھنٹہ اُن کو عربی پڑھاتا ۔ میں اُن سے چارلس لیمب[1] کی حکایات شیکسپئر پڑھا کرتا تھا ۔ اُس وقت یورپ کی پہلی بڑی جنگ چھڑی ہوئی تھی ۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں نے انگریزوں پر دبی زبان سے نقد و تبصرہ کیا ۔ یہ سن کر اُس انگریز خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگی ”کیا تم میری قوم میں کیڑے نکالنا چاہتے ہو“ اس پر میں بہت شرمندہ ہوا اور اُن کے وطن کی عزت کرنے لگا ۔ میں سال بھر اُس سے یہ قصص پڑھتا رہا ۔ اُس کو بھی عربی کی شد بد ہو گئی لیکن حرف ع کا تلفظ اُس کے لیے مشکل ہوتا اور یہ کہتی کہ تمہارا ع مجھے بہت تکلیف دیتا ہے ۔ پڑھتے وقت کبھی کبھی عربی زبان پر پُر لطف نقد بھی کر دیتی تھی ۔ اس نقد کا ہمیں بالکل پتہ نہیں چلتا کیونکہ یہ ہماری مادری زبان ہے اور شیرِ مادر کے ساتھ اس کی محبت اور الفت ہم نے پی ہے ۔ ایک دن کہنے لگی کہ عربی زبان بھی غیر منطقی زبان ہے ۔ اس میں سورج کو مؤنث استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ طاقت اور عظمت والا ہے اور چاند کو مذکر اگرچہ وہ

---

۱ ۔ چارلس لیمب (Charles Lamb) : وکٹورین عہد کا مشہور مصنف اور مقالہ نویس (۱۷۷۵ ۔ ۱۸۳۴ء) جس نے شیکسپئر کے ڈراموں کا خلاصہ کہانیوں کی صورت میں لکھا ہے ۔

لطیف شے ہے ۔ مناسب تو یہی ہے کہ ہم سورج کو مذکر اور چاند کو مؤنث کہیں ۔ پھر کہتی کہ یہ عربی زبان بھی کتنی عجیب ہے ۔ تم ثلاثۃ کتب (تین کتابیں) کہتے ہو اور الف کتاب (ہزار کتابیں) کہتے ہو ۔ اس قسم کے لطائف و ظرائف ہوا کرتے ۔ اس کے بعد جنگ کا زور ہوا تو اُس کا شوہر بھرتی ہو کر کہیں باہر چلا گیا اور مجھے ان کی کوئی خبر نہ رہی ۔ اگر میں یہ مختلف مراحل طے نہ کرتا تو میں کس قسم کا انسان ہوتا ؟ میں دنیا ایک آنکھ سے دیکھتا تھا ۔ اب دونوں آنکھوں سے دیکھنے لگا ۔ پہلے میں زمانہ ماضی کے تصورات میں گھرا ہوا تھا ۔ اب ماضی و حاضر دونوں دیکھنے لگا ۔ پہلے ایک علم سے بہرہ‌ور تھا اب متعدد علوم سے متمتع تھا ۔ مجھے چیز کے ایک رنگ اور ایک ذائقہ کا پتہ تھا ۔ اب کئی رنگ اور کئی ذائقے چکھ لیے تھے ۔ اس طرح آنکھ میں موازنہ ، تنقید اور تبصرہ کی صلاحیت پیدا ہو گئی ۔ اگر یہ مراحل طے نہ کرتا تو میں رجعت پسند ادیب ہوتا ۔ الفاظ کی خالی خولی آرائش کا خیال رہتا ۔ جودت معنیٰ کی طرف دھیان بھی نہ جاتا ۔ ۔ جدید ادباء کو چھوڑ کر قدیم ادباء پر اعتماد رہتا ۔ زمانۂ حاضرہ کے مفکروں کو نظرانداز کر کے قدیم مفکروں کی طرف ملتفت رہتا ۔ بغیر کسی تمحیص اور نقد کے تصنیف و تالیف میں لگا رہتا ۔ میں ترجمہ ، تالیف ، انشاء میں ان جدید افکار کا مرہونِ منت ہوں ۔ یہ نئے پھول ہیں جن میں پرانے پھول ملا کر گلدستہ تیار کیا گیا ہے ۔

—— :o: ——

۱۵

لجنۃ التالیف و الترجمہ و النشر

یہ مرحلہ ایک قسم کی تکمیل تھا - ۱۹۱۴ع میں بہت سے ذہین طالب علم مدرسۃ القضاء سے فراغت پا چکے تھے - مزید تعلیم کے لیے اُن کو انگلستان بھیجنے کا خیال تھا لیکن جنگ کی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی - ان میں سے بعض علمی اور بعض ادبی قسم کے ذوق سے تعلق رکھتے تھے[1] - خوش قسمتی سے مجھے اُن کی دوستی کے مواقع نصیب ہوئے - وہ بجائے محض قدیم ثقافت کے جدید و قدیم ثقافتوں سے بہرہور تھے - کسی نے جغرافیہ ، تاریخ اور انگریزی ادب میں مہارت پیدا کی تھی تو کسی نے حساب ، فزکس اور کیمسٹری میں - وہ مجھ سے زیادہ جدید تمدن کے شناسا تھے - ہم ایک قہوہ خانہ میں آ بیٹھتے جس کے نیچے میدانِ عابدین ہے - اس قہوہ خانہ کا مالک لغوی اور شاعر تھا - وہ کسی نادر حکم کے متعلق اپنی رائے پیش کرتا کہ یہ غلط ہے کیونکہ کسی لغت میں اس کا ذکر نہیں آیا - یا ہمیں کوئی قصیدہ سناتا اور ہم سے داد و تحسین کا طالب ہوتا - بہرحال یہاں تمام دوست بعد نمازِ عصر اکٹھے ہوتے اور مختلف قسم کی باتیں ہوتیں -

---

۱ - ان میں استاد احمد زکی ، ڈاکٹر احمد عبدالسلام کردانی - استاد محمد عبدالواحد خلاف ، استاد محمد کامل سلیم ، استاد محمد فرید ابو حدید اور استاد محمد احمد الغمرادی شامل تھے -

ایک صاحب انگریزی افسانوں اور انگریزی رسائل کے دلدادہ تھے ۔ انتخاب میں حسنِ ذوق رکھتے تھے ۔ جو کچھ کہتے پورے زور اور قوت کے ساتھ کہتے ۔ اُن کو یہ پسند تھا کہ کوئی صرف ان کی بات سن لے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سننا بھی ایک قسم کا فن ہے ، جیسا گوش گزار کرنا ۔ سننے کا فن اُسی کو آتا ہے جو کہنے والے کے شعور ، جذبات اور انفعالات کا ساتھ دے ۔ ہنسنے والی بات پر ہنسے اور رونے والی بات پر رو دے اور اس کے چہرے وغیرہ کی علامات اس کے احساسات اور جذبات کی مظہر ہوں ۔ اس کا اعتقاد تھا کہ مجھے سننے کا فن خوب آتا ہے ۔ للہذا وہ مجھ سے زیادہ گفتگو کرتا ۔ مثال کے طور پر کہتا کہ میں نے مجلہ (نیشن) Nation میں ایک کہانی پڑھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بچے کی پرورش ایک محل میں ہوئی جس کے اردگرد وسیع باغ تھا ۔ وہ باہر کی دنیا سے بالکل ناواقف تھا ۔ جوان ہونے پر جبکہ اُس کی عقل پختہ ہو چکی تھی ، اُس نے دفعۃً بیرونی دنیا دیکھی ۔ اگر وہ اس دنیا کو تدریجاً دیکھتا تو بچپن میں اس کا اثر کتنا مختلف ہوتا وغیرہ وغیرہ ۔ آج میں نے ڈکنز[۱] کی ایک پر لطف کہانی پڑھی ہے ، جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں ۔ یا آج میں نے ایک فکاہی رسالہ پڑھا ہے ، برخلاف مصریوں کے انگریز طبعی طور پر ظریف ہوتے ہیں ۔ اُن کی ظرافت زیادہ تر مخفی اور عقل پر مبنی ہوتی ہے ۔ یہ لوگ الفاظ سے نہیں کھیلتے ۔ پھر انھوں نے جو کچھ پڑھا ہوتا وہ سناتے ۔ ہم اس کی باتیں سن کر خوب ہنستے اور بعد میں اُس پر نقد و احتساب بھی کرتے ۔ اُن کی

---

۱ - چارلس ڈکنز : (۱۸۱۲ - ۱۸۷۰ء) عہدِ وکٹوریہ کا مشہور ناول نویس -

باتیں ہلکی پھلکی ہوتیں ۔ ہم ان کے لطائف و ظرائف سے خوب لطف اندوز ہوتے ۔ یہ دوست کبھی اپنے عشق و عاشقی کی داستانیں بھی سنایا کرتے ۔

ایک دوسرے دوست علم تاریخ کے جان دادہ تھے ۔ اُنھوں نے اس کا خوب مطالعہ کیا تھا ۔ وہ یورپی اسلوب بیان ، دقت تحلیل پر اُن کی قدرت ، جزئیات سے کلیات کا استنباط ، بڑے آدمیوں پر نقد و جرح کرنے میں آزادی اور شخصیت پرستی سے عدم اعتناء کے بے حد مداح تھے ۔ اُن کے بیان کے مطابق یوروپین مؤرخوں میں سے کوئی تو کسی کی مسلمہ بہادری غارت کر دیتا اور کوئی کسی گمنام کو شہرت کے پر لگا دیتا ۔ کوئی مؤرخ عربوں کے علم التاریخ پر نقد کرتا کہ عربوں نے واقعات تو خوب بیان کئے ہیں مگر اُن کا فلسفہ بیان نہیں کیا سوائے ابن خلدون[1] کے ، لیکن وہ بھی فلسفے کو واقعات پر تطبیق نہیں کر سکا ۔ پھر یہ دوست واقعات کو منطبق کرنے کے لیے مثال کے طور پر حضرت عمر اور حضرت علی[۴] پر اپنی بحث پیش کرتا جس میں تعریف اور تنقید دونوں ہوا کرتیں ۔

ایک دوست علوم طبیعی اور کیمیا میں ماہرانہ درک رکھتے تھے ان علوم کی خشک سنجیدگی دور کرنے کے لیے وہ علم ادب کی پناہ لیتے ۔ ابو الطیب[2] اور ابو فراس[3] کا دیوان پڑھ کر اچھے شعر چن لیتے اور یاد کر کے سناتے ۔ اُن کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا تو شعر کہنے کی کوشش کرتے شاداں اور فرحاں رہتے ۔ آدمی اُن

---

۱ ۔ عبدالرحمان ابن خلدون : المتوفی ۱۶۸ھ مشہور عرب مؤرخ اور فلسفۂ تاریخ کا موجد ۔

۲ ۔ ابوالطیب متنبی : (۳۰۲ - ۳۵۴ھ) عربی کا مشہور شاعر ۔

۳ ۔ ابو فراس حمدانی : (المتوفی ۳۵۶ھ) عربی کا نازک خیال شاعر ۔

کے قرب سے مانوس اور دوری سے متوحش رہتا۔ جو بات کرتے دل کی گہرائی سے کرتے۔

ایک صاحب طبیعی اور کیمیاوی علوم کے فاضل تھے۔ اُنھوں نے اپنے علم و فن کو دین کی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ مدرسۃ العالیہ کے بہت سے لڑکے اُن سے متاثر ہو کر دیندار بن چکے تھے۔ اُن سے مسجدیں آباد ہو گئی تھیں۔ کلام پاک حفظ کر کے انھوں نے اُس کے فہم و تدبر میں بے حد کوشش کی تھی۔ مفسرین کے اقوال کے علاوہ وہ علمائے سائنس اور دوسرے یورپی فاضلوں کے اقوال سے بھی واقف تھے۔ مذہبی بات چیت اور گمراہوں کی ہدایت میں لذت پاتے۔ انھیں الحاد کا حکم سننا ناگوار تھا۔ کسی کو اُمور دین میں کیڑے نہ نکالنے دیتے اس کے علاوہ وہ مخلص تھے۔ منہ سے وہی بات نکالتے جس کی تائید اُن کا دل کرتا۔ مناظرہ بازی میں ماہر تھے۔ لکھتے تو اسلوب بیان رقت آمیز ہوتا۔ کیمیا اور طبیعۃ کا درس دین کی خاطر دیتے۔ کسی کیمیاوی نظریہ کی شرح کر کے اس کو اللہ تعالیٰ کی تکوینی سنت ثابت کر دیتے۔ اگر کوئی ان کے دینی شعور و احساس کو مجروح کرتا تو وہ اس کی محبت سے گریزاں رہتے۔ لوگ میرے عمامے سے زیادہ اُن کی ٹوپی سے ڈرا کرتے تھے۔

یہ علم الحساب کے استاد تھے۔ ان کی ادبی سوجھ کسی ادیب سے کم نہ تھی۔ اُنھوں نے کتاب الاغانی' اور عقدالفرید' کا اس طرح مطالعہ کیا تھا، جس طرح میں ان کتابوں کو پڑھ کر حظ اُٹھاتا ہوں۔ علم الاخلاق والاجتماع اور علم النفس کی بے شمار

۱، ۲ ۔ کتاب الاغانی اور عقدالفرید: عربی زبان کی زندہ جاوید کتابیں ہیں۔

کتابیں مطالعہ کر چکے تھے اور ان سے بے حد متاثر تھے۔ جو پڑھتے اس کا خلاصہ مجھے سناتے جو دیکھتے اور سنتے اُس پر لطیف انداز میں نقد و تبصرہ کرتے اور مطالعہ کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے۔ آج جو کچھ کہتے کل اس کی تردید بھی کرتے۔

یہ تمام اصحاب میرے لیے ایک قسم کا مفید اور لطیف مدرسہ تھے۔ اس مدرسہ میں خشک سنجیدگی، درس و تدریس کا بوجھ، زمان و مکان کی قید، امتحانات اور گھنٹہ بجنے کا سوال نہ تھا۔ اس میں سنجیدگی، مزاح، علم و ادب، دین، شعر و شاعری اور تقریظ و تنقید کا زور شور تھا۔ اس میں شاگرد استاد اور استاد شاگرد تھا۔ اس میں ہر بات کہنے اور سننے کی آزادی تھی۔ استاد اور شاگرد ایک دوسرے سے ملتے تو اُن کے احساسات، جذبات، اُمیدیں اور خواہشیں ہم رنگ ہو جاتیں۔

اس مدرسے میں دماغی ریاضت کے علاوہ بدنی ریاضت کا بھی اہتمام تھا۔ ہم دن مدرسہ میں، شام قہوہ خانہ میں اور رات مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ صاف اور کھلی ہوا، فطرت کا جمال، سیر و سفر اور بدنی رباضت کا پتہ نہ تھا۔ یہ چیزیں دل میں انبساط اور سرور پیدا کرتی ہیں۔ عقل اور جسم کی پرورش کرتی اور روح اور بدن کو غذا پہنچاتی ہیں۔

اس کے بعد ہم ایک جگہ اکٹھے ہو کر ورزشی کھیل کھیلتے۔ ہر ہفتہ سیر و تفریح کے لیے باہر چلے جاتے۔ وہ جو مجھے کسی نے انگریزی پڑھتے وقت کہہ دیا تھا کہ "یاد رکھنا تم جوان ہو" ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ ہم ورزشی کھیل کھیلنے کے لیے جزیزہ چلے جاتے۔ میں اپنے عمامہ سمیت شریک ہوتا۔ میرا عمامہ پہلا اور آخری تھا جو اس قسم کے کھیلوں میں شامل ہوا تھا۔ کھیل کے لیے ہر

قسم کے ساز و سامان یعنی بنیان قمیص اور بوٹ وغیرہ سے مسلح ہو کر جاتا ۔ عمامہ ، جبہ اور قفطان وغیرہ اتار کر نیکر اور بنیان پہن لیتا اور فٹ بال کھیلتا ۔ ہم کھیلتے کھیلتے تھک جاتے تو گھاس پر بیٹھ کر باتیں اور دل لگی کیا کرتے ۔ دوڑتے ہوئے میرا سانس پھول جاتا اور دل دھڑکنے لگتا لیکن آہستہ آہستہ میری حالت سنبھلتی گئی لیکن پھر بھی میں اپنے ساتھیوں کی طرح تیز نہ چل سکتا تھا شاید اس میں میری تربیت کو بھی دخل ہو ۔ کھیل سے فارغ ہو کر ہم اپنے اصلی کپڑے پہن لیتے ۔

سردی کا موسم ہوتا تو ہم جبل المقطم کی طرف سیر کرنے نکل جاتے ۔ کبھی کسی جنگل کی طرف یا وادی حلوان کی طرف چلے جاتے ۔ یہ سفر نہایت دشوار ہوتے ۔ ہمارا رہنا بھی متشدد تھا ۔ ہم کھانا وانا لے کر وادیوں اور پہاڑیوں میں گھومتے ، سورج کے طلوع اور غروب کو دیکھتے پھر ہار تھک کر گھروں کو واپس آ جاتے اور گھوڑے بیچ کر سو رہتے ۔ لیکن میں اس سیر کے تین چار دن بعد تک لنگڑا کر چلتے رہنے کے باوجود دل و دماغ میں تازگی محسوس کرتا اگرچہ میں کھیلوں میں پیچھے رہ جایا کرتا تھا ۔ مجھے سیر کا ایک دن تو آج بھی یاد ہے ۔ ہم وادی جوف گئے تھے ۔ میری جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا تو میں نے اس کی جگہ ایک کاغذ باندھ لیا تھا جس میں ہم مٹھائی وغیرہ لائے تھے لیکن اس سے کام نہ چلا اور میں ننگے پاؤں چلنے لگا جس سے پاؤں کے انگوٹھے زخمی ہو کر لہولہان ہو گئے میرے ساتھی آگے نکل گئے تھے میں نے ایک گدھے والے سے سودا کیا کہ وہ مجھے منہ مانگی اجرت لے کر اسٹیشن تک پہنچا دے ۔ جب میں گدھے پر سوار ہو کر حلوان پہنچا تو میرے ساتھی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ

ہو گئے۔

میں گانا سننے اور تھیٹر دیکھنے کے لیے منیرة المهدیہ کے تھیٹر میں بھی چلا جاتا تھا۔ بعض نغمات تو مجھے بے حد متاثر کرتے تھے اور ہفتوں تک اُن کی گونج کانوں میں رہتی تھی۔ بعد میں میرے دوست میری اطلاع کے بغیر گانا سننے چلے جاتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ وہ مجھے اس کی خبر نہ کریں کیونکہ میں ان مواقعات کے لائق نہ تھا۔

ہماری منڈلی میں تین فاضل[1]، لا کالج کے پڑھے ہوئے بھی شامل تھے، اُن کی تعلیم سراسر قانونی اور سیاسی تھی۔ یہ جماعت حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھی۔ ہمارا ملک تو زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے تھا اور ہم کو اس کی لو لگی رہتی کہ کس طرح اس کو ترقی دے کر بام رفعت تک پہنچائیں۔ ہم نے ایک مجلس قائم کی جس کا کام مختلف جہتوں سے مصر کا مطالعہ کرنا تھا۔ اس کی تین کمیٹیاں بنائی گئیں ایک کے ذمے اقتصادیات دوسری کے ذمے سیاست اور تیسری کے ذمے تعلیم و تربیت کا کام تھا۔ ہر کمیٹی ماہر ڈاکٹر کی طرح مرض کی تشخیص کرتی اور علاج بتلاتی۔ اس کے بعد مجلس اپنے کام میں لگ جاتی۔ انقلاب زمانہ سے دوسری کمیٹیاں تو کالعدم ہوگئیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لجنة التالیف و الترجمہ والنشر باقی رہ گئی۔ ایک ممبر نے جو وکیل بھی تھا اس کا اساسی قانون بنایا اور تمام ممبروں کو پڑھ کر سنایا۔ بحث و تمحیص کے بعد اس کو منظور کر لیا گیا اور قرار پایا کہ ہر

۱۔ یہ دوست استاد حسن مختار رسمی اور مرحومین یوسف الجندی بک اور صبری ابوعلم بک تھے۔

ممبر ہر ماہ دس قرش بطور چندہ دیا کرے اور اس کمیٹی کی انتظامیہ کا کسی ممبر کے گھر جلسہ ہوا کرے۔ بعض علمی ممبروں نے مدارس ثانویہ کے طلباء کے لیے علم کیمیا پر ایک کتاب لکھی تھی۔ کتاب کا ہر باب پڑھ کر سنایا جاتا اور دوسرے سنتے رہتے۔ کانٹ چھانٹ کے بعد اس کو چھپنے کے لیے بھیج دیا جاتا، اگر ہمارا چندہ ناکافی ہوتا تو کتاب چھاپنے کے لیے بعض امیر ممبروں سے ادھار بھی لے لیتے۔ اس طرح لجنة التالیف کی بنیاد پڑی۔

لجنة التالیف کی تاسیس ۱۹۱۴ء میں ہوئی تھی اور اب ۱۹۵۳ء ہے اس واقعے کو ۳۶ سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ اس اثناء میں دو سو سے زیادہ کتابیں چھاپی جا چکی ہیں۔ کتاب شائع کرنے کی منظوری اسی وقت دی جاتی ہے جب کہ متعلقہ علوم کے دو ماہر اساتذہ اس کتاب کی خوبی اور عمدگی کی تصدیق کر دیں میں یوم تاسیس سے اب تک مجلس کا صدر چلا آ رہا ہوں۔ اسی سے زیادہ اس کے ممبر ہیں جو بہترین تعلیم یافتہ ہیں۔ مجلس کے ممبروں میں محبت کا رابطہ استوار ہوتا گیا حتی کہ لوگ ان کو فری میسنوں سے تشبیہ دینے لگے۔ ہر ممبر امکان بھر مجلس کی حوصلہ افزائی کرتا۔ مجلس کا اپنا مطبع تھا پھر اس کا ایک ماہوار رسالہ بھی نکلنے لگا جس کا نام ''الثقافة'' تھا جو مجلس کے افکار کا ترجمان تھا۔ یہ رسالہ چودہ ماہ چھپتا رہا پھر خسارے کی وجہ سے اس سال ۱۹۵۳ء میں بند ہو گیا۔ رسالے کے بند ہونے سے مجلس کے ممبروں اور رسالے کے قارئین کو بہت افسوس ہوا لیکن مالی خسارے کے مقابلے میں اس افسوس کی حقیقت کیا ہے۔

مجلس کی سالانہ آمدنی دس قرش سے بڑھ کر ساٹھ ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ اس میں کتابوں پر منافع بھی شامل تھا۔ میں نے

مجلس کی خدمت میں اپنی عمر کا معتد بہ حصہ گذارا ہے ۔ میں ہر روز مجلس کے کام کی نگرانی کرنے جاتا ۔ اس کی ڈاک دیکھتا اور بعض معاملات میں مشورہ دیتا ۔ علالت کے بعد یہ تعلق قائم نہ رہ سکا ۔ مجلس کا دفتر ایک ممبر کے گھر میں تھا پھر ایک معمولی سا مکان کرایہ پر لے لیا گیا اس کے بعد ایک اچھے علاقے میں بیس ہزار پونڈ میں بڑا مکان خرید لیا گیا جب مجلس اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی تو حکومت نے ۹ سو پونڈ سالانہ کی امداد منظور کی ۔ ہم نے مجلس کے لیے ایک خاص دفتر لے لیا اور کتابیں شائع کیں ۔ ان کتابوں پر جو لاگت آتی تھی تقریباً وہی وصول کی جاتی تھی ۔ حکومت صرف آمدنی و خرچ کی پڑتال کرتی تھی ۔ مختصر طور پر یہ مجلس میرے لیے ایک قسم کا مشغلہ تھی ۔ اس بارے میں میں اپنی اولاد کی طرح اپنی ذات کا محاسبہ کرتا اور اس کے معاملات کی تنظیم میں مجلس کے انتظامی ممبروں سے مدد حاصل کرتا ۔ اس توفیق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں ۔

بہر حال یہ مجلس تھی اُن اصحاب کی دوستی کا ثمر جس کا میں نے ذکر کیا ہے ۔

میں نے محسوس کیا کہ میں ان کی عقل ، مزاج اور ثقافت سے زیادہ قریب اور اپنے قدیم دوستوں سے دور ہوں چونکہ مجھے مختلف علوم کی کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا اس لیے علم الاخلاق اور منطق میں اسباق مرتب کرنے کے لیے عربی اور انگریزی کتب سے استفادہ کرتا اور فرصت کے وقت دونوں زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اس سے نظر و خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ۔

—:o:—

۱٦

قاہرہ کے کتب فروش

میں نے جو کچھ انگریزی پڑھی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کتابیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ یہ کتابیں میں دو کتب فروشوں سے خریدتا۔ انگریزی کتابوں کی دوکان غربی سڑک پر یورپین محلہ میں تھی اور عربی کتابیں ایک نئے بازار سے ملتیں جس کا مالک عجیب و غریب اطوار کا تھا۔ اس کا وطن اناطولیہ تھا۔ ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی۔ فرانسیسی مدارس میں تعلیم پانے کی وجہ سے وہ فرانسیسی زبان میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ایک صدمے کی وجہ سے وہ فلسفۂ تشاؤمیہ کا معتقد ہو گیا تھا۔ بروصہ[1] میں روئی کی تجارت بھی کی تھی لیکن نقصان اٹھایا تھا۔ سبزی کی دوکان کھولی مگر یہ بھی نہ چل سکی پھر ہر قسم کے غم و فکر سے آزاد ہو کر کتب فروشی کرنے لگا۔ کتابوں کے شوقین اس کی دوکان پر آتے۔ مطمئن ہو کر گپیں ہانکتے، قہوہ اور سگریٹ پیتے اور گھڑی دو گھڑی گذارتے اور کبھی کبھی کوئی کتاب بھی خرید لیتے۔ کتابیں بغیر ترتیب کے پڑی رہتیں مثلاً نحو کی کتاب تاریخ کی کتاب کے ساتھ پڑی رہتی۔ یہ دوکاندار صرف تخمینہ سے کتاب کی جگہ پہچان لیتا۔ کوئی آ کر کسی کتاب کے متعلق پوچھتا تو وہ سیڑھی پر چڑھ کر دائیں بائیں

۱۔ بروصہ: ترکی کا ایک شہر جو اون کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔

دیکھتا پھر گاہک کو دو تین دن کے بعد آنے کو کہتا ۔ طول ممارست کی وجہ سے وہ گاہکوں کو بھی پہچان لیتا تھا ۔ ایک دن ایک ازہری شیخ اس سے کتاب خریدنے آئے ، اس نے جواب دے دیا ۔ میں نے دوکاندار کو ملامت کی تو وہ خریدار کے پیچھے دوڑا اور اس کو دوکان پر لا کر کتاب دکھلا دی ۔ شیخ صاحب قیمت میں ٹال مٹول کرنے لگے اور آخر کار کتاب خرید کیے بغیر چل دیے ۔ دوکاندار میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا " کیوں میں نے سچ کہا تھا یا جھوٹ"!

اس کو کتابوں کے موضوعات اور قیمتوں کی آگاہی تھی ۔ اس میں ایک خوبی تھی ، وہ یہ کہ یورپ کے مشرق فاضلوں نے جو عربی کتابیں چھپوائی تھیں ان کے بارے میں اسے پوری واقفیت تھی ۔ چونکہ وہ فرانسیسی زبان سے واقف تھا اس لیے باہر سے کتابیں آسانی سے منگوا لیا کرتا ۔ ان کتابوں کے ناشر اس کے معاملے کی صداقت کی وجہ سے اس پر اعتماد بھی کر لیا کرتے تھے ۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہر ایک کے ذوق اور پسند کو جانتا تھا ۔ کوئی کتاب بکنے کو آتی تو اس کے لیے رکھ چھوڑتا جس کے متعلق اسے گمان ہوتا کہ وہ اس کے لیے کار آمد ہوگی ۔ اس کی ایک عادت عجیب و غریب تھی ۔ وہ مستحق اور صاحب ذوق کو ایک پونڈ میں کتاب دے دیتا اور غیر مستحق کو دو پونڈ میں بھی نہ دیتا ۔ لوگوں کے نزدیک وہ زندیق تھا کیونکہ وہ اولیائے کرام اور ان کے مزاروں کی زیارت کا منکر تھا ، وہ یہ عقیدہ علی الاعلان ظاہر کیا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ گاڑی میں سفر کر رہا تھا ۔ اس کے ڈبے میں اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔ جب گاڑی طنطا

پہنچی تو ایک شخص نے کہا کہ سید بدوی[1] پر فاتحہ پڑھنی چاہیے اس کتب فروش نے چلا کر کہا "کون سید بدوی"؟ اس کی کرامات کیا ہیں۔ لوگوں نے اس کو زبان درازی کی وجہ سے خوب پیٹا اور اس نے ان لوگوں سے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا۔ وہ معاملات میں سچا اور درویش صفت انسان تھا۔ تنگدستی کی وجہ سے وہ سوٹ کے بجائے جلباب پہنتا۔ تغیر حال سے اس کو اپنے خاندان کی پروا نہ تھی۔

مجھے ایک عجیب و غریب واقعہ آج بھی یاد آتا ہے، بعض دنیاوی واقعات بغیر کسی انتظار یا سابقہ مقدمات کے رونما ہوتے ہیں اور عین خوشی کی گھڑیوں میں موت آ پہنچتی ہے۔ میرے پاس کتاب نفح الطیب[2] تھی، نہایت ردی چھپی ہوئی۔ مجھے اس کے سرکاری ایڈیشن کی تلاش تھی۔ میں نے اس کتب فروش کے ہاں اس کا ایک عمدہ اور مجلد نسخہ دیکھا، اس کی چاروں جلدیں خرید کر بائیں بغل میں دابیں، اخبار المؤید دائیں طرف تھا اور گھوڑا گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گاڑی سیدنا الحسین سے عتبہ الخضرا تک چلتی تھی۔ گاڑی آئی تو بالکل بھری ہوئی۔ میں سوار تو ہو گیا لیکن کسان اترتے اور چڑھتے رہے۔ میں نے پاؤں اٹھایا تو وہ ایک خاتون سے چھو گیا جو برقع لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چیخ کر مجھ پر گالیوں کی بارش برسا دی۔ میں نے اخبار اس کے منہ پر دے مارا اور اسے خاموش ہو جانے کو کہا لیکن وہ پھر چیخنے اور چلانے لگی جس کی وجہ سے لوگوں کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور پوچھنے لگے کہ

۱۔ سید بدوی کا مصر کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے۔
۲۔ نفح الطیب: اندلس کی علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ جس کے مصنف ابوالعباس احمد بن محمد المقری (المتوفی ۱۰۴۰ھ) ہیں۔

کیا بات ہوئی ۔ پولیس بلائی گئی اور ہم دونوں کے بیانات تھانہ میں پہنچ کر لیے گئے ۔ پولیس کے ایک افسر نے مجھے معذرت کرنے اور اسے معذرت قبول کرنے کو کہا مگر وہ نہ مانی ۔ ناچار اس نے ہم دونوں کے بیانات قلمبند کر لیے ۔ اس نے پولیس کے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے اصرار کیا کیونکہ اس ضرب سے اس کی ناک پر خراش آ گئی تھی ۔ پھر وہ چلی گئی ۔ میں اس واقعہ سے نہایت مضطرب ، پریشان اور شرمندہ تھا کیونکہ مجھے تو کبھی تھانے میں جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا ، چہ جائیکہ ایک عورت تھانے میں میری شکایت لے کر جائے ۔ میں کتابوں اور نفح الطیب پر لعنت بھیجنے لگا جس کی وجہ سے میں گرفتارِ بلا ہوا ۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں ۔ مجھے نوٹس وصول ہوا کہ میں نے ایک خاتون پر حملہ کر کے اس کو مجروح کر دیا ہے ، ڈاکٹر نے اس کے علاج کے لیے ایک دن کی میعاد مقرر کی ہے اور اس واقعہ کو سنگین جرم سمجھا گیا ہے ۔ اس رات مجھے بالکل نیند نہ آئی ۔ صبح ہوئی تو میں اپنے دوست احمد بک امین کے پاس گیا اور سارا واقعہ کہہ سنایا ۔ کہنے لگے کہ اب تو معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے اور پولیس میں رپورٹ درج ہو چکی ہے ۔ اس کا فیصلہ تو قاضی کرے گا ۔

اس سے میرا دن کا چین اور رات کا آرام جاتا رہا ۔ آخرکار میں نوٹس لے کر عاطف بک[1] کے پاس گیا اور انھیں سارا ماجرا سنایا ۔ وہ خوب ہنسے اور مجھے وزارتِ انصاف کے وکیل فتحی پاشا کے پاس لے گئے ۔ بالآخر ان کی کوشش سے یہ جھگڑا رفع دفع ہوا ۔ عورتیں جب انتقام پر اتر آتی ہیں تو مردوں کا خدا حافظ ہے ۔

---

۱ ۔ عاطف بک : پرنسپل مدرسۃ القضاء الشرعی ۔

انگریزی کتابوں کی دوکان خوب آراستہ پیراستہ تھی ۔ مالک کا نام استاد فرج تھا ۔ ہم یہاں آ بیٹھتے ، قہوہ یا سگریٹ پینے کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ صرف کتابیں فروخت کی جاتیں اور قیمت وصول کی جاتی ۔ تمام کتابیں اپنی اپنی جگہوں پر رکھی رہتیں ۔ افسانہ کی جگہ افسانہ ، علم الاجتماع کی جگہ علم الاجتماع کی کتابیں اور علم النفس کی جگہ اس کے مضمون کی کتابیں رکھی رہتی تھیں ۔ جب کوئی کتاب مانگتا تو وہ دائیں بائیں دیکھ کر کتاب نکال کر دے دیتا ۔ جب سے مجھے انگریزی کی شد بد ہوئی تھی ، مجھے تو کتابوں کی اس دوکان سے عشق تھا ۔ یہاں آ کر بڑی دیر تک کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا اور پسند آنے پر خرید لیتا ۔ اس سے میری انگریزی لائبریری کی بنیاد پڑی ۔ مجھے زیادہ تر علم الاخلاق علم الاجتماع اور فلسفے کی کتابوں کا شوق تھا ۔ یہ شوق مس ہاور کے افلاطون کی جمہوریہ پڑھنے سے پڑا تھا ۔ اسلامیات پر مستشرقوں نے جو کچھ لکھا تھا ۔ اُس کو بھی شوق سے خریدتا ۔

میں انگریزی اور عربی دونوں زبانوں کی مدد سے اپنے لیکچر تیار کرتا تھا ۔ یونانیوں ، رومیوں اور عربوں کے علم الاخلاق کے متعلق خطبات اکثر انگریزی کتابوں کی مدد سے تیار کیے تھے ۔ ڈارون[1] کے نظریہ ارتقاء سے ایک عرصہ تک شغف رہا ۔ اس کی کتابوں کا ایک صاحب شمیل نے عربی میں ترجمہ کیا تھا ۔ یہ خطبات میں نے مدرسۃ القضاء میں اساتذہ اور دیگر حاضرین کے سامنے دیے تھے ۔ ایک خطبہ نظریہ ارتقا کے معنی میں اور دوسرا اخلاق کی تطبیق پر تھا

---

۱ ۔ ڈارون : (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲ع) مشہور مفکر اور فلسفہ دان اور نظریہ ارتقاء کا موجد ۔

جس کے مدعی سپنسر[1] وغیرہ تھے ۔ ان خطبات کی وجہ سے عام ہیجان سا پھیل گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شیخ ازہر (مرحوم شیخ ابوالفضل) نے پرنسپل صاحب کو لکھ بھیجا کہ زندیق ڈارون[2] کے مذہب پر کیوں تقریریں کی جاتی ہیں ۔ پرنسپل صاحب خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا ۔ اس انگریزی دوکان میں ایک چھوٹی سی کتاب دیکھی یہ رابو پورٹ کی تصنیف تھی جس کا نام مبادی الفلسفہ تھا ۔ میں نے یہ کتاب پڑھی تو اس کی جامعیت اور آسان طرزِ بیان بے حد پسند آیا ۔ یہ کتاب مصنف نے مدارسِ ثانویہ کے لیے لکھی تھی ۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا ۔ بعض مقامات سمجھ میں نہ آتے تو میں اپنے دوست استاد امین موسیٰ قندیل سے رجوع کرتا ، چونکہ مجھے اس سے قبل ترجمہ کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا ۔ لہٰذا خوب محنت کرتا ۔ یہ میری سب سے پہلی ادبی کاوش تھی ۔ یہ ۱۹۱۸ع کا واقعہ ہے ۔ علم الاخلاق میں جو یادداشتیں تیار کی تھیں اُن کو گھٹا بڑھا کر علم الاخلاق کے نام سے چھاپ دیا ۔

—:o:—

۱ ۔ ہربرٹ سپنسر : (۱۸۲۰ - ۱۹۰۳ع) مشہور مفکر اور ماہرِ تعلیم ۔

۲ ۔ ڈارون : (۱۸۰۹ - ۱۸۸۲ع) مشہور فلسفی اور سائنس دان جس نے انواع کی اصلیت کی بنیاد قانون ارتقا پر رکھی ۔

۱۷

شادی

ان دوستوں کے علاوہ کچھ اور دوست بھی تھے جو فرانسیسی ثقافت سے سرشار تھے۔ اس گروہ کے سردار مرحوم شیخ عبدالرزاق تھے جو بعد میں ازہر کی مشیخت پر بھی فائز ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر منصور فہمی، مرحوم استاد محمد کامل البنداری، مرحوم استاد عزیز دہم اور ڈاکٹر محمود وغیرھم شامل تھے۔ ان میں سے اکثر نے فرانسیسی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی، اگر پہلا گروہ شکسپیئر[1]، ڈکنز[2]، مکیاولی[3]، برناڈشا[4] اور ایچ۔ جی ویلز[5] کا مدح خوان تھا تو دوسرا گروہ روسو[6]، والٹیر[7]، راسین[8]، مولییر[9] اور درکھایم[10] وغیرہ کا

---

۱ - ولیم شکسپیئر: (۱۵۶۴-۱۶۱۶ع) انگلستان کا زندہ جاوید ڈرامہ نگار۔
۲ - چارلس ڈکنز: (۱۸۱۲-۱۸۷۰ع) وکٹورین عہد کا ناول نگار۔
۳ - مکیاولی: (۱۴۵۹-۱۵۲۷ع) مشہور اطالوی مصنف۔
۴ - جارج برناڈشا: (۱۸۵۶-۱۹۵۰ع) انگریزی زبان کا ڈرامہ نگار۔
۵ - ایچ۔ جی۔ ویلز: (۱۸۶۶-۱۹۴۶ع) افسانہ نگار اور سائنسی موضوعوں پر لکھنے والا ادیب۔
۶ - روسو: (۱۷۱۲-۱۷۷۸ع) انقلابی مفکر، انقلابِ فرانس کا مشہور داعی۔
۷ - والٹیر: (۱۶۹۴-۱۷۷۸ع) انقلابی مفکر، انقلابِ فرانس کا مشہور داعی۔
۸ - راسین: (۱۶۳۹-۱۶۹۹ع) ایک فرانسیسی ڈرامہ نگر۔
۹ - مولییر: (۱۶۲۲-۱۶۷۳ع) ایک فرانسیسی ڈرامہ نگار۔
۱۰ - درکھایم: ایک فرانسیسی مصنف

وظیفہ پڑھتا رہتا ، اگر پہلا گروہ اپنے علمی ورثہ کا محافظ اور اعتدال پسند تھا تو دوسرا قدیم سے بیزار اور حریت پسند تھا ۔ ہمارے جلسوں میں بعض اصحاب کی فرانسیسی بیویاں بھی شریک ہوتیں ۔ ان کے علاوہ علمائے ازہر بھی آ بیٹھتے ۔ موضوع شاخ در شاخ چلا جاتا اور بحث و مباحثہ خوب ہوتا ۔ بحث و گفتگو میں فرانسیسی حریت افکار، انگریزوں کی اعتدال پسندی اور ازہریوں کی قدامت کا حسین امتزاج ہوتا ۔ سیاست اور حریتِ نسواں پر گفتگو ہوتی ۔ فرانس اور مصر میں مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ۔ ان مجلسوں میں ایک نوجوان بھی شریک ہوا کرتے تھے جو قانونی تربیت کے علاوہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور اپنی آراء میں بلند آہنگ تھے ۔ اُن کا قول اُن کے اعتقاد کے موافق ، اور عمل اُن کے اعتقاد کے ہم آہنگ ہوتا ۔ حالانکہ بعض لوگ جو کچھ کہتے ہیں اُس پر عمل نہیں کرتے ۔

ان جیسا ایک مجمع عورت کے حجاب اور بے حجابی کے متعلق بحث کر رہا تھا ۔ گھر کا مالک بے پردگی کا سخت حامی اور موید تھا کہ اس اثناء میں اُس نے اپنی دادی کی آواز سنی اور فوراً اندر جا کر اپنی دادی کو اونچی آواز پر متنبہ کرنے لگا ۔ اُس کو یاد نہ رہا کہ وہ تو بے پردگی کی حمایت میں تقریر کر رہا تھا ۔

اُس نے ایک مصری خاتون سے شادی کر لی تھی ۔ اُس وقت جبکہ بے حجابی بہت کم تھی اور لوگ اس کے خلاف تھے ۔ اس نے اپنی عورت کو بے حجابی پر آمادہ کر لیا تھا ۔ وہ اُس کو ساتھ لے کر جلسوں میں جاتا ، دوستوں سے ملاتا ، اُس کو لے کر دھڑلے سے قہوہ خانہ میں بیٹھتا ۔ وہ اسیوط[1] میں سرکاری عہدہ دار تھا ۔

---

۱ ۔ مصر کا ایک شہر ، آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے ۔

اسیوط والے قدامت پسند تھے ۔ اُن کو اس کی آزادی اور بے راہ روی پسند نہ آئی تو اس کی شکایت وزارت انصاف تک پہنچائی لیکن وہ اپنی رائے پر اڑا رہا اور اسکندریہ منتقل ہو گیا ۔ بالآخر مرضِ سل میں مبتلا ہو کر چارپائی پر پڑ گیا ۔ اُس کے گھر والے اور دیگر رشتہ دار اُس سے علیحدہ ہو گئے ۔ اس حالت میں اُس نے اپنی والدہ کے نام خط لکھا اور جان ، جانِ آفرین کے سپرد کر دی ۔

ایک دن ہم مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہمارا ایک ساتھی ایک اخبار نکالتا تھا جس کا نام السفور (بے حجابی) تھا ۔ وہ قاسم امین کا زبردست حامی تھا ۔ اُس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم یہ اخبار لے کر چلائیں ۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا ۔ ہم ہفتہ میں دو تین مرتبہ اکٹھے ہوتے ۔ رسالہ کی ڈاک پڑھتے ۔ اگر کسی نے کوئی مقالہ لکھا ہوتا تو اُس کو پڑھ کر اُس پر نقد و تبصرہ کرتے ۔ میں ہر ہفتہ ایک مضمون لکھنے کی کوشش کرتا ۔ یہ تھی میری مضمون نویسی اور صحافت کی ابتداء ۔ یہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے ۔

اُس وقت ہماری محفل میں شادی ، بیاہ ، میاں بیوی ، کامیاب شادی اور ناکام شادی ، اُس کی ضرورت اور عدم ضرورت کا چرچا رہتا ۔ لوگوں کی ازدواجی زندگی کے واقعات بیان کیے جاتے ۔ اس کے بعد اس موضوع نے میرے دل و دماغ پر بھی قبضہ کر لیا ۔ اُس وقت میری عمر ۲۹ برس کی ہو چکی تھی اور میں ہر دم اس سوچ بچار میں رہتا کہ شادی کروں یا نہ کروں ۔ آخر بڑے تامل کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ شادی ضرور کرنی چاہیے لیکن مشکل یہ تھی کہ میں کس سے شادی کروں ۔ بے حجابی کا حوصلہ چند گنے چنے پڑھے لکھوں کو ہوا تھا ۔ شادی بیاہ قدیم رسوم کے مطابق ہوتے تھے ۔ کوئی نوجوان اپنے دوست یا قریبی رشتہ دار سے سن لیتا کہ فلاں

آدمی کی لڑکی شادی کے قابل ہے ، کبھی اُس کو یہ خبر نائن کے ذریعہ سے پہنچتی جس کا کام رشتے کرانا تھا - یہ گھر گھر جاتی - جوان لڑکے ، لڑکیوں کو دیکھتی - لڑکے اور لڑکی والیوں کے درمیان آتی جاتی اور ایک دوسرے کا حال کہہ سناتی - لڑکے کا کوئی رشتہ دار لڑکی کے والد کو پیغام پہنچاتا اور اگر وہ مان جاتا تو لڑکا اپنی والدہ اور رشتہ کی دوسری عورتوں کو لڑکی دیکھنے کے لیے بھیجتا - پسند آنے پر بغیر ایک دوسرے کی شکل یا مزاج یا اخلاق دیکھنے کے منگنی ہو جاتی اور اس کے بعد شادی - یہی رواج ہمارے خاندان میں بھی تھا - میں شکل و صورت اورگھرانے سے برا نہ تھا ہمارے خاندان کا اوسط درجہ میں شمار تھا اور میرے پاس ڈھلوسا بھی تھا - میری تنخواہ تیرہ پونڈ تھی اور یہ معمولی نہ تھی - میں اپنے جیسے متوسط خاندان سے رشتہ کا طالب تھا - مال و جاہ کی مجھے ضرورت نہ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرا عمامہ سنگِ گراں بنا ہوا تھا کئی گھرانوں کو میری تعلیم اور ملازمت پسند تھیَ لیکن ان کو عمامہ سے نفرت تھی کیونکہ اُن کی نظروں میں عمامہ دینداری کی نشانی تھی اور دینداری اُن کے خیال میں گنوار پن ، رجعت پسندی اور مال کی حرص کی علامت تھی - لڑکی کو تو فیشن ایبل ، ہوشیار اور خوش طبع اور خوش مزاج لڑکا پسند ہو سکتا تھا - بہت سے لوگ شروع میں مجھ کو پسند کر لیتے تھے - میں بھی اُن پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں فیشن ایبل ہوں - ایک انگریزی کتاب ساتھ لے جاتا - اُن کے پاس بیٹھ کر ماڈرن طرز کی گفتگو کرتا اور اُس میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتا اور وہ حیران رہ جاتے - میں یہ سمجھتا کہ انھوں نے مجھے پسند کر لیا ہے لیکن مجھے خبر ملتی کہ لڑکی نے دریچہ سے جھانک کر میرے عمامہ ، جبہ اور قفطان کو دیکھ لیا تھا -

وہ یہ دیکھ کر ڈر گئی اور شادی کرنے سے انکار کر دیا ۔ بعد میں مجھ کو پتہ چلا کہ اس لڑکی نے سول سیکرٹیریٹ کے ایک کلرک سے شادی کر لی جو شرابی اور بدخو تھا ۔ شادی کے بعد اس نے لڑکی کو بہت سی تکلیفیں دیں پھر اس کو طلاق دے دی ۔ اس کے بعد اس لڑکی نے محکمہ ٹیلیگراف کے ملازم سے شادی کر لی ۔ میں قاضی تھا تو اس نے گزارے کی درخواست دی ۔

میں نے شادی کے معاملے میں بھی تکلیف اٹھائی ۔ اگر کوئی دوست کسی رشتے کا پتہ دیتا تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ۔ جس کو میں پسند کرتا وہ مجھے ناپسند کر دیتی ۔ اگر لڑکی والے مجھے پسند کرتے تو میں لڑکی کو ناپسند کر دیتا ۔ آخرکار ایک مدرس جو میرے ساتھ مدرسے میں کام کرتے تھے ایک گھر کا پتہ دیا ۔ میں نے اس استاد کی بیوی کے ساتھ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو بھیج دیا ، انہوں نے لڑکی دیکھ کر پسند کر لی اور معاملہ ٹھہر گیا ۔ میں اپنی والدہ سے لڑکی کی شکل و شباہت قد و قامت اور عادات و خصائل کے متعلق پوچھتا لیکن خاطر خواہ جواب نہ پاتا ۔ اکیلا بیٹھ کر خیالی شکلیں بناتا ۔ کبھی والدہ اور ہمشیرہ سے دوبارہ پوچھتا تو کچھ اور ہی پتہ چلتا آخرکار خیالی اور وہمی باتوں کو چھوڑ کر میں نے معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا ۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۶ع کو نکاح ہو گیا ۔ نکاح کے دن میں نے ایک سو پونڈ ایک خوبصورت ڈبیہ میں رکھ کر اپنی بیوی کو مہر میں دے دیے ۔ پھر چار ماہ کا انتظار کرنا پڑا کہ سسرال والے جہیز وغیرہ تیار کر لیں ۔ یہ چار ماہ میں نے خواب و خیال کی دنیا میں گزارے ۔ کتابوں میں شادی کے متعلق جو فلسفیانہ رائیں پڑھی تھیں ان کی بنا پر امیدوں کا محل تعمیر کرتا رہا ۔ انگریزی کتابوں

کی دوکان پر چلا جاتا اور شادی کے متعلق کتابوں کو ڈھونڈتا رہتا ۔ رہنمائے خاوند اور رہنمائے بیوی جیسی کتابوں کی تلاش رہتی ۔ بچوں کی پرورش پر کتابیں دیکھتا ۔ ان کو پڑھ کر غور و فکر کرتا اور آئندہ زندگی کے لیے لائحہ عمل تیار کرتا ۔ نکاح کے بعد میں ایک ماہر مصور کے پاس گیا ۔ اُس نے یادگار تصویر کھینچ دی ۔ میں نے اس تصویر کے پیچھے یہ جملہ لکھ دیا "یہ تصویر میں نے بروز جمعہ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۱۶ء نکاح کے چار دن بعد کھچوائی جبکہ عمر ۲۹ سال کی تھی" تصویر میں میرے ساتھ کتابیں بھی تھیں ۔ بائیں ہاتھ میں مبادی الفلسفہ تھی جس کو میں تقریباً ختم کر چکا تھا ۔ کپڑے میں نے سادہ پہن رکھے تھے وہی جو میں نے نکاح کے وقت پہنے تھے ۔ تصویر کھنچوانے کا یہ امر محرک ہوا کہ میں نئی زندگی شروع کر رہا ہوں ۔ میرا خیال تھا کہ اس نئے دور کا میری ذات ، جسم اور عقل پر بڑا اثر پڑے گا اور اگر زندگی نے مہلت دی تو پہلی اور نئی زندگی کا فرق بھی معلوم کر لوں گا ۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ بچپن اور جوانی کا عہد تیس سال کی عمر تک رہتا ہے ۔ اس کے بعد آدمی عقل و شعور سے کام لیتا ہے ، لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرا بچپن اور جوانی لہو و لعب اور عیش و عشرت سے کورا رہا ۔ میں تربیت کی وجہ سے وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا تھا ، اس تربیت میں ڈر اور خوف بھی شامل تھا ۔ ہمارے گھر میں زندہ دلی اور مزاح کا گذر نہ تھا اور میں اس عمر میں جو نشاط پاتا ہوں وہ انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے جس نے میری ذات اور زبان کی اصلاح کی ہے ۔ عاطف بک علم الاخلاق پر ایکچر دیتے تھے انھوں نے بھی مجھ پر بڑا اثر ڈالا جس کی وجہ سے میں رائے زنی میں بے دھڑک ہوں ۔ علم الاخلاق اور علم الاجتماع

کی انگریزی کتابوں کی طرف میرا میلان خاطر رہا - میں نے ان علوم کا مطالعہ ۱۹۱۴ع میں شروع کیا تھا اور جبکہ ڈھائی سال گذر چکے ہیں ان میں تبحر نہیں پیدا ہوا -

میں اب مدرسة القضاء میں مدرس تھا اور ۱۳۲۰ قرش تنخواہ پاتا تھا - اس درس و تدریس سے خوش تھا اور محکمۂ قضا پر اس قسم کو ترجیح دیتا تھا اس پر بھی اللہ تعالیٰ سے اُمید تھی کہ وہ مجھے اپنی قوم کی خلقی اور اجتماعی خدمت کی توفیق دیں گے -
(یہ میں نے ۴ جولائی ۱۹۱۶ع کو لکھا تھا) میں نے تصویر کی پشت پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مجھے کسی قسم کی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں سوائے اس قول کے کہ "میرے دل میں کبھی محبت کے جذبات پیدا نہیں ہوئے" یہ بات تو صرف جامد قسم کے آدمی پر صادق آ سکتی ہے - ایام شباب میں تو میرے جذبات بڑے گرم اور تیز رہے ہیں - میں دوستوں کے قرب سے لذت اور اُن کی دوری سے رنجوری پاتا - غریبوں اور فقیروں سے رحم اور شفقت کے ساتھ پیش آتا - میرے دل میں محبت کے جذبات شروع سے موجزن رہے ہیں - میری عمر پندرہ سال کی ہو گی کہ میں ہمسایہ کی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا اُس کے غم میں راتوں کو جاگتا اور روتا رہتا - کبھی کبھی ہم اپنے مکان کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ کر سوائے محبت کے ادھر ادھر کی باتیں کرتے - شیطان نے لڑکی کے باپ کے دل میں وسوسہ ڈالا تو اس نے مجھ سے ملنا جلنا بند کر دیا - کچھ عرصہ مجھے تو اس کا قلق رہا لیکن پھر میں اس ماجرے کو بھول گیا - جب میں ایک انگلش سکول میں انگریزی سیکھنے کے لیے جاتا تو وہاں ایک نوجوان لڑکی بھی ملا کرتی - میں اس کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا اور وہ اپنی پاکباز نگاہوں سے میری

طرف دیکھتی رہتی لیکن وہ شادی شدہ تھی اور اپنے خاوند کی وفادار ، اور اُس سے خوش و مطمئن تھی ۔ محبت کا جذبہ میرے دل میں مستور رہتا ۔ متوسط خاندان سے تعلق بھی سد راہ تھا ۔ اُس وقت لڑکیاں پردہ نشین ہوا کرتی تھیں ۔ سوائے قریبی رشتہ کی لڑکیوں کے ۔ لڑکے بہت کم لڑکیوں کو جانتے تھے پھر میری دینی تربیت بھی محبت کو فسق و فجور سمجھتی تھی ۔ لڑکیوں کو دیکھنا اور ان سے بات کرنا شیطانی کام تھا ۔ مدرسے میں بندشیں گھر جیسی تھیں ۔ قہوہ خانے جانے کی اجازت نہ تھی گانا سننا بھی ممنوع تھا ۔ ایک دفعہ مدرسۃ القضاء کا ایک طالب علم ، جو نیا نیا پاس ہوا تھا کسی دوسرے مدرسے کی طالبہ سے قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا مصروف گفتگو تھا ۔ اُن کے سامنے شراب کے دو گلاس پڑے تھے ۔ بدقسمتی سے وہاں عاطف بک کا گذر ہوا ، اگرچہ وہ انگریزی شراب کو دیکھ نہیں سکے لیکن پھر بھی اُس نوجوان کو دو سال کے لیے ملازمت سے محروم کر دیا ۔ اس معاملے میں ہر قسم کی سفارش اور معافی رد کر دی اور پھر بڑی مشکل سے اُس کو نوکری دی ۔

ان حالات میں مجھے محبت کا کیا خیال آتا لیکن شادی کے زمانہ تک اس کی چنگاریاں میرے دل میں سلگتی رہتیں ۔

منگنی اور جہیز کی تیاری کے بعد شادی ہوئی ۔ میں نے اپنے گھر کے قریب ایک اور مکان کا انتظام کر لیا تھا اور کوشش کی کہ میاں بیوی کی ناچاقی کے متعلق جو باتیں زبان زد خاص و عام ہیں اُن سے دامن بچایا جائے ۔ اس طرح زندگی کا یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا ۔

—— :o: ——

۱۸

گھریلو زندگی

میں نے شادی تو کر لی تھی لیکن اعتبار تمام تر خیالات پر تھا حقیقت پر نہ تھا ۔ میں نے عورتوں کو دیکھ کر اپنی بیوی کی شکل و صورت اور اس کی عادات کی ایک تصویر قائم کر لی تھی ۔ اس خالی خوبی تصویر کی بنیاد سنی سنائی باتیں تھیں یا گھریلو زندگی کے متعلق میں نے جو کچھ انگریزی کتابوں میں پڑھا تھا ۔

لیکن خیال اور حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ ہم عالم خیال میں ایک شخص کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں در حقیقت وہ زمین کے نیچے ہوتا ہے ۔ اس فرق کو بیان کرنے کے لیے میں اپنے دوست کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں ۔ ہم دونوں سیر و تفریح کے لیے اسکندریہ گئے ۔ میں پیراکی جانتا تھا اور وہ اس سے انجان تھا ۔ میرے دوست نے بھی غصے میں آ کر تیراکی سیکھنے کا عزم کر لیا ۔ اتفاق سے ایک دفعہ انگریزی کتابوں کی دوکان سے گذرے اور پیراکی پر کتاب خرید لی ، چونکہ اُن کی انگریزی کی لیاقت اچھی تھی انھوں نے رات بھر میں کتاب ختم کر ڈالی اور تیراکی ، اس کی کیفیات اور نظریات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا ۔ پھر بڑے سے بڑے تیراک سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ پیدا ہوا ، لیکن میں اُن کی باتوں کو سن کر ہنس دیتا ۔ صبح ہوئی تو ہم ساحل سمندر پر نہانے گئے ۔

اُس نے اپنے کو ایک لمبی رسی سے باندھ لیا اور اپنے پاؤں

ریت میں گاڑ لیے ۔ کتاب کے نظریات کے مطابق وہ رسی چھوڑ کر تیرنے لگا تو گھبرایا ۔ چہرہ زرد پڑ گیا اور جسم کانپنے لگا سو جب میں نے اپنی بیوی دیکھی تو میری حالت اُس شخص جیسی تھی جو مٹھائی کا لفافہ کھول کر مٹھائی دیکھتا ہے یا لاٹری کا ٹکٹ خریدنے والا جب اس کی لاٹری نکلتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے انعام پر میں نے اُس کا شکر ادا کیا ۔ اپنی بیوی کی صفات سے آہستہ آہستہ روشناس ہونے لگا جن کا ظہور کسی موقع یا نیا واقعہ پیش آنے پر ہوتا ۔

ہم آرام و اطمینان سے وقت گذارنے لگے ۔ ایک دوسرے کے اخلاق و خصائل کی پہچان سے خوش ہوتے ۔ میں نے ایک عرصہ تک والدین کے سایہ میں زندگی گذاری تھی اب میں اپنے گھر کا کار مختار تھا ۔

کچھ دیر بعد میری بیوی کو یہ معلوم کرکے صدمہ ہوا کہ میں کم گو ، سنجیدہ اور ہنسی مذاق کا عادی نہیں ۔ اس نے ایسے گھر میں تربیت پائی تھی جہاں ہنسی خوشی کا دور دورہ رہتا تھا ۔ فارغ اوقات میں خوب باتیں ہوا کرتی تھیں ۔ اُس کو خیال گذرا کہ شاید میں اس کی قدر نہیں کرتا یا شادی پر نادم ہوں ۔ میں بہتیرا سمجھاتا کہ میری طبیعت ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے لیکن اُس کو یقین نہ آتا ۔ آخرکار بڑی دیر رہنے سہنے کے بعد اُس کو اطمینان ہوا کہ دوسروں کے ساتھ بھی میرا معاملہ ایسا ہی ہے ۔

ایک دوسری مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ میں اُستاد تھا ۔ صبح درس دینے کے لیے رات کو سبق تیار کرتا ۔ اس کے علاوہ مجھے مطالعے کا بھی شوق تھا ۔ جب نئی نئی شادی ہوئی تو میں مبادی الفلسفہ کے ترجمے میں مشغول تھا ۔ میری بیوی کی تعلیمی لیاقت کچھ زیادہ نہ تھی اُس نے چند قصص اور حکایات پڑھ رکھی

تھیں - صبح کو تو وہ کھانا پکانے اور صفائی وغیرہ میں مشغول رہتی لیکن شام کو اُس کے صبر اور حوصلہ کا پیمانہ لبریز ہو جاتا - شادی ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی لیکن میں اکیلا کمرے میں لکھتا یا مطالعہ کرتا رہتا - کئی دفعہ رات کو تو ایسا ہوا کہ اُس نے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے لیکن میں کتاب کے ترجمہ میں ایسا مصروف ہوتا کہ اُس کی آواز نہ سن سکتا نہ دروازہ کھلنے کا مجھے پتہ لگتا - اس سے لڑائی اور جھگڑا شروع ہو گیا - اُس نے اس معاملے کی شکایت اپنے والدین تک پہنچائی پھر بڑی مشکل سے یہ قضیہ رفع دفع ہوا لیکن میں نہ تو اپنی فطرت تبدیل کر سکا نہ مجھ سے مطالعہ چھوٹا - اس کے بعد پہلا لڑکا پیدا ہونے اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے یہ مشکل بھی حل ہو گئی - وہ بچوں میں لگی رہتی اور قضا و قدر کا حکم سمجھ کر اُس زندگی پر شاکر ہو گئی جو میرے لکھنے پڑھنے کی وجہ سے ایک قسم کی عزلت گزینی بن گئی تھی -

اولاد کے معاملے میں میرا نظریہ اُس کے نظریے سے مختلف تھا - میری رائے میں ایک یا دو بچے کافی تھے کیونکہ اُن کی غور و پرداخت اور تعلیم و تربیت پر بہت کچھ صرف کرنا پڑتا تھا - مصر کی آبادی روز افزوں تھی اور اکثریت کو بچوں کی صحت ، غذا اور اُن کی پرورش کا مطلقاً دھیان نہ تھا - اگر خاندان کے افراد کی تعداد کم ہو جائے تو اُن کی پرورش اور تربیت بڑی عمدگی سے ہو سکتی ہے - میری بیوی کے رشتہ داروں نے اُس کو نصیحت کی تھی کہ اگر ایک جانور کے پر نوچ لیے جائیں یا قینچی سے کاٹ دیے جائیں تو وہ اُڑ نہیں سکتا - اسی طرح اگر خاوند پر اولاد کا زیادہ بوجھ نہ ہوگا تو وہ دوسری یا تیسری شادی کرے گا ، پھر اُس کا نظریہ میرے

نظریے پر غالب آکر رہا ۔ بچوں کی ولادت اور تربیت سے والدین کو جو تکلیفیں ہوتی ہیں اُن کا بھی خیال نہ رہا ۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرے ہاں دس بچے پیدا ہوئے ۔ دو تو ایام طفولیت میں مر گئے اور آٹھ زندہ ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اُن کی عمر میں برکت دے اور اُنھیں صاحب نصیب کرے ۔ ان میں چھ لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں ۔ غیروں کو اور خود مجھ کو تعجب آتا ہے کہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت سے وقت نکال کر میں کس طرح تصنیف و تالیف اور مطالعے میں لگا رہتا ہوں ۔ یہ سب بچوں کی والدہ کی مہربانی ہے کہ اُس نے تربیت کی ساری ذمہ داریاں خود لے رکھی ہیں اور میں صرف اُن کی علمی اور خلقی تربیت کا ذمہ دار ہوں ، کیونکہ میں اپنے کتب خانے میں زیادہ وقت صرف کرنے کی وجہ سے اُن کے ساتھ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا اور نہ زیادہ بات چیت میں مصروف رہ سکتا ہوں ۔ ہم میاں بیوی میں ایک دوسرے کی عادات اور رجحان پہچاننے کے بعد صلح صفائی ہو گئی ۔ لہٰذا ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہوئے ہم دونوں بہت سی مرغوب چیزوں سے دستبردار ہوگئے اور زندگی آرام سے گزرنے لگی ۔ ہم بچوں کی تربیت کی خاطر صحت مندانہ ماحول پیدا کرنے کے خیال پر متفق تھے ۔

بعض اوقات ہمارے گھر کے صاف ماحول کو ایک دو باتیں مکدر کر دیتیں لیکن ان سے کون سا گھر بچا ہوا ہے ۔ ایک تو مسئلہ نوکروں کا ہے ۔ کسی گھر کا ان کے بغیر گزارہ نہیں ، خاص کر خادماؤں کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوتی تھیں وہ شروع سے چلی آ رہی ہیں ۔

میری اہلیہ بہت جلد غصہ میں آ جاتی ہے ۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کے جملہ احکام کی اچھی طرح تعمیل کی جائے ، اگر خادمہ ایسا

نہیں کرتی یا وہ اپنی بات پر اڑ جاتی ہے تو میری بیوی غصے سے بپھر جاتی ہے۔ وہ اس سے کنیزوں جیسا سلوک کرتی ہے لیکن خادمہ مساوات کی طالب ہوتی ہے یا میری بیوی خادمہ کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہے اور وہ گندے کپڑوں میں ملبوس رہتی ہے۔ وہ تنظیم اور ترتیب چاہتی ہے لیکن خادمہ کی سمجھ سے یہ چیزیں باہر ہیں۔ اس معاملے میں کبھی تو میری بیوی حق پر ہوتی ہے اور کبھی خادمہ۔ میں جب گھر آتا ہوں تو اس سارے جھگڑے کا مرکز میری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ میری بیوی غیرت مند بھی ہے وہ نہیں چاہتی کہ خادمہ پر کسی قسم کی خوبصورتی کا پرتو پڑ سکے۔ اگر ایسا ہوا تو معاملہ دگرگوں ہو جائے گا۔ خادمہ کے متعلق بات طول پکڑ جاتی ہے۔ خادمہ وہاں گئی تھی۔ فلاں جگہ سے آئی ہے۔ یہ چیز چرا لی ہے۔ آخرکار نوکروں اور نوکرانیوں کے جھگڑوں سے میں نے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا اور ان کا رکھنا اور نکالنا اپنی بیوی کے سپرد کر دیا، اس شرط پر کہ ان کے متعلق مجھے کچھ نہ کہے۔

دوسری مشکل افہام اور تفہیم کی تھی۔ میں غفلت سے سمجھتا تھا کہ سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعہ عقل ہے، اگر کوئی مشکل درپیش آتی تو ہم عقل کے ذریعے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتے لیکن تجربے کے بعد پتہ چلا کہ عورتوں کو سمجھانے کے لیے عقل کام میں نہیں آتی۔ اگر تم مشرق کے متعلق گفتگو کرو گے تو وہ مغرب کے متعلق جواب دیں گی۔ تم آسمان کا ذکر کرو گے وہ زمین کا ذکر کریں گی۔ تم امکان بھر دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرو گے لیکن ان کے نزدیک یہ سب باتیں بے فائدہ ہوں گی۔ تم کہو گے کہ یہ کام ان ذرائع سے ہو سکتا ہے تو وہ جذبات میں

بہہ جائیں گی ۔ تم کہو گے کہ یہ امر لا حاصل ہے کیونکہ اس سے نقصان پہنچے گا ۔ جواب ملے گا کہ رسم و رواج سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے ۔ تم اپنے لڑکے کو سزا دینا چاہتے ہو تو وہ جھوٹے محبت کے جذبات سے دخل دے کر اس تادیب کو بے اثر کر دیتی ہے اور حکیمانہ تصرفات سے کام لے کر عجیب و غریب تاویلیں کرتی ہے ۔ اس پر میں نے سمجھا کہ منطق سے کام نہیں چلے گا ، جب میں آرام و سکون کا متلاشی ہوتا تو منطق بگھارنی چھوڑ دیتا اور سلامتی کی خاطر جذبات سے اپیل کرتا ۔

ہماری زندگی اس ساکن سمندر کی سی تھی جس میں کبھی کبھی طغیانی آ جاتی ہے ۔ آندھی گزر جاتی تو پھر سکون واپس آ جاتا ۔ ہمیں کبھی بھی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے فراخ رزق عطا فرمایا تھا ۔ میرا صرف سرکاری تنخواہ پر گزارہ نہ تھا ۔ میں مدرسۃ القضاء سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمۂ اوقاف کے دوسرے مدارس میں بھی علم الاخلاق کا درس دیتا تھا ۔ اور جب محکمۂ قضا میں چلا گیا تو مدرسۃ القضاء میں بھی پڑھاتا رہا ۔ مجھے کتابوں اور مضامین سے بھی خوب آمدنی ہو جایا کرتی تھی ۔ عیال داروں کو روپے پیسے کی حاجت رہتی ہے لیکن مجھے ادھار مانگنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ سوائے حقہ نوشی کے مجھے کسی قسم کی علت نہ تھی ۔ میں خرچیلا بھی تھا لیکن میری بیوی جز رس تھی ۔ ہماری اولاد بھی کافی تھی ۔ وہ مستقبل کا دھیان کرکے پس انداز کر لیتی ۔ اگر میرے ہاتھ میں خرچ ہوتا تو شاید کچھ بھی نہ بچتا ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں کئی مشکلات سے محفوظ رکھا جو دوسرے لوگوں کو پیش آتی ہیں اور جن کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

شادی کے بعد میرے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا تو میں نے اُس پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر دی۔ بچے کی پیدائش پر عربی اور انگریزی میں جتنی کتابیں لکھی ہوئی تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ بچے کے بہلاوے اور عقلی تربیت کے لیے انگریزی کھلونے لے آتا۔ اُس کے لیے دیسی مدارس مجھے پسند نہ آئے۔ میں نے اُس کو ایک فرانسیسی مدرسے میں داخل کر دیا۔ پھر تین جماعتیں پڑھانے کے بعد اُس کو ایک مصری مدرسے میں داخل کیا تاکہ اُس کو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو جائے۔ جب اُس نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر لیا تو اعلیٰ نمبر حاصل کرنے کی وجہ سے وہ ڈاکٹری یا انجنیری میں داخل ہو سکتا تھا لیکن اُس نے انجنیری کو پسند کیا۔

میں نے بڑے لڑکے پر خاص توجہ مرکوز کی تھی کہ وہ دوسرے بھائیوں کے لیے نمونۂ عمل بن سکے۔

میں پہلے دو بچوں کے معاملے میں سخت گیر واقع ہوا تھا۔ اُن کے اخلاق اور اسباق کی سخت نگرانی کرتا۔ معمولی سے انحراف پر اُن کو سزا دیتا۔ اپنی عقل کے مطابق اُن کو بے لگام نہ ہونے دیتا۔ لیکن یہ سختی میرے والد کی سختی کے مقابلے میں بالکل معمولی تھی۔ درازیٔ عمر کے ساتھ میرے افکار میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ میں اُن کے معاملات میں بہت کم دخل دیتا۔ ایک دوسرے سے متأثر ہونے کی وجہ سے میں نے پہلے اور پچھلے بچوں میں کوئی اختلاف محسوس نہیں کیا۔ میں نے بچوں کی صحت، تعلیم اور اطوار کی وجہ سے کافی پریشانی اٹھائی تھی۔ ہر حصۂ عمر اپنے ساتھ مختلف قسم کی صعوبتیں لاتا ہے۔ بچوں کے عہد طفولیت میں اُن کی صحت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بلوغت میں تعلیم اور اطوار کا، اور جوانی میں بے راہ روی سے بچانے اور دور سے نگرانی کرنے کا۔ اکثر دفعہ

ہم عمروں کی مشکلات مختلف ہوتیں ۔ میں اللہ تعالٰی کا شکر گزار ہوں کہ بچوں کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکا ۔ اس وقت جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں دو لڑکیوں کی بقدر استطاعت شادی کر چکا ہوں ۔ تین بچوں نے انجنیری پاس کی ہے ۔ چوتھا ابھی پڑھ رہا ہے ۔ جب میں انجنیری سے تنگ آ گیا تو پانچویں کو قانون کی تعلیم دلائی ۔ خیال ہے کہ چھٹے کو ڈاکٹر بناؤں گا یہ بچہ ایف ۔ اے کے امتحان میں اول آیا ہے لیکن داخلے میں کامیابی نہیں ہو سکی ۔ بچوں سے ہماری محبت کی انتہا نہ تھی ۔ اُن کے آرام و راحت کی خاطر ہم نے اپنا آرام بیچ دیا تھا ۔ اُن کی صحت کی خاطر ہم نے اپنی صحت برباد کر لی تھی ۔ اس پر ہم اللہ تعالٰی ہی سے جزا کے طالب ہیں ۔ بچے تو معمولی بات پر گرفت کرتے کہ اِس سے اُن کے جذبات مجروح ہوتے ہیں ۔ معمولی تقصیر کو اپنے حقوق میں دست اندازی خیال کرتے ہیں ۔ عمل کی تفسیر برائی سے کرتے ہیں اگرچہ والدین کی غرض اُن کی بھلائی سے ہوتی ہے ۔ شرافت کا تقاضا ہے کہ اولاد کی تربیت کو تجارت نہ سمجھا جائے کہ ہم جو دیتے ہیں کل اُس سے نفع اُٹھائیں گے ۔ یہ تو فرض عین ہے جس کو والدین بچوں کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں ۔ اگر لڑکے چاہیں تو اپنا حق ادا کر دیں کیونکہ والدین جو کچھ کرتے ہیں اُس کی جزا اللہ تعالٰی دینے والے ہیں ۔ مجھے بچوں سے بے حد محبت تھی حتّٰی کہ سفر میں بھی اُن کو یاد رکھتا ۔ سفر سے واپس آ کر اُن کو دیکھتا تو چین پاتا ۔ میرے ساتھی مسافروں کو بچوں کی یاد نہ ستاتی اور وہ ان باتوں کو عجیب سا خیال کرتے ۔

—— :o: ——

تحریک آزادی

۱۹۱۴ع میں عالمی جنگ چھڑی تو مصریوں کے جذبہ حب الوطنی کی آگ بھڑک اٹھی - خدیو عباس معزول کر دیے گئے اور برطانیہ نے مصر پر اپنی حفاظت کا اعلان کر دیا، اس سے ہمیں سخت رنج ہوا - امیر حسین کامل[1] سلطان بنا دیے گئے ، لیکن جس طریقے سے یہ سب کچھ ہوا اس سے ہم بے حد متاثر ہوئے - اس سے پہلے مصر کے والی کا تقرر سلطان ترکی کے فرمان کے ذریعے سے ہوا کرتا تھا جو سلطان کا سفیر ہوتا - اس دفعہ خدیو کی تقرری کا اعلان سفیر برطانیہ نے کیا تھا - مصر کو جنگی مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑا - ملک کی اقتصادی حالت تباہ ہو گئی اور انگریزوں نے مصریوں پر بڑے بڑے ظلم کیے - مصری مزدوروں سے زبردستی کام لیا جاتا - باربرداری کے جانور جبراً چھین لیے جاتے - جرمنی کے ہوائی جہازوں نے قاہرہ پر ہوائی تاخت کر کے بہت سے لوگوں کو ہلاک کر ڈالا - مصری مزدوروں کو فرانس اور عراق بھیجا گیا - مصریوں سے اسلحہ چھین لیا گیا - ان سب باتوں نے ہمارے وطنی شعور کو پروان چڑھایا - اب آنکھیں صلح اور انگریزوں کے وعدہ پورا کرنے پر لگی ہوئی تھیں - یہ وعدہ اگرچہ مبہم سا تھا لیکن ولسن[2] اور اس کے

---

۱ - امیر حسین کامل : جس کو انگریزوں نے ۱۹۱۷ع میں معزول کر دیا تھا -

۲ - مسٹر ولسن : صدر امریکہ -

حلیفوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم آزادی کی حمایت میں جنگ کر رہے ہیں ، جب ختم ہوگی تو استعمار اور غلامی کا نام و نشان نہ رہے گا اور ہر قوم اپنی قسمت کی خود مالک ہوگی ۔ جب مصریوں نے دیکھا کہ سرکاری احکام جوں کے توں باقی ہیں اور اقتصادی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا ، بلکہ حکومت برطانیہ نے روئی کے محصول پر اپنی اجارہ داری قائم کرکے اس کی قیمتیں مقرر کر دی ہیں ، تو ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں ۔ یہ بات ظاہر تھی کہ برطانیہ مصر کو آزادی دینے پر تیار نہیں ۔ بعض قومی رہنماؤں نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ نے مصر سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کرے ۔ (اس کے بعد) وفدی جماعت سعد زغلول کی قیادت میں قائم ہوئی ۔ اس کے بعض ممبر گرفتار کر لیے گئے جس پر مظاہرات ہونے لگے ۔ تخریب کا دور دورہ ہوا اور سارے ملک میں آگ سی لگ گئی ۔ انگریزوں نے مظاہرین پر گولی چلا دی اور بعض گاؤں کو اتنی سخت سزائیں دیں جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔

اس کے بعد وہ سیاسی واقعات رونما ہوئے جن کو قارئین اچھی طرح جانتے ہیں ۔ ان واقعات سے مدرسۃ القضاء میں بھی دوسرے مدارس کی طرح ایک ہیجان سا تھا ۔ سعد پاشا زغلول کی رہنمائی میں ایک وفد مرتب کیا گیا تو اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا کیونکہ مدرسے کا قیام ان کے حسن مساعی کا نتیجہ تھا ۔ حب الوطنی اور وفا شعاری کا تقاضا تھا کہ ان کی امکان بھر تائید کی جائے پھر مدرسے کے پرنسپل عاطف بک برکات ، سعد پاشا کے قریبی عزیز تھے اور ان کے مقرب خاص بھی ۔ میں نے بھی سیاست میں حصہ لیا اور یہ شرکت اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب مصری وفد قائم ہوا اور سعد پاشا قید کر دیے گئے ۔

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہماری ثقافتی مجلس "السفور" کے نام سے ایک اخبار نکالتی تھی ۔ اس میں سیاسی مباحث بھی ہوا کرتے تھے ۔ اس کو بھی نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا ۔ جب مصری وفد کی تشکیل ہوئی تو ہماری مجلس نے بھی نمائندگی پر اصرار کیا ۔ ہم نے دو آدمیوں کو سعد پاشا سے ملنے اور اپنے خیالات گوش گزار کرنے کے لیے منتخب کیا ۔ میں بھی ان نمائندوں میں سے ایک تھا ، ہم اُن سے ملنے گئے تو اُنھیں مصروف پایا ۔ سعد پاشا نے ہمارا مطلب سمجھ کر ہمیں اُستاد لطفی السید[1] سے ملنے کی ہدایت کی ۔ ہم نے اُن سے بات چیت کی تو کہنے لگے "تم کس کی نمائندگی کرنے آئے ہو" میں نے جواب دیا کہ تعلیم یافتہ طبقے کی پھر بڑی رد و قدح کے بعد ہمارے نام پوچھ کر ہماری گزارش سعد پاشا کی خدمت میں پیش کر دی ۔ اُنھوں نے شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق[2] کو ہماری جماعت کا نمائندہ چن لیا لیکن شیخ صاحب نے اپنے گھر والوں سے مشورہ کرنے کے بعد معذرت پیش کر دی ۔ جب انقلاب کی آگ بھڑکی تو میرا نظم و ضبط وفد کے سیکریٹری عبدالرحمان بک فہمی سے بڑھا ۔ اُن کے ساتھ نوجوانوں کی جماعت تھی جن کے ذمے مختلف کام تھے ۔ میرے ذمے دو کام کیے گئے ۔ نماز جمعہ کے بعد مساجد میں سیاسی تقریریں کرنا ۔ میں بعض دوستوں کو اکٹھا کرتا ۔ تقریر کا موضوع متعین کرتا اور اُن کو مختلف مساجد میں بھیج دیتا ۔ دوسرا اعلانات کا لکھنا تھا ۔ ان میں سے ایک اہم اعلان ۱۶ مارچ ۱۹۱۹ء کو عورتوں کے مظاہرے کے بعد جاری کیا گیا تھا :

---

۱ ۔ استاد لطفی السید : (المتوفی ۱۹۶۳) مشہور ادیب جو بعد میں جامعہ مصریہ کے چانسلر ہوئے ۔

۲ ۔ شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق : (۱۸۸۵ - ۱۹۴۶ء) سابق شیخ ازہر ۔

"مصر کے اونچے گھرانوں کی عورتوں نے قاہرہ کی شاہراہوں پر مظاہرہ کیا ۔ اس حیرت ناک منظر کی مصر کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی ۔ انھوں نے مصر کی آزادی اور ظلم کی بربادی کے نعرے لگائے۔ عورتوں نے چھوٹے چھوٹے جھنڈے بھی اٹھا رکھے تھے ۔ جب وہ ایک میدان میں پہنچیں تو انگریزوں نے ان کی طرف بندوقیں تان لیں ۔ ایک عورت نے اپنا سینہ بندوق کے سامنے کر دیا ۔ اس طرح وہ دو گھنٹے تک دھوپ میں مظاہرہ کرنے کے بعد منتشر ہو گئیں"

میں نے اس مظاہرے کے اثرات اور نتائج پر ایک لمبا چوڑا اعلان شائع کرایا تھا ۔

عبد الرحمان بک فہمی کی لائبریری میں ان لوگوں کے نام محفوظ تھے جو اس قسم کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتے ، جب وہ قید کر دیے گئے اور ان کا مکتبہ سربمہر کر دیا گیا تو بعض دوستوں نے دروازہ توڑ کر بعض کاغذات اڑا لیے ، ان میں یہ نوٹ بھی تھا ۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو میں بھی دوسرے دوستوں کی طرح قید کر لیا جاتا ۔

سعد پاشا زغلول کے سیکریٹری (کامل بک سلیم) سے میرے گہرے تعلقات تھے ۔ جب سعد پاشا رہا کر دیے گئے اور کامل بک سلیم ، وفد کے ساتھ پیرس گئے تو میں ملکی معاملات سے ان کو با خبر کرتا رہا ۔ اس ذریعے سے میری رسائی سعد پاشا تک ہوئی اور ان سے تعلقات بڑھے ۔ وہ مجھے خفیہ پیغامات بھیجتے اور میں پتہ کاٹ کر بعض ممبروں تک پہنچا دیتا کیونکہ میری مدرسی کی وجہ سے کسی کو ان چیزوں پر شک نہیں ہو سکتا تھا ۔

جب وفد پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور عدلی پاشا مہتمم قرار دیے گئے تو میں سعد پاشا کے حامیوں میں تھا لیکن میں فکری آزادی سے دستبردار نہ ہوسکا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ سعد پاشا اپنے کمرے میں تھے تو عدلی پاشا پر حملہ کرکے انھیں زخمی کر دیا گیا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ سعد پاشا نے وجوہات پیش کیں تو میں قائل نہ ہو سکا اور جواباً گزارش کی تو وہ ناراض ہوگئے۔ اور کہنے لگے آج عجیب باتیں کرتے ہو۔

الغرض میں نے سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا، خاص کر میں ان مظاہروں میں شریک ہوتا جن کی غرض مسلمانوں اور قبطیوں میں میل ملاپ کرانا ہوتا۔ میں اپنے عمامہ سمیت ایک پادری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتا اور ہمارے ہاتھوں میں صلیب اور ہلال کے جھنڈے ہوتے۔

اس تحریک آزادی کی لپیٹ میں مدرسۃ القضاء بھی آ گیا تھا۔ مدرسے کی زمام کار عاطف بک کے ہاتھوں سے نکل گئی کیونکہ وہ مظاہروں اور ہڑتالوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اس وقت نسیم پاشا اول کی وزارت بن چکی تھی جو سعد پاشا کے مخالف تھے۔ وزیر تعلیم محمد توفیق رفعت پاشا بھی مدرسے کی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ایک دفعہ مدرسے کے صحن میں تمام طلبہ جمع ہوئے اور سعد پاشا زندہ باد اور نسیم پاشا مردہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ رفعت پاشا نے گمان کیا کہ اس مظاہرے کو منظم کرنے میں عاطف بک کا ہاتھ ہے حالانکہ ان کا اس مظاہرے سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن شام ہونے سے پہلے مجلس الوزراء نے عاطف بک کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان واقعات نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں غمگین سا رہنے

لگا ۔ میں نے پندرہ برس عاطف بک کی خدمت میں بطور شاگرد گزارے تھے ۔ اُن کی عقل اور خلق سے استفادہ کیا تھا ۔ جب وہ مدرسے سے نکالے گئے تو مجھے محسوس ہوا کہ مدرسہ گر کر میرے سر پر آ رہا ہے ۔ مرحوم علی بک کیلانی کو مدرسہ کا نیا نگران مقرر کیا گیا ۔ وہ مجھے نہ تو جانتے تھے اور نہ میں اُن سے شناسا تھا ۔ اُستادوں نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی اور اُن سے عاطف بک سا سلوک کرنے لگے ، اگر اُن کو عاطف بک کے نکلنے کا رنج ہوتا تو خارجی طور پر اس کا اثر ضرور دکھائی دیتا لیکن میں سادگی سے اپنے جذبات چھپا نہ سکا ۔ اُن کے آنے پر نہ تو میں اُن سے ملتا اور نہ کبھی سلام عرض کرتا ۔ اُنھیں خبریں ملتی رہتی تھیں کہ میں ہر روز عصر کے بعد عاطف بک کے ہاں جاتا ہوں جس کی وجہ سے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے ۔ اس قسم کا اظہار انھوں نے تمام مدرسوں کے سامنے بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ میرے سوا تمام مدرسین ان سے تعاون کرتے ہیں ۔ اتفاق سے انتظامیہ مجلس نے ایک دن یہ قرارداد پاس کر لی کہ مدرستہ القضاء کے تعلیم یافتگان اس شرط پر مدرس رکھے جائیں گے کہ وہ فقہ نہ پڑھائیں گے ۔ میرے خیال میں یہ قرارداد نا پسندیدہ تھی اور اُس کی زد مدرستہ القضاء پر پڑتی تھی ۔ میں نے اس پر اظہار خیال کیا تو انھوں نے گمان کیا کہ میں نے مدرسین اور طلبہ کو مشتعل کر دیا ہے ۔ یہ خبر نئے پرنسپل صاحب تک پہنچی تو وہ گاڑی میں بیٹھ کر وزیرِ اعظم عدلی پاشا کے پاس گئے اور کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ کام نہیں کر سکتے ۔ اس پر محکمۂ قضاء میں میری منتقلی کا حکم آ گیا اور مجھے قویسنا[1] میں

---

۱ ۔ قویسنا : مصر کا ایک چھوٹا سا شہر ہے ۔ آبادی تیس ہزار کے لگ بھگ ہوگی ۔

قاضی مقرر کر دیا گیا۔ یہ درس و تدریس کا آخری زمانہ تھا۔

اس طرح عمر کا ایک لمبا حصہ طے ہو گیا یہ تقریباً جوانی کا عہد تھا۔ عمر عزیز کے پندرہ سال میں نے اس مدرسے میں بطور طالب علم اور استاد گزارے تھے۔ یہاں سے میں نے تہذیب و شائستگی، زندگی کے تجربات اور علم و فضل حاصل کیا جن شخصیتوں سے میں متاثر ہوا ان کا تعلق مدرسہ سے تھا۔ یہاں کا نقش عمر بھر قائم رہا۔ یہاں آ کر میری ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں۔ اس وجہ سے میں مدرسے کے فراق میں اس طرح روتا جس طرح کوئی ماں باپ کے مر جانے پر روتا ہے۔ زیادہ رنج اس بات پہ تھا کہ مجھے عہدہ قضاء سے زیادہ درس و تدریس پسند تھا۔ عاطف بک اور دوسرے اساتذہ اور سیاسی زعماء کی رفاقت سے مجھے ایک گونہ تسلی حاصل ہوتی تھی۔ میں دوسرے لیڈروں کی طرح سیاست میں زیادہ ابھر نہ سکا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجھ میں ان جیسی جرأت اور شجاعت نہ تھی۔ مجھے تو جیل اور سزا سے ڈر لگتا تھا۔ شاید ڈرنے کی بڑی وجہ والدین کا خیال تھا جن کا میں اکلوتا لڑکا تھا، اگر وہ سن لیتے کہ مجھے سزا ہو گئی ہے تو ان کا کیا ٹھکانا تھا۔ والد نے مجھے نتائج پر غور کرنے کا خوگر بنا دیا تھا اور جو زیادہ سوچتا ہے وہ ہمت سے کام نہیں لیتا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میرا مزاج علمی ہے سیاسی نہیں۔ اسی بناء پر بعض دوستوں سے میرا اختلاف رہتا۔ وہ سعد پاشا کے اندھے مقلد تھے اور ان کی خطا اور بریت کی تاویلیں بھی ڈھونڈ لیا کرتے تھے لیکن میرا حال اس سے مختلف تھا۔ میں کبھی تو ان کی تائید کرتا اور کبھی تنقید۔ میں عدلی پاشا کا بھی حامی اور ناقد تھا۔ یہ مزاج سیاست کے ناموافق تھا جس میں اپنی پارٹی کی زور شور سے موافقت کرنی پڑتی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ یہ مزاج علمی ہے جو ہر چیز کو پرکھ کر

اس پر حکم لگاتا ہے ۔ میں نے نہ تو دوسروں کی طرح اس کی راہ میں تکالیف برداشت کیں اور نہ ہی کوئی فائدہ اٹھایا ۔

میں نے محکمہ قضاء میں چار سال گزارے ۔ ایک سال قویسنا میں ۔ دوسرا سال طوخ[1] اور دو سال ازبکیہ[2] میں ۔ ساتھ ہی محکمہ قضاء مجھے اچھا نہ لگا ۔ میں تو خانہ بربادی دیکھ رہا تھا ۔ خانہ آبادی دیکھنے کا موقع نہ ملا ۔ بیوی شوہر سے نان و نفقہ کی طالب ہوتی ۔ شوہر بیوی کی اطاعت گزاری کا خواہاں ہوتا ۔ نوے فیصدی مقدمات اسی قسم کے تھے ۔ کبھی شوہر پر نان و نفقہ ڈال دیا جاتا اگر وہ نہ دے سکتا تو قید کر دیا جاتا ۔ کبھی بیوی کو شوہر کی فرماں برداری اور اطاعت گزاری کا حکم دیا جاتا ۔ میں بیوی کو شوہر کی فرماں برداری کا حکم طوعاً و کرہاً دیتا بھلا اس کو پولیس کی مدد سے میکے سے لے جا کر شوہر کے گھر کیوں کر رکھا جا سکتا ہے اور کیا یہ ازدواجی زندگی کہلائے گی ؟

مالی احکام کے اجراء میں پولیس کی مداخلت تو سمجھ میں آ سکتی ہے جیسے قطعہ اراضی کی بازیافت ۔ محکوم کا جیل میں رکھنا سزائے قتل کی تعمیل وغیرہ لیکن ایک عورت کو اس کے خاوند کے گھر پولیس کی مدد سے جبراً آباد کرنا میری سمجھ سے باہر تھا ۔ میں یہ احکام تقلیدی طور پر دیا کرتا تھا لیکن میرا ضمیر ان سے غیر مطمئن رہتا ۔ میری مثال اس مریض کی تھی جو کڑوی دوائیں پیتا ہے ۔ باقی مقدمات بھی اسی قسم کے تھے ۔ ایک عورت کے دو شوہر دعوے دار ہوتے ، ایک عرفی طور پر اور دوسرا رسمی طور پر ۔

---

۱ ۔ طوخ : مغربی مصر کا ایک شہر ۔ آبادی پچیس ہزار کے قریب ۔

۲ ۔ ازبکیہ : مغربی مصر کا ایک شہر ۔ آبادی پچیس ہزار کے قریب ۔

بیوی کو شوہر نا پسند کرتا تو وہ طلاق کا دعویٰ دائر کر دیتی وغیرہ وغیرہ ۔ مقدموں کی اکثریت اسی قسم کی تھی ۔ ان جھگڑوں نے مصری خاندانوں کی اجتماعی زندگی سے واقفیت بہم پہنچائی ۔ اس سے پہلے تو میں ان مظاہرات سے بالکل نا واقف تھا ۔ حاکم کے سامنے ان گھریلو جھگڑوں کو لے جانا ایک قسم کی عار سمجھا جاتا تھا ۔ غریب طبقہ اس قسم کے مقدمات میں پیش پیش رہتا تھا لیکن اب متوسط اور امیر طبقے کو بھی اس سے باک نہ رہا ۔ میں وکیلوں کو زیادہ بولنے نہ دیتا بلکہ فریقین کی اصالتاً حاضری پر مصر رہتا ۔ ہر ایک کے بیانات بڑے سکون سے سنتا اور جھگڑے کی اصلی وجہ جاننے کی کوشش کرتا جس کو وکیل فراموش کرنے کے عادی ہیں ۔ یہ بھید پا لیتا تو فریقین میں صلح صفائی کرا دیتا ۔ اگر نباہ کی کوئی صورت نہ ہوتی تو علیحدگی کرا دی جاتی یا نصیحت آموزی سے جھگڑا رفع دفع کرا دیا جاتا کہ میاں بیوی سسرال یا میکے سے دور رہیں ۔ مجھے فیصلہ دینے کی مشق ہو گئی تھی ۔ فیصلہ تو دعویٰ سننے کے بعد دیا جا سکتا ہے اور یہ سمجھ طرفین کے بیانات سمجھنے کے بعد آتی ہے اور فیصلہ مقدمہ کی مختلف جہات سمجھنے کے بعد دیا جا سکتا ہے ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معقول اسباب پر رائے قائم کی جائے ۔ یہ سب منطقی اور عملی سبق تھے جو درس و تدریس اور دوسری ملازمتوں سے حاصل نہیں ہو سکتے ۔ ان چار سالوں میں رات اور دن میرا ذہن مقدمات کی تحلیل ، فیصلہ کے لیے سوچ و بچار اور اس کے اسباب میں اٹکا رہتا جس سے میری ذات پر گہرا اثر پڑا ۔

ان دنوں عائلی زندگی کا علمی مطالعہ کرنا چاہا ۔ اس کے لیے بہت سی انگریزی کتابیں جمع کر لیں اور ان کی آراء کو مصری عائلی زندگی پر منطبق کرنا چاہا اور شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کے متعلق

اعداد و شمار اکٹھے کر لیے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس کام کو میں پایہء تکمیل تک نہ پہنچا سکا ۔

محکمہء قضاء میں انگلش لیڈی کا فرمان ''یاد رکھنا کہ تم ہمیشہ جوان ہو'' بالکل بھول گیا بلکہ مجھے اپنا بوڑھا ہونا ہمیشہ یاد رہا ۔ قضاء شرعی تو جلال ، وقار اور آہستہ روی کی طالب تھی اس کے علاوہ قاضی کو دینی رہنما بھی سمجھا جاتا تھا ۔ اُس کے لیے لازم تھا کہ وہ قہوہ خانے میں نشست و برخاست سے اجتناب رکھے جہاں کہ شراب نوشی اور جوئے بازی ہوتی ہے ۔ جب لوگوں میں بیٹھے تو دینی گفتگو کرے یہ نہ سہی تو ہنسی مذاق بالکل نہ کرے ۔ میں قویسنا میں قاضی تھا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا ۔ سرکاری ڈاکٹر نے مجھے دوسرے عہدہ داروں کے ساتھ رات کے کھانے پر بلایا تھا ۔ بعض دوسرے آدمی بھی مدعو تھے جن کی نسبت مجھے معلوم تھا کہ وہ شراب نوشی کے عادی ہیں ۔ میں نے ڈاکٹر کے ہاں جانے میں دیر کی کہ وہ ناؤ و نوش سے فارغ ہو لیں ۔ میں گیا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ پہلے سے موجود ہیں ۔ میں نے نوکر کا انتظار کیا لیکن وہ نہ آیا ۔ آخرکار جب میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ شراب کا دور چل رہا ہے ۔ اس پر حاضرین گھبرا سے گئے اور شرمندہ بھی ہوئے ۔ مجھے بھی شرمساری ہوئی ۔ وہ اپنے جام دسترخوان کے نیچے چھپانے لگے اس پر اُن کا اضطراب اور میرا شک اور بڑھا ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا کر معذرت کر دی کہ مجھے ایک ایسا کام درپیش ہے جس کی وجہ سے میری حاضری گھر میں ضروری ہے اُس نے دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کے لیے اصرار کیا تا کہ دسترخوان صاف کر دیا جائے لیکن میں واپس آ گیا اور میرا واپس

آنا ہی مناسب تھا ، اگر میں دوسرے مدعوین کے ساتھ بیٹھ جاتا تو فوراً مشہور ہو جاتا کہ میں شراب کا رسیا ہوں اس طرح میرے دینی ، خلقی اور قضائی منصب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا ۔

—:o:—

۲۰

والد کی وفات

میں قویسنا میں قاضی تھا کہ میرے والد نے نوے سال کی عمر میں ایک آپریشن کے بعد وفات پائی ۔ گزشتہ چالیس سال سے وہ فتق (فوطہ بڑھ جانے کی بیماری) میں مبتلا چلے آئے تھے ۔ اس مرض کی وجہ سے وہ چمڑے کی پٹی استعمال کرتے ۔ صبح پہن لیتے اور شام کو اتار کر رکھ دیتے ۔ اس تکلیف کو انھوں نے صبر سے برداشت کیا تھا ۔ بعض دفعہ آنتیں باہر نکل آتیں جس کی وجہ سے پٹی باندھنی پڑتی ۔ اُن کی ترش روئی کا سبب ایک حد تک یہی بیماری تھی ۔ دوسری وجہ امساک کی پرانی بیماری تھی جس سے گاہے گاہے چڑچڑے اور زود رنج ہو جاتے تھے ۔ وہ کام کاج کی وجہ سے علیحدگی پسند بھی تھے ۔ یہ امراض بڑھتے گئے لیکن انھوں نے کسی اچھے ڈاکٹر سے طبی معائنہ کرانا پسند نہیں کیا ۔ جب میں بڑا ہوا تو اُن کو ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا ۔ اُس نے مشورہ دیا کہ اس وقت جبکہ وہ بھرپور جوان ہیں آپریشن کرا لینا چاہیے بعد میں آپریشن کامیاب نہ رہ سکے گا لیکن وہ نہ مانے اور بیماری بڑھتی گئی ۔ میری غیر حاضری کا فائدہ اُٹھا کر دوسری یا تیسری مرتبہ پھر ڈاکٹر کے پاس گئے ۔ وہ اُن کا شاگرد رہ چکا تھا ۔ آپریشن ہوا تو گھر میں کسی کو پتہ نہ تھا ۔ میں قویسنا میں قاضی تھا تو مجھے اچانک تار ملا ۔ میں گھبرا کر مصر آیا اور اُن کی عیادت کو گیا ۔ ڈاکٹر نے اطمینان دلایا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے لیکن دوسرے دن

پھیپھڑے کی سوزش نے آ گھیرا اور دو گھنٹوں کے بعد وہ انتقال کر گئے ۔ اُس وقت میں اُن کے پہلو میں تھا ۔ مجھے والدہ اور ہمشیرگان سے حسنِ سلوک کی وصیت کی اور میرے حق میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میرا مددگار رہے ۔

اس طرح یہ زندگی جو متواتر جد و جہد سے بھرپور اور علم و روزی کی طلب میں کوشاں رہتی تھی ، اختتام کو پہنچی ۔ والد ہمیشہ مطالعہ میں لگے رہتے یا کسی کتاب کی نقل کرتے رہتے ۔ درس و تدریس یا کتابوں کی تصحیح سے اُن کی روزی قائم تھی ۔ یہ مشغلہ اُن سے بیماری یا کسی حادثے کی وجہ سے نہ چھوٹتا ۔ نہایت دیندار تھے ۔ نماز ، قرآن یا حدیث کی تلاوت میں مشغول رہا کرتے ۔ عزیزوں اور قریبی رشتہ داروں میں جو لوگ غریب اور نادار ہوتے ان کی زکوٰة سے مدد کرتے ۔ روزے کے پابند تھے ۔ حج بھی کیا تھا ۔ رات کو اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھتے اور عاجزی سے توبہ استغفار کیا کرتے تھے ۔ روزی بقدر کفاف کماتے ۔ پس انداز کرنے کے قائل نہ تھے ۔ موت کا ذکر کیا کرتے ۔ دنیا کی کم مائیگی اور بے وقعتی کا تذکرہ کرتے رہتے ۔ انھوں نے اپنی قبر بھی تیار کرا رکھی تھی ۔ تبرک کی خاطر وہاں جا کر قرآنِ پاک کی تلاوت کیا کرتے ۔ دنیا کی زینتوں اور آرائشوں کی طرف رغبت نہ تھی ۔ کسی محفل میں تشریف لے جاتے تو عمدہ لباس پہنتے لیکن واپس آ کر جلد ہی اتار کر رکھ دیتے اور کہتے کہ دنیا کی زندگی تو کھیل و تماشا اور زیب و زینت ہے پھر کلامِ پاک کی تلاوت میں مصروف ہو جاتے ۔

برادری میں اُن کا احترام تھا کیونکہ وہ بزرگ اور دیندار تھے ۔ جب راستے سے گزرتے تو لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ۔ امیر و غریب طلاق اور میراث کے مسائل میں فتویٰ لینے

آتے ۔ لوگ ان سے گھر میں دینی درس کے خواہاں رہتے ۔ عیدوں اور دوسرے تہواروں پر تحائف بھیجتے ۔

کھانے ، پینے اور پہننے کے معاملے میں حد درجہ سادگی پسند تھے جو کچھ سامنے آتا بلا تکلف تناول کر لیتے ۔ چٹائی پر لیٹتے اور سادہ لباس پہنتے ۔

بچوں کے معاملے میں سخت گیر تھے ۔ خرچ بقدرِ ضرورت دیتے تاکہ وہ بگڑ نہ جائیں ۔ پڑھائی میں سختی کرتے ۔ حفظِ قرآن ، متون اور دوسرے اسباق کا امتحان لیتے رہتے ۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو لاحول و لا قوۃ پڑھ کر ناراض ہو جاتے اور پٹائی کرتے ۔ ہم ہر روز ان سے نیا سبق لیتے یا پڑھے ہوئے کا امتحان دیتے ۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی بھی ہمارے سامنے ہنسے ہوں ۔ وہ گھر سے غیر حاضر ہوتے تو ہم تھوڑا بہت ہنسی مذاق کر لیتے ۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے ۔ بڑی لڑکی کو تعلیم کی خاطر مدرسۃ السیوفیہ بھیجا کرتے تھے ۔ یہ اس وقت مصر میں لڑکیوں کی اکیلی تعلیم گاہ تھی جبکہ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو ناقابلِ معافی گناہ تصور کرتے تھے ۔

ان کی دنیا ازہر ، مسجد ، کتابیں اور ان کے دوست احباب تھے ۔ سیاست ، اجتماع ، اقتصاد اور دوسرے دنیوی معاملات سے انہیں کچھ سروکار نہ تھا ۔ وہ اخبار بینی کے بھی عادی نہ تھے ، جو لوگ عوامی مسائل کے متعلق گفتگو کرتے اُن سے وہ ربط نہ رکھتے تھے ۔ دیہات سے محبت رکھتے تھے ۔ بعض دن مجھے گدھے پر سوار کر کے جزیزہ یا جیزہ چلے جاتے اور دن کسی درخت کے سائے میں یا نہر کے پاس یا نیل کے کنارے گزارتے لیکن کتاب ساتھ رہتی ۔ پھر واپس چلے آتے ۔ یہی تمام تر اُن کی ورزش تھی ۔ اگر گدھا نہ ہوتا

تو پیدل کویری کی طرف چلے جاتے - جزیزہ کے کسانوں میں آن کے دو دوست بھی تھے - مجھے ساتھ لے کر آن سے ملنے جایا کرتے تھے - تربوز کا موسم ہوتا تو وہاں جا کر دو تین دن دریائے نیل کے کنارے گزار آتے - رات کو کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہتے گویا وہ زمین سے محرومی کا بدلہ سیر و تفریح سے اتارنا چاہتے تھے - بہت ذہین تھے - کتب ازہریہ خوب سمجھتے تھے - ادبی اور تاریخی کتابیں بھی کبھی کبھی دیکھ لیا کرتے تھے - شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے - وزن اور قافیہ میں دوسرے شاعروں کی نقل کر کے معانی چن لیا کرتے تھے جس کی وجہ سے شعر پر تکلف اور روح سے خالی ہوتے - میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ وسائل کے ہوتے ہوئے انھوں نے کبھی کسی قسم کی تصنیف یا تالیف کا ارادہ کیوں نہیں کیا -

اولاد پر سخت گیر ہونے کے باوجود وہ رحم دل تھے - ان کی شفقت کا اس وقت ظہور ہوتا جب ہم بیمار پڑ جاتے - کوئی مر جاتا تو آس کے مرنے پر بے اندازہ رنج و غم کا اظہار کرتے -

مجھے مطیع و فرماں بردار دیکھ کر دوسرے بھائیوں سے زیادہ میری تعلیم کی طرف توجہ کرتے - پرائمری مدرسے سے لے کر مدرسۃ القضاء تک میری تعلیم ان کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے - اگر وہ نہ ہوتے تو ازہر کے مشکل امتحانات میں میرا کامیاب ہونا مشکل تھا - انھوں نے اپنے طرزِ تعلیم سے ان کتابوں کو میرے لیے بے حد آسان کر دیا تھا - میں نے تعلم کے حصول میں صبر اور مشقت کی عادت ان سے پائی تھی - سادہ طرزِ بیان اور بیان کی صفائی ان سے سیکھی - ان کی لائبریری میں ادب اور تاریخ کی کتابیں تھیں جن کی وجہ سے مجھ کو بھی ادب اور تاریخ سے شغف رہا - مختصر طور پر میں نے اپنے عیوب و محاسن ان سے ورثہ میں پائے ہیں - مدرسۃ القضاء

میں داخل ہونے اور ان کی قید سے نکلنے کے بعد ہی ان کے علم و فضل کا قائل ہو سکا ۔ ڈر اور خوف ، محبت اور احترام میں بدل گیا ۔ دو لڑکوں کے مرنے کے بعد مجھ پر زیادہ شفقت کرنے لگے تھے ۔ مجھے راضی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ۔ مالی معاملات میں بھی مجھے کار مختار بنا دیا تھا اور سوائے دینی مصروفیات کے ان کو کسی چیز سے کوئی سروکار نہ رہا تھا ۔

آن کے مرنے پر میں نے دلی رنج اور ایسا خلا محسوس کیا جس کے پر ہونے کی کوئی امید نہیں ۔

سن ۱۹۲۵ء میں والد کی وفات کے تھوڑی دیر بعد میرے روحانی باپ عاطف برکات نے وفات پائی ۔ آن کے مرنے کا غم اتنا ہوا جتنا باپ کے مرنے کا تھا ۔ آن کے لحد میں آتارنے کے وقت میں غم و حزن کی تصویر بنا ہوا زار و قطار رو رہا تھا ۔ آن کے عزیز و اقرباء میری حالت دیکھتے اور مجھ پر رحم کھاتے ۔ آنھوں نے میری روحانی تربیت کی تھی ۔ میں نے اپنی عمر کے ۱۹ سال ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک ، ان کی معیت میں بطور شاگرد اور آستاد گزارے تھے ۔ مدرسہ سے نکلنے کے بعد وہ سیاست میں منہمک ہوکر مصری وفد میں شامل ہو گئے تھے ۔ جلا وطنی کا زمانہ انھوں نے سیشل میں گزارا ۔ جب سعد پاشا نے وزارت بنائی تو یہ وزارت معارف کے وکیل (سیکریٹری) بنا دیے گئے اور جلد ہی وزارت کے تمام امور پر حاوی ہوگئے ۔ انھوں نے مجھے محکمۂ تعلیم میں انسپکٹری کی پیش کش بھی کی جسے میں نے منظور نہ کیا ۔ پھر آنھوں نے لا کالج میں شریعت اسلامیہ کی پروفیسری پیش کی جسے میں نے منظور کر لیا ۔ میں لا کالج کے پرنسپل سے بھی ملا اور اپنے اسباق بھی معلوم کر لیے لیکن عاطف برکات جلد ہی انتقال کر گئے اس طرح یہ تجویز بھی دھری کی

دھری رہ گئی ۔ وزارت معارف میں اُنھیں شامل ہوئے دیر نہ گزری تھی کہ سر میں سرطان کی بیماری نے آ لیا ۔ اس مرض سے اُنھوں نے بے حد تکلیف اُٹھائی ۔ میں طالب علمی سے اُن کا منظور نظر رہا تھا ۔

علم الاخلاق کے درس میں اُن کے ساتھ رہتا اور دوپہر کا وقت اُن کے گھر گزارتا ۔ جب وہ جمعرۃ جلاوطن کر دیے گئے تھے تو میں وہاں جا کر کئی دن اُن کے پاس گزار آتا ۔ میشل سے اُن کے خطوط آتے رہتے ۔ ایک دفعہ مجھے اپنا فوٹو بھی بھیجا تھا ۔ جب وہ بیمار پڑے تو کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہ تھی سوائے دو آدمیوں کے جن میں میں بھی شامل تھا ۔ میں اُن سے برابر استفادہ کرتا رہتا ۔

اُن کی بڑی خصوصیات ، قوت تحلیل ، اسلامی فکر ، آزادی رائے اور پر زور استدلال تھیں ۔ اُن میں عمل سے زیادہ فکری آزادی تھی ۔ مخالف کی رائے کشادہ دلی سے سنتے ۔ اصلاحی کاموں میں معتدل روش اختیار کرتے ۔ حالات کا اندازہ کرکے ڈرتے ہوئے کام کرتے ۔ فرض کی ادائیگی اُن کی بڑی خوبی تھی ۔ عین انصاف سے کام لیتے اگرچہ تکلیف برداشت کرنی پڑے ۔ مجاملت اور جھوٹے وعدے سے خوش ہو جاتے ۔ ڈسپلن (نظم و ضبط) کے دلدادہ تھے ۔ کانٹ[1] کا ذکر کرتے رہتے کہ وہ اپنے کاموں کو خود کر لیا کرتا تھا ۔ وقت کے نہایت پابند تھے حتیٰ کہ لوگ اُن کے نکلنے کے وقت اپنی گھڑیاں درست کر لیا کرتے تھے ۔ قول کے سچے تھے ، کسی شاگرد یا اُستاد نے اُنھیں کبھی بھی جھوٹا نہیں کیا ۔ اُنھوں نے ایک دفعہ مجھے انگلستان میں اپنی تعلیم کا واقعہ سنایا تھا ۔ وہ ایک کمرے میں بیٹھے سیگریٹ پی رہے تھے جہاں سیگریٹ پینا ممنوع تھا ۔ جب وہ

---

۱ ۔ ایمل کانٹ : (۱۷۹۸ - ۱۸۵۷ع) مشہور فلاسفر ۔

سیگریٹ پی چکے تو مدرسہ کا انسپکٹر آ پہنچا اور کہنے لگا کہ مجھے تو اس کمرے سے سیگریٹ پینے کی بو آ رہی ہے - کس نے سیگریٹ پیا ہے ؟ عاطف بک خاموش رہے - اُس نے دوبارہ پوچھا عاطف بک پھر بھی چپ رہے - جب انسپکٹر باہر چلا گیا تو حاضرین نے عاطف بک کو حقارت سے دیکھا - اُس وقت انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کر لیا کہ وہ آئندہ جھوٹ نہ بولیں گے - وہ مرد کامل تھے - فضول باتوں سے نفرت کرتے - جب کسی سے بات کرتے تو اُس کی عقل اور سمجھ کے مطابق کرتے لہٰذا لوگ اُن کی عزت کرتے تھے -

اُن میں ایک عیب تھا ، وہ یہ کہ اُن میں مجاملت کی کمی تھی - جہاں کہ حق کی حمایت میں صاف گوئی کی ضرورت نہ ہوتی اُن کی بےباکی اور صاف گوئی نقصان دہ ہوتی - پھر اُن کا قاعدہ اور قانون بھی فوجی قسم کا تھا جس میں آرام کی گنجائش نہ تھی - اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت نازل کرے - مجھے اُن کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا -

——:o:——

۲۱

جامعۂ مصریہ

مصرِ جدید میں ایک دفعہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی - میں اس وقت ۱۹۲۶ع میں ازبکیہ[1] میں قاضی تھا - ٹیلیفون پر میرے دوست ڈاکٹر طہٰ حسین[2] بول رہے تھے - انھوں نے مجھے ملنے کے لیے بلایا تھا - جب میں ملنے گیا تو انھوں نے جامعۂ مصریہ میں آرٹس کالج کی پروفیسری پیش کر دی - پہلے تو میں سوچ میں پڑ گیا پھر محکمۂ قضاء سے نفرت اور درس و تدریس سے شغف کی بنا پر یہ پیش کش منظور کر لی - اس وقت یہ کالج قصر الزعفران میں تھا - میں اس کالج کو دیکھنے گیا تو اس کو ایک نئی چیز پایا - یہ کالج ازہر یا مدرسۃ القضاء جیسا نہ تھا - اس کے اساتذہ دنیا بھر سے تعلق رکھتے تھے ، کوئی انگریز تھا تو کوئی فرانسیسی ، بلجمی اور جرمن تھا - استادوں کی قلیل سی تعداد مصری تھی ، سوائے میرے کوئی بھی عمامہ پوش نہ تھا - کالج کا پرنسپل بلجیمؔ کا رہنے والا تھا - طلبہ آزاد منش تھے ، درس میں شامل ہوتے یا نہ ہوتے - کالج کے کئی شعبے تھے - فلسفے کے شعبے کا صدر فرانسیسی تھا - انگریزی ادب کا استاد انگریز تھا - لغات قدیم ، تاریخ اور جغرافیہ کے پروفیسر

---

۱ - ازبکیہ : مصر کا ایک شہر جس کی آبادی پچیس ہزار کے قریب ہے -

۲ - ڈاکٹر طہٰ حسین : (المولود ۱۸۸۹ع) مصرِ جدید کے مشہور ادیب ، نقاد اور سابق وزیرِ تعلیم -

علیحدہ علیحدہ تھے ۔ طلبہ کی الگ تقسیم تھی ۔ لاء کالج میں داخلہ لینے کے لیے بہت سے طلبہ آرٹس کالج میں ایک سال گزارتے ۔ میں نے یہ معاملہ سمجھنے کے لیے ایک مدت گزاری لیکن سارے نظام کو غیر مربوط اور منتشر پایا ۔ طلبہ کا طلبہ سے اور استادوں کا استادوں سے کسی قسم کا ربط و ضبط نہ تھا ۔ مدرسۃ القضاء جیسی بات نہ تھی ۔ تعلیم بھی غیر منظم تھی ۔ درس کی مختلف قسمیں تھیں اور اساتذہ بھی مختلف جنسوں کے تھے جس سے کالج کے نظام میں ابتری پیدا ہوگئی تھی ۔ میرے دل میں یہ خیال آتا کہ میں نئے ازہر میں ہوں لہذا اس انتظام سے بڑی دیر بعد مانوس ہوا ۔ پہلے ہفتے میں مجھے معلوم کرکے افسوس ہوا کہ پرنسپل اور اساتذہ میں کوئی تعاون نہیں ۔ اس کے بعد بعض استادوں اور طلبہ کی جانب سے عرضداشت آئی جس میں پرنسپل پر اعتماد ظاہر کیا گیا تھا ۔ اس عرضداشت پر میں نے دستخط نہیں کیے کیونکہ اعتماد کے لیے واقفیت ضروری ہے اور میری ان سے واقفیت نہ تھی ۔ کالج کا انتظام ایک مجلس کے ہاتھ تھا اور میں مجلس کا ممبر نہ تھا کیونکہ پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسر ہی اس مجلس کا ممبر ہو سکتا تھا ۔ عرضداشت پر دستخط کرنے سے انکار پرنسپل کی ناخوشی کا موجب ہو سکتا تھا ۔ آہستہ آہستہ کالج کے ماحول سے میں مانوس ہوگیا ۔ طلبہ سارے کے سارے لڑکے تھے ۔ ان میں کوئی بھی لڑکی نہ تھی ۔ ایک دفعہ فرانسیسی شعبہ میں تین لڑکیاں دیکھیں ۔ پتہ چلا کہ وہ آدھی مصری ہیں ۔ ان کا باپ مصری ڈاکٹر تھا اور والدہ جرمن ۔ میں نے دل سے پوچھا کہ کیا میرے جیتے جی مصری لڑکیاں بھی داخل ہو سکیں گی ؟ لیکن زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ کالج لڑکیوں سے بھر گیا ۔

اس طرح میں نے کتب فقہ کو چھوڑ کر لغت ، ادب اور نحو

کی کتابوں کی پناہ لی ۔ پہلے سال دو اسباق میرے ذمہ تھے یعنی مبرد[1] کی الکامل اور علمِ بلاغت کی تدریس ۔ شروع سے مجھے علم بلاغت سے بے رغبتی رہی ہے ۔ انگریزی کتابوں کی لائبریری میں جا کر میں علم بلاغت کی کتابوں کو تلاش کرتا ، ان کے اصولوں کا عربی علم بلاغت سے موازنہ اور مقابلہ کرتا ۔ بڑی جماعت کے طلبہ کو میں پڑھانے سے گھبراتا خاص کر لاء کالج کے طلبہ کو ، کیونکہ مجھے خیال تھا کہ میں ایسے ماحول میں تعلیم دے رہا ہوں جہاں میرے اور طلبہ کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی اُن کی نگرانی ہو سکتی ہے ۔ نہ اُن سے تبادلۂ خیالات و جذبات ہو سکتا ہے اور نہ کثرتِ تعداد کی وجہ سے میں اُن کو سمجھا سکتا ہوں ۔ اس طرح میں نے اس درس سے بہت جلدی چھٹکارا حاصل کر لیا ۔

دوسرے سال میرے اور ایک دوست ڈاکٹر سنہوری[2] کے درمیان ایک بحث شروع ہوگئی ۔ ایک دن کہنے لگے کہ تم عمامہ پہننے پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہو ۔ یہ عمامہ تو دیندار آدمی کی نشانی ہے اور تم دنیا دار ہو ۔ تم تو عربی زبان و ادب کے استاد ہو جس طرح فرانسیسی زبان و ادب کے دیگر استاد ہیں اور پھر ہیٹ پوشوں کے مجمع میں تم عجیب و غریب معلوم ہوتے ہو ۔ میں اس بات کو دیر تک سوچتا رہا ۔ عمامہ سے مجھے محبت تھی اور لوگ بھی مجھے عمامہ پوش دیکھ کر مانوس سے ہوگئے تھے ۔ نئی تبدیلی سے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی ۔ اُن کا اصرار بڑھتا ہی رہا آخر میں اُن کا ہم رائے ہوگیا ۔ اس عمامہ پوشی سے میں بعض اوقات تکلیف بھی محسوس کرتا

---

۱ ۔ امام مبرد : جن کی کتاب الکامل عربی ادب کی مشہور کتاب ہے ۔
۲ ۔ ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری سابق وزیر تعلیم مصر ۔

تھا ۔ عام لوگ ظاہری طور پر عمامہ کی عزت کرتے تھے لیکن اس سے زیادہ ٹوپی اور ہیٹ سے مرعوب تھے اور پگڑی کا مذاق اُڑایا کرتے تھے ۔ اس کا مبداء ان کے دل کی گہرائیوں میں موجود تھا ۔ ان کی نظروں میں ہیٹ معزز اور عمامہ مقہور تھا ۔ مجھے کئی واقعات پیش آئے تھے جن کی وجہ سے میں بھی عمامہ سے نفرت کرنے لگا تھا ۔ ایک دفعہ میں ایک ہوٹل میں گیا تو ہوٹل کے مالک نے کہہ دیا کہ ہمارے ہاں کوئی جگہ نہیں ، لیکن ہیٹ والا آ گیا تو اس کے لیے فوراً جگہ مہیا کر دی ۔ دوسری دفعہ ڈاک خانے گیا اور جنگلہ کے سامنے جا کھڑا ہوا ۔ ایک ہیٹ والا میرے بعد آیا تھا ۔ ڈاکخانے والے نے اس کا کام پہلے کر دیا اور میں بگڑتا رہ گیا ۔ تیسری دفعہ ٹرام میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھنے لگا تو کنڈکٹر نے سیکنڈ کلاس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا ، چوتھی دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم تھیٹر دیکھنے کازینو گئے جو اسکندریہ کے مضافات میں سے ہے ۔ میرے ساتھ ہیٹ پوش دوست بھی تھے ان کو داخل کر لیا گیا اور مجھے روک دیا اس پر میں بہت ہی شرمندہ ہوا ۔ میرے دوست کی رائے درست معلوم ہوتی تھی ۔ میں بزاز کے پاس گیا اور دو سوٹ اور ایک ہیٹ خرید لایا ۔ پرانے لباس کو چھوڑ کر ستائیس سال بعد نیا لباس پہنا مجھے نکٹائی لگانی نہ آتی تھی ۔ یہ میرے ایک شاگرد نے لگانی سکھائی ۔ چھٹیوں کے بعد کالج کھلا تو میں انگریزی ٹوپی پہن کر گیا ۔ راستہ اور کالج میں شرم سے لڑکھڑاتا تھا ۔ کوئی تو اس جدید لباس کو دیکھ کر خوش ہوتا اور کوئی برا سمجھتا ۔

میرے ایک دوست کی انگلش بیوی تھی ۔ کہنے لگی میں تو تمھاری عمامہ پوشی کو پسند کرتی ہوں ۔ میں نے جواب دیا تم سچ کہتی ہو ۔ تم عمامہ کو اس طرح پسند کرتی ہو جس طرح قاہرہ کے

قدیم محلوں کو ۔ اس طرح میں بھی یونیورسٹی میں گھل مل گیا ۔
دریں اثنا میں نے معلوم کیا کہ جو چیز جامعہ کو دوسرے مدارس سے ممتاز کرتی ہے وہ طریقِ بحث ہے ۔ مدرسہ میں کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور جامعہ میں نئے نتائج کے استنباط کی ، مدرسہ میں انتہائی علم کی تعلیم دی جاتی ہے اور جامعہ میں نامعلوم شے کی دریافت کی ۔ جامعہ میں علم کا ناقدانہ مطالعہ کیا جاتا تھا ۔ قدیم علوم کی جگہ نئے علوم لے رہے تھے ۔ ایک رائے کالعدم قرار دی جاتی تھی اور نئی رائے قائم کی جاتی تھی ، یہ اُس کا اولین اور آخرین مقصد تھا ۔

مختلف غیر ملکی اساتذہ کی جدید بحثوں سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا ۔ جامعہ کے بعض مستشرقوں کی صحبت سے اُن کے کام کا اندازہ ہوا لیکن بہت کم مصری اساتذہ اُن کی تقلید کرتے تھے ۔ اُن کا راستہ ہی الگ تھا ۔ اس سال میں بھی بحث و تحقیق میں قسمت آزمائی کرنے لگا ۔ میں نے علم اللغۃ اور کتب اللغۃ کا انتخاب کیا ۔ علمِ لغت کی کس طرح نشو و نما ہوئی ۔ کلمات کے جمع میں اُس کا کیا طریقہ رہا ۔ اُس کی عہد بعہد ترقی اور اسالیب کی تبدیلی ، اغلاط کی نشاندہی اور ایک جدید لغت کی تالیف کی ضرورت وغیرہ ۔ اس میں ایک سال لگ گیا ۔ اس کی ایک مختصر بحث عکاظ[1] اور مربد[2] پر تھی ، جس طرح ادب کی کتابوں میں ان کا ذکر آیا تھا ، پھر زبان و ادب پر ان کے اثرات کو دکھایا تھا ۔

یہ ایک بڑے وسیع پروگرام کی تمہید تھی ۔ ہم تینوں نے یعنی

---

۱ ۔ عکاظ : زمانۂ جاہلیت میں مکہ میں ایک بازار لگتا تھا ۔
۲ ۔ مربد : بصرے کی ایک منڈی جہاں کہ خرید و فروخت ہوا کرتی ہے ۔

ڈاکٹر طہٰ حسین[1] ، استاد عبد الحمید العبادی[2] اور میں نے ایک منصوبہ بنایا ۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کے عہد رسالت سے لے کر موجودہ زمانہ تک تین جہتوں سے مطالعہ کیا جائے ۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اسلام کی ادبی ، استاد عبادی نے تاریخی اور میں نے عقلی زندگی کا موضوع پسند کیا ۔ میں حصۂ اول جس کا نام فجر الاسلام ہے ، کی تیاری میں مصروف ہو گیا ۔ اس تیاری میں کم و بیش دو سال لگ گئے ۔ پہلے اس کا خاکہ بنایا اور عنوانوں کو مرتب کیا ۔ میں موضوع کی تلاش میں مختلف کتابیں دیکھتا اور غور کرتا پھرا ۔ نصوص سے دلائل کو مضبوط کرکے لکھتا جن کو مطالعہ کے وقت جمع کر لیا ہوتا ۔ اس کے بعد دوسرے موضوع کو اختیار کرتا ۔ کالج میں پانچ ماہ کی تعطیل ہوا کرتی تھی اس کا خوب فائدہ اٹھا کر کتابیں جمع کر لیتا اور دو تین دفعہ کرکے ان کو گھر اٹھا کر لے جاتا ۔ میں آٹھ بجے صبح کرسی پر جا بیٹھتا اور ایک بجے دوپہر تک کتابوں سے نصوص تلاش کرتا اور ان سے انتخاب کرکے لکھنا شروع کر دیتا ۔ اس اثناء میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ۔ جس دن جامعہ میں میرا وقت خالی ہوتا تو یہی کام کرتا رہتا یہاں تک کہ کتاب کا پہلا حصہ ۱۹۲۸ء میں تمام ہو گیا ۔ لوگوں نے کتاب کی خوب پذیرائی کی اور اس پر بہت اچھا نقد و تبصرہ کیا ۔ اس سے مجھے حوصلہ ہوا کہ باقی حصوں کو بھی لکھ کر پورا کر دوں ۔ میرے دونوں رفقاء اپنے اپنے حصے کی تکمیل بعض رکاوٹوں کی وجہ سے نہ کر سکے لیکن میں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور ضحی الاسلام کے نام سے

---

۱ ۔ ڈاکٹر طہٰ حسین : زمانۂ حال کے مشہور مصری ادیب ، نقاد اور سابق وزیرِ تعلیم ۔

۲ ۔ عبدالحمید العبادی : سابق استادِ تاریخ جامعۂ مصریہ ۔

ایک کتاب تین جلدوں میں شائع کر دی ۔ اس کی تالیف میں ایک قدم آگے بڑھایا ۔ صرف عنوان ہی تین جزوں میں آئے تھے ۔ کاغذوں کے لفافے لے کر میں موضوع کا نام لکھ لیتا ۔ ایک پر معتزلہ لکھا ہوتا ۔ دوسرے پر خوارج اور تیسرے پر کنیزوں کا ادب پر اثر وغیرہ ۔ میں نے ان موضوعات پر امہات کتب مثلاً آغانی[۱] ، جاحظ[۲] کی کی الحیوان ، ابن قتیبہ[۳] کی کتابیں ۔ جاحظ کے رسائل اور ابن المقفع[۴] کی تصانیف جمع کر کے ان تمام کو پڑھا ۔ جب کوئی عبارت یا بیان معتزلہ[۵] کے متعلق پڑھتا تو ایک زرد کاغذ پر اس کا خلاصہ اور صفحہ کا نمبر بقید کتاب لکھ لیتا اور اس کو متعلقہ کاغذوں میں رکھ دیتا ۔ یہاں تک کہ ساری کتاب ختم ہو گئی ۔ یہ صرف تیاری کا دور تھا ۔ جب لکھنے کا وقت آتا تو میں موضوع کے پلندے کو نکالتا ۔ مختلف ٹکڑوں پر نظرثانی کرتا ۔ اُن کو منطقی ترتیب دے کر لکھنا شروع کر دیتا ۔ جب کوئی نیا خیال پیش آتا تو اصل مواد کی طرف رجوع کرتا ۔ اس طرح ایک موضوع ختم کرکے دوسرا موضوع شروع کر دیتا ۔ اس نمونہ پر ضحی الاسلام کے تینوں حصے چھ سال کی مدت

---

۱ ۔ آغانی : ابوالفرج الاصبہانی (المتوفی ۳۵۶ھ) کی ادبِ عربی میں مشہور کتاب ہے جس کو اس نے پچاس برس میں جمع کیا تھا ۔

۲ ۔ جاحظ : (المتوفی ۲۵۵ھ) عربی زبان کا مشہور ادیب اور انشا پرداز ۔

۳ ۔ ابنِ قتیبہ : (المتوفی ۲۷۶ھ) مصنّف ادب الکاتب اور عیون الاخبار وغیرہ ۔

۴ ۔ ابن المقفع : (المتوفی ۱۴۲ھ) مصنّف کلیلہ دمنہ ، ادب الصغیر اور ادب الکبیر وغیرہ ۔

۵ ۔ معتزلہ : اسلام کا ایک عقلیت پسند فرقہ جس نے بعض فکری لغزشوں کے باوجود اسلام کی بڑی علمی اور ادبی خدمت کی ہے ۔

میں شائع ہو گئے ۔ اس طرح میں بھی اسلامیات میں ماہر بن گیا ۔ اس کے علاوہ بعض ادبی کتابیں مثلاً طبقات ابن سلام[1] اور ابن قتیبہ[2] کی الشعر و الشعراء کا بھی مطالعہ کیا ۔

میں نے انگریزی میں ایک کتاب نقد الادب پر پڑھی تھی ۔ یہ موضوع مجھے پسند آیا تو اس کو پڑھانا بھی چاہا ۔ اس موضوع کی تیاری میں انگریزی کتابوں کے علاوہ بعض مشہور عربی کتابیں موازنہ[3] بین ابی تمام و البحتری[3] ، الوساطۃ بین المتنبی و خصومہ[4] اور قدامہ[5] کی نقد الشعر و نقد النثر سے مدد لی ۔ یہ موضوع دو سال تک پڑھاتا رہا اور یادداشتیں تیار کرتا رہا ۔ آرٹس کالج میں نقد الادب پر عربی زبان میں اسباق دینے کی یہ پہلی کوشش تھی ۔

——:o:——

۱ ۔ محمد بن سلام : (المتوفی ۲۳۲ھ) مصنف طبقات الشعراء ۔

۲ ۔ ابن قتیبہ : (المتوفی ۲۷۶ھ) مصنف کتاب الشعر والشعراء ۔ تیسری صدی ہجری کا مشہور ادیب ، محدث اور نقاد ۔

۳ ۔ حسن بن بشر آمدی : (المتوفی ۳۷۰ھ) نے ابو تمام اور بحتری کے شاعری کے محاکمہ میں موازنہ بین ابی تمام و البحتری لکھی ہے جس میں ان دونوں کی شاعری کے معائب و محاسن دکھلائے ہیں ۔ یہ تنقیدی کتابوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے ۔

۴ ۔ الوساطۃ بین المتنبی و خصومہ : قاضی عبدالعزیز الجرجانی (المتوفی ۳۹۶ھ) نے متنبی کی شاعری پر نقد و تبصرہ کیا ہے اور اس کے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔

۵ ۔ قدامہ بن جعفر : (المتوفی ۳۱۰ھ) جس نے نقدِ ادب میں نقد الشعر و نقد النثر دو عمدہ کتابیں لکھی ہیں ۔

۲۲

ترکی کی سیر

جامعہ میں مجھے مصر سے باہر بھی جانے کا سنہری موقع حاصل ہوا - عہد جوانی ختم ہونے تک میں سوائے طنطا ، اسکندریہ اور ریگستانی مضافات کے ، قاہرہ سے باہر نہ جا سکا تھا - بیرون مصر جانے کا تو کبھی خیال تک نہ آیا تھا - ایک دفعہ مجھے پیرس جانے کا موقع ملا تھا - قاہرہ کے ایک رئیس نے اپنے لڑکے کو حصول تعلیم کے لیے پیرس بھیجنا چاہا اور مجھ سے خواہش کی کہ میں اُس کا ٹیوٹر (اتالیق) بن کر اُس کے ساتھ چلا جاؤں - اُس کو وہاں جا کر عربی پڑھاتا رہوں اور خود فرانسیسی زبان اور قانون کی تعلیم حاصل کر لوں - یہ خیال مجھے پسند تو آیا لیکن اس کے ساتھ خطرات بھی تھے - مجھے ناگوار تھا کہ میں پاشا پر بوجھ بن کر اُن کا دست نگر رہوں اور اُس کا لڑکا جب چاہے مجھے تعلیم کے لیے بلائے اور جب چاہے چھوڑ دے - اس کے علاوہ میں نے عاطف بک سے بھی مشورہ کیا - اُنھوں نے انکار کی صلاح دی - ایک دوسرے آدمی نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور پیرس سے بیرسٹر بن کر آیا اور محکمۂ شرعیہ میں سرکاری وکیل لگ گیا - اگر میں بھی یہ پیش کش منظور کر لیتا تو میری زندگی کا رخ بدل جاتا -

۱۹۲۸ع تک مجھے مصر سے باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا - ایک دن استاد لطفی السید وائس چانسلر نے مجھے بلایا اور کہا کہ پرنس یوسف کمال آستانہ (قسطنطنیہ) کے کتب خانوں میں قدیم

جغرافیہ کی کتابوں ، خاص کر بطلیموس[1] کی کتب جغرافیہ کی تلاش میں ہیں اور اس کے لیے انھوں نے دو آدمی مانگے ہیں ۔ میں نے تمھاری اور استاد عبد الحمید العبادی کی سفارش کر دی ہے ۔ یہ سن کر پہلے تو میں سوچ میں پڑ گیا اور عاطف بک کی بات یاد آئی لیکن لطفی بک نے ڈھارس بندھائی کہ انھوں نے پرنس سے کہہ دیا ہے کہ وہ استادوں کو اُن کے علمی کام کی اُجرت دے کر اُن کے جذبات مجروح نہ کریں ۔ اس میں سفر کا کرایہ وغیرہ شامل تھا ۔ میں مان گیا ۔

اس پیش کش کے قبول کرنے میں میرے شوق کو بھی دخل تھا ۔ میں نے بچپن سے استانبول[2] اور اُس کی شان و شوکت کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا ۔ میرے دل میں اس کی عظمت کا گہرا نقش موجود تھا ۔ جب کبھی خدیو عباس[3] استانبول کا سفر کرتے تو رؤسائے مصر بھی استانبول کے سفر پر فخر کرتے تھے ۔ شوقی[4] نے اپنے شعروں میں استانبول کا ذکر کر کے اُس کو زندہ جاوید بنا دیا تھا ۔ اس میں باب عالی ، قصر شاہی ، بحرہ مرمرہ اور سلطان عبد الحمید[5] کا قصر یلدوز تھا ۔ یہ سب چیزیں مجھے اس کی زیارت کا شوق دلاتی تھیں ۔ ساتھ

---

۱ ۔ بطلیموس : یونانی حکیم اور جغرافیہ دان جس کا زمانہ ۱۶۷ قبل از مسیح ہے ۔

۲ ۔ استانبول (قسطنطنیہ) : ترکی کا سب سے بڑا شہر جو پہلے سلطنتِ عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا ۔ آبادی بیس لاکھ کے لگ بھگ ہے ۔

۳ ۔ خدیو عباس : (۱۸۹۲ - ۱۹۱۴ء) خدیو مصر ۔

۴ ۔ احمد شوقی : مصرِ جدید کا مشہور ترین شاعر (۱۸۶۸ - ۱۹۳۲ء) جس کا دیوان شوقیات کے نام سے مشہور ہے ۔

۵ ۔ سلطان عبدالحمید : (۱۸۴۲ - ۱۹۱۸ء) خلیفۃ المسلمین ۔

ہی ہمیں کمالی انقلاب سے وہاں کے نظام الاجتماعی میں تبدیلی کے اثرات کی بھی خبریں ملتی رہتی تھیں لہٰذا اس انقلاب کی بنیادی وجوہات ، مقاصد اور صلاحیت کو جاننے کا مجھے بھی اشتیاق تھا ۔

سفر سے دوسرے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں ۔ میرا اعتقاد ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز سے مقابلہ اور مقائسہ کرنے کے بعد ہی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے ۔ سفید رنگ کی حقیقت اُسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب اُس کا سیاہ ، سبز یا زرد رنگ سے مقابلہ کیا جائے ۔ کسی قوم کی پس ماندگی کو دوسری قوم کے عروج کے قیاس سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ کسی نظام کے فاسد ہونے کا یقین تب ہی آتا ہے جب اُس کے مقابلہ پر صالح نظام رکھا جائے ۔ میں مصر میں بیٹھا ہوا صرف کتابوں کی مدد سے کسی کی اچھائی اور برائی کا حکم لگا دیتا تھا لیکن مشاہدے کے سامنے اس کی حقیقت ہی کیا ہے ۔

میں کئی لوگوں کو بحری سفر کرتے اور واپس آتے دیکھتا ۔ وہ شہروں ، طبعی مناظروں اور جدید تہذیب و تمدن کے مظاہر کا بڑے شوق سے ذکر کرتے ۔ غیر ممالک کی تعریف اور مصر کی مذمت کرتے لیکن اُن کے نظریات کہاں تک صحیح یا غلط تھے ؟ اس کا فیصلہ مشاہدے کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا ۔ میں نے بے شمار سفرنامے پڑھے تھے ۔ سفر جب کتابی صورت میں مدون کیا جاتا ہے تو وہ قلبی صورت چھوڑ کر عقلی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ احساسات گم ہو جاتے ہیں اور صرف معلومات باقی رہ جاتی ہیں ۔ حقیقی سفر تو وہی ہے جس سے نفس اور دل تازہ زندگی حاصل کرے ۔

اس سفر میں چالیس دن لگے ۔ ہم دو جون ۱۹۲۸ع کو جہاز پر سوار ہوئے ۔ سونے سے پہلے میں اُس دن کی ڈائری لکھ لیتا تھا ۔ یہاں میں نمونے کے طور پر کچھ عرض کروں گا ۔ لمبی چوڑی تحریروں

سے میں قاری کو پریشان نہیں کرنا چاہتا ۔

میں نے سمندر کو صرف کنارے سے دیکھا تھا ۔ اس کی عظمت اور جوش و خروش آج دیکھنے میں آیا ۔ دن کو تو ہم اس سے مانوس ہو جاتے تھے لیکن رات کو بڑا ڈر لگتا ۔ اس کے دیکھنے سے مجھ میں خوشی اور رنج کے ملے جلے جذبات پیدا ہوتے جس طرح کسی طبعی منظر کو دیکھنے پر پیدا ہوتے ہیں ؛ مثلاً سورج کا غروب ہونا ، اونچے پہاڑ یا رات کو چمکتے ہوئے ستاروں والے آسمان کو دیکھنا ۔ لذت کا سبب ان مناظر کی خوبصورتی ہوتی اور غم اس واسطے ہوتا کہ ان مظاہر کے سامنے ہماری کوئی وقعت نہیں ہے ۔

سمندر کئی رنگ بدلتا رہا ۔ پہلے دو دن تو بالکل ساکن رہا لیکن تیسرے دن خوب طوفان آیا ۔ میرا سر چکرانے لگا اور میں تمام دن بستر پر پڑا اونگھتا رہا ۔ تیسرے دن ازمیر پہنچے اور چوتھے دن آستانہ[1] ۔ اس کے اطراف میں خوب پھرے اور گھومے ۔ پہلے پہل دیکھنے پر مجھے تو صدمہ ہوا کیونکہ خیال میں اس کا جاہ و جلال نقش تھا ۔ مضافات کی سیر سے اس کے جلال و جمال کا یقین آیا ۔ مجھے ترکوں کی دو عادتیں بڑی پسند آئیں ، ان کی صفائی اور سکون ۔ اگر کسی غریب کے گھر چلے جائیں تو وہاں بھی فرش ، فروش صاف ملے گا ۔ کسی کو بھی فرش پر جوتا دھرنے کی اجازت نہیں ۔ ہم نے گاڑیوں اور ٹراموں میں سفر کیا ۔ درجہ اول کے ہوٹلوں سے لے کر درجہ چہارم کے ہوٹلوں میں کھانا کھایا ۔ قہوہ خانوں میں بھی جا کر بیٹھتے رہے لیکن سب کو صاف و مصفی پایا ۔ ہم نے چالیس دن ٹرکی میں گزارے لیکن کسی کو بھی راستہ یا ٹرام میں لڑتے ہوئے نہیں پایا ۔ قہوہ خانے

---

۱ ۔ آستانہ : (قسطنطنیہ) ۔

آدمیوں سے بھرے ہوئے ہوتے لیکن سکون و طمانیت کی وجہ سے معلوم ہوتا کہ یہاں کوئی بھی بیٹھا ہوا نہیں ہے ۔ سچ ہے کہ ترک ان دو باتوں میں مشرق کے انگریز ہیں ۔ صفائی میں مصر سب سے پیچھے ہے ، بلکہ شامی اور لبنانی ہم سے بڑھے ہوئے ہیں ۔ سکون و طمانیت کا ہمارے ہاں فقدان ہے ۔ قہوہ خانوں ، بازاروں ، ٹراموں بلکہ گھروں میں بھی جھگڑا فساد رہتا ہے ۔ ہم صبح و شام آستانہ کی لائبریریوں کے چکر لگاتے رہے ۔ ہمارا کام سرکاری نوعیت کا تھا اور سرکاری کام ہمیشہ بارِ گراں ثابت ہوتے ہیں ۔ ہم کتابیں دیکھتے اور لائبریریوں میں گھستے رہے ۔ ہم کو وہ نایاب قلمی نسخے دکھلائے گئے جو کم کسی نے دیکھے ہوں گے ۔ قیمتی کتابوں کے نام ، اُن کی صفات اور نمبر وغیرہ نوٹ کرتے رہے ۔ مصر واپس آ کر دارالکتب کی کتابوں سے اُن کا مقابلہ کیا ۔ بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کا وجود ناممکنات میں سے تھا لیکن یہ سب آستانہ کے کتب خانوں میں موجود تھیں ۔ ان سب پر ہم نے ایک یادداشت لکھ کر پیش کر دی ۔

ان کتابوں کا ایک نسخہ دارالکتب اور دوسرا امیر کمال یوسف کی خدمت میں پیش کیا لیکن اب میں اس قسم کی تفصیلات میں طوالت کے خیال سے پڑنا نہیں چاہتا ۔ سفر میں اسی دن کی اہمیت معلوم ہوتی جب ہم بلا غرض بازاروں اور شاہراہوں میں گھومنے چلے جاتے ۔ گاؤں اور مضافات کو دیکھنے جاتے ۔ لوگ آتے جاتے لیکن ہمیں کوئی بھی نہ پہچانتا ۔ ہم جی بھر کر ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے ۔ چلتے چلتے تھک جاتے اور معلومات کا خزانہ لے کر واپس پلٹتے جن کو کبھی یاد رکھتے اور کبھی بھول جاتے ۔ کبھی چلتا ہوا فقرا بھی سن لیتے جس سے کسی بڑی چیز کی معرفت میں مدد ملتی ۔

ایک دن سلطان احمد کی مسجد دیکھنے گئے ۔ یہ مسجد نہایت

عظیم الشان ہے ۔ اس کا دربان نئے عہد میں اپنی اور اسلام کی حالت پر مرثیہ خواں تھا ۔ ترکی زبان میں کہنے لگا کہ اسلام کی ابتداء کسمپرسی میں ہوئی تھی اب پھر وہ اپنی اصلی حالت کی طرف آ جائے گا ۔ اس خوف سے کہ کوئی سن نہ لے وہ دائیں بائیں بھی دیکھ لیتا ۔

مجھے دو شخص بہت پسند آئے ۔ یہ دونوں جرمن مستشرق تھے اُن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا عربی کتابیں اور عربی زبان تھی اس کے سوا اُنھیں کسی دوسری چیز میں لذت نہ ملتی تھی ۔ دونوں صبح و شام لائبریریوں میں کتابوں کے مطالعہ اور اُن کی تصحیح میں مصروف رہتے ۔ یہ اساتذہ ریٹر[۱] اور ریشر[۲] تھے ۔ استاد ریشر ، مقامات پر اپنا مقالہ تیار کر رہے تھے ۔ بدیع الزمان[۳] کے زمانے سے لے کر آج تک مقامات کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ، اُن تمام کو جمع کر کے اُن کی تصنیف ، تفہیم اور حاشیہ آرائی میں ہمہ تن مشغول رہتے ۔ استاد ریٹر ، کو مختلف مذاہب کی دینی کتابوں سے شغف تھا ۔ وہ امام ابوالحسن الاشعری[۴] کی مقالات الاسلامیین کی نشر و اشاعت کی فکر میں تھے ۔ جملوں کی تصحیح اور تفہیم میں انھیں بڑی دقت پیش آتی تھی ۔ جس چیز کا پتہ نہ چلتا ہم سے پوچھ لیتے ۔ ہم عبارت سمجھنے کے لیے غور و فکر کرتے اور کبھی اُن کی موافقت اور کبھی ناموافقت کرتے ۔ دونوں اپنے کام میں صبر و استقلال سے لگے ہوئے تھے ۔ وہ علم کی اس طرح پرستش کرتے جس طرح ایک

---

۱ - Ritter .

۲ - Rescher .

۳ - بدیع الزمان : (المتوفی ۳۸۰ھ) مقامات اور رسائل کا مصنف ۔

۴ - امام ابوالحسن علی اشعری : (المتوفی ۳۲۴ھ) مشہور متکلم اور عالم دین ، اشعری مذہب کے بانی ۔

راہب اپنے عبادت خانہ میں کرتا ہے ۔

یہ اسماعیل آفندی صائب ہیں اگرچہ بوڑھے ہو چکے ہیں مگر صاحب وقار اور دل کے نیک ہیں ۔ آستانہ کے تمام کتب خانوں کی کتابوں سے واقفیت رکھتے اور اُن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں ۔ اس موضوع پر ہر ایک کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں ۔ یہ زاہد مرتاض ہیں ۔ جامعۂ استانبول میں ادب عربی کی پروفیسری گراں قدر مشاہرہ پر پیش کی گئی لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا کیونکہ اس نئے ماحول میں اُنھیں ہیٹ اور سوٹ پہننا پڑتا اور وہ اپنے عمامہ میں خوش تھے ۔ عمامہ پہننے کی ایک مذہبی آدمی کو اجازت تھی اور وہ دینی خدمت کو معمولی مشاہرہ کے ساتھ دنیوی ملازمت جس میں بھاری مشاہرہ ملنے کی اُمید تھی ، ترجیح دیتے تھے ۔

دوسرے شیخ رشید الحواصلی ، شام کے رہنے والے تھے ۔ ایک عرصہ تک سید جمال الدین[1] کے ساتھ رہے تھے ۔ اُن کی بہت سی باتیں یاد تھیں ۔ آستانہ قدیم اور جدید سے واقف تھے ۔ زمانے کا سرد و گرم بھی چکھا تھا ۔ کتابوں کی خرید و فروخت میں ماہر تھے ۔ ہم اُن سے پرانے اور نئے آستانہ کی شخصیات ، جدید انقلاب اور لوگوں پر اُس کے تاثرات کے متعلق پوچھتے رہے ۔

ہمارے پر لطف اوقات وہ ہوتے جو ہم آستانہ کے مضافات میں گزارتے ۔ ایک دن جہاز میں بیٹھ کر باسفورس سے شرشرمو تک گئے ۔ اس میں باسفورس اور اُس کے گرد و نواح کے جمال کو دیکھا ۔ کھیتوں میں اوپر نیچے مکانات بنے ہوئے تھے ۔ پہاڑ مختلف اقسام کے

---

۱ ۔ سید جمال الدین افغانی : (۱۸۳۹ ۔ ۱۸۹۷ء) مشہور انقلابی رہنما اور اتحادِ اسلام کے داعی ۔

درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے ۔ جگہ جگہ میٹھے پانی کے چشمے ابل رہے تھے ۔ راستہ میں کوئی دخانی جہاز ملتا تو دیر تک اس کو دیکھتے رہتے ۔ صاف بازار دکھائی دیتے جس میں زندگی کی تمام ضروریات ملتی تھیں ۔

چھوٹے بچوں اور بڑے بوڑھوں تک سب کا لباس صاف ستھرا دکھائی دیتا ۔ بیچنے کی تمام چیزیں اندر رکھی رہتیں ۔ قصاب گوشت بھی دوکان کے اندر لٹکاتا تھا ۔ ہم ایک دفعہ اسٹیمر پر بیٹھ کر جزیرۃ الامراء گئے ۔ یہ تین جزیروں کا مجموعہ ہے ۔ ہم بڑے جزیرے کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ یہ سیڑھیوں والا پہاڑ ہے جس کے ارد گرد پانی ہی پانی ہے ۔ پہاڑ درختوں اور نباتات سے ڈھکا ہوا ہے ۔ لوگوں نے طرح طرح کے مکانات سمندر پر بنا رکھے ہیں ۔ ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر کھانا کھایا اور اس کے خوبصورت مناظر اور کھلی اور صاف ہوا سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔

جمعہ کے دن سرکاری چھٹی رہتی ہے ۔ ترک یہ دن شہر کے مضافات میں گزارتے ہیں ۔ سارا کام کاج بند رہتا ہے ۔ لوگ انبوہ در انبوہ کھانا وغیرہ لے کر سیر و تفریح کے مقامات پر چلے جاتے ہیں اور وہیں ہنسی خوشی دن گزارتے ہیں ۔ ایک دفعہ ہم بھی باہر سیر کو گئے ۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا لیکن تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی ۔ ہر کوئی ٹھکانا ڈھونڈنے لگا ۔ سیلانی بادل کا مضحکہ اڑانے لگے جو اس وقت بارش برسا کر ان کا مذاق اڑا رہا تھا ۔ اس روز یہ منظر خوب رہا ۔

عورتیں نئی آزادی اور بے نقابی سے بہت خوش ہیں ۔ یہ مزاح و خوشی میں حد کر دیتی ہیں ۔ نوجوان لڑکیاں قہوہ خانوں میں گاتی اور ناچتی ہیں ۔ گویا وہ پہلے قیدی تھیں جن کی رہائی دیر کے بعد ہوئی

ہے یا اُنھوں نے اپنے گھر والوں سے دیر کے بعد ملاقات کی ہے۔
اس طرح کے طبعی اور غیر طبعی مناظر کو ہم دیر تک دیکھتے رہے۔

خوش قسمتی سے مجھے علی بک فوزی مل گئے جو کبھی مدرسۃ القضاء میں ہمارے اُستاد تھے۔ اُنھوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی کیونکہ وہ کسی انگریز سپاہی کو مصر کی سر زمین پر دیکھنے کی برداشت نہ رکھتے تھے۔ یونانی سپاہیوں کا قہوہ خانے میں وہ امتیاز تھا جو کم کسی مصری کو حاصل ہوگا۔ ان باتوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ مصر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ملکوں کی سیر کرتے رہے حتیٰ کہ آستانہ میں آ کر کمو کھول دی۔ اُنھیں پچیس پونڈ ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس میں سے قلیل رقم اپنے اوپر خرچ کرتے اور باقی فقراء میں تقسیم کر دیتے۔ میں دیر سے اُن کی تلاش میں تھا کیونکہ وہ ترکی کے جدید انقلاب اور اُس کے اچھے اور برے نتائج سے زیادہ باخبر تھے اور وہی اس حال کی اچھی طرح سے تشریح کر سکتے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ ترکی میں بڑا اجتماعی انقلاب برپا ہوا ہے۔ ترکی سب سے پہلا اسلامی ملک تھا جہاں جدید تمدن کے متعلق تجربات ہو چکے تھے۔ خلیفہ کو معزول اور خلافت کو القط کیا جا چکا تھا۔ معزول خلیفہ اور اُس کے عزیز و اقارب کو ترکی میں رہائش کی اجازت نہ تھی۔ خلافت کو جمہوریت میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سلطان اور اس کے رشتہ داروں کی جائیدادیں اور محل سرائیں اب عوام کے قبضہ میں تھیں۔ لکھے پڑھے لوگ اس انقلاب پر نقد و احتساب کر رہے تھے۔ کوئی اس کو پسندیدہ تو کوئی اس کو ناپسندیدہ قرار دیتا تھا۔

وزارتِ اوقاف توڑ دی گئی تھی۔ اس کے تمام کام امور دینیہ

کے رئیس کے متعلق کر دے گئے تھے ۔ اس کے ساتھ مشورے کے لیے ایک جماعت قائم کی گئی ۔ اس طرح شرعی عدالتیں بھی توڑ دی گئیں اور ان کا انضمام محکمۂ عدل میں کر دیا گیا ۔ تعلیمی وحدت کی غرض سے دینی مدارس ختم کر دیے گئے ۔ یہ دینی مدارس تمام ملک میں بکھرے ہوئے تھے ۔ کوئی وزارتِ اوقاف کے ماتحت تھا اور کوئی وزارتِ شرعیہ کی نگرانی میں ۔ ان سب مدارس کو محکمۂ تعلیم کے تابع کر دیا گیا ۔ ملک کے ہر باشندے کو ایک قسم کی دنیاوی تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی ۔ اگر کسی کو دینی تعلیم کا شوق ہوتا تو وہ اپنے خرچہ پر تعلیم حاصل کر سکتا تھا ۔ دینی تعلیم کلیۃ الالٰہیات میں منحصر کر دی گئی جو یونیورسٹی کے ماتحت تھا ۔ یہاں دینی عالم تعلیم پاتے تھے ۔

صوفیوں کے تکیے اور زاوے بند کر دیے گئے ۔ صوفیوں کے القاب ، درویش ، مرید ، استاد ، سید ، چلپی اور نقیب وغیرہ ممنوع الاستعمال قرار پائے ۔ سحر ، ستارہ شناسی (علم نجوم) ، تعویذوں کا لکھنا اور مستقبل بتلانے کی اجازت نہ رہی ۔ اگر کوئی یہ کام کرتا تو اس کے لیے کم از کم تین ماہ قید اور پچاس پونڈ جرمانہ کی سزا مقرر ہوتی ۔ نیز زاویوں اور خانقاہوں میں سرکاری مدارس قائم کر دیے گئے ۔ دینی لباس محدود کر دیا گیا ۔ اس لباس کو ایک خاص گروہ ہی پہن سکتا تھا ۔ مثلاً دینی امور کا رئیس یا مساجد کے آئمہ ، خطیب یا وعظ کہنے والے وغیرہ ، جن کی تقرری محکمہ امور دینیہ کا سربراہ کر سکتا تھا ۔ دوسروں کو عمامہ اور مولویوں کا لباس پہننے کی مطلقاً اجازت نہ تھی ۔

جمعہ کے دن کی چھٹی لازمی تھی ۔ کارخانے ، گودام اور منڈیاں وغیرہ سب بند رہتیں ۔ حکم عدولی پر سخت سزا مقرر تھی ۔

اس سے نان بائی ، قصاب ، سبزی فروش اور ڈاکٹر وغیرہ مستثنٰی تھے۔ ہجری سال کو چھوڑ کر مغربی کیلنڈر اختیار کر لیا گیا تھا۔

شادی بیاہ میں فضول خرچی کو روکا گیا۔ جہیز کی تشہیر کی ممانعت تھی۔ خوشی کے لیے ایک دن رکھا گیا۔ عام دعوت کی بھی اجازت نہ تھی۔ مجلہ اور احکام الشرعیہ کی جگہ سول قانون نے لے لی۔ شخصی قانون کی جگہ یورپی قانون کی حکمرانی تھی۔ تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا۔ شوہر اور بیوی کو یکساں حق دیا گیا کہ وہ خاص اسباب کے تحت طلاق کا مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ عورتوں کو پردے سے آزادی دے دی گئی۔ اُن کو آدمیوں کے برابر سیاسی ، اجتماعی اور ملکی حقوق عطا کیے گئے اور سرکاری ملازمت کا دروازہ اُن پر کھول دیا گیا۔ بے پردگی کے لیے کوئی قانون نہ تھا بلکہ مصطفٰی کمال[1] نے بڑے اصرار سے اس کی دعوت دی تھی اور عورتوں نے اس پر لبیک کہا تھا۔ عورت کی مساوی حیثیت کے لیے قانون وضع کیا گیا جس کے بعد مرد اور عورت کو میراث میں بھی برابری دے دی گئی۔ شادی ایک قسم کی شراکت قرار دی گئی جس میں مرد اور عورت برابر کے حصہ دار تھے۔ علاوہ ازیں عورت کو مردوں جیسے سیاسی حقوق بھی دے دیے گئے تھے لہذا اب اُن کو انتخاب کے جملہ حقوق حاصل تھے۔ اُن کی تعلیم میں مردوں جیسا خیال رکھا جاتا۔ دین کا دولت سے رشتہ توڑ دیا گیا۔ مذہب کی ، قانون اور محکمہ میں حکم فرمائی جاتی رہی۔ دینی عالم سوائے مذہبی امور کے کسی اور کام میں دخل نہ دے سکتے تھے۔

ترکی زبان کے رسم الخط کو بھی تبدیل کر دیا گیا اور لاطینی

---

۱ ۔ غازی مصطفٰی کمال : جدید ترکی کے معمار ۔

رسم الخط نے عربی رسم الخط کی جگہ لے لی ۔

ترکی انقلاب کے یہ بڑے مظاہر تھے جو ترکی میں رونما ہوئے ۔ ان سب اثرات کو میں سمجھنا چاہتا تھا ۔ سوچتا رہتا کہ ان میں کون سا مصر کے مزاج کے موافق ہے اور کون سا ناموافق ۔ اور کیا ان اصلاحات میں ہم ترکی کا ساتھ دے سکتے ہیں ؟

اب میں اپنی ڈائری کے بعض اوراق یہاں نقل کرتا ہوں ۔

۱۸ جون ۱۹۲۸ء :

آج صبح ہم قوب قیو سرائے[۱] گئے ۔ کتب خانوں کو دیکھتے رہے ۔ بہت سے قیمتی نسخے موجود پائے ۔ شام کو علی بک فوزی سے ملے ۔ اُن کے ساتھ تین گھنٹے تک مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے ۔ میں نے اُن سے ترکی کی حالت اجتماعی کے متعلق پوچھا ۔ کہنے لگے کہ مناسب ہے کہ جدید تبدیلیوں کا دقتِ نظر سے مشاہدہ کیا جائے ۔ اجتماعی لحاظ سے مصر ، ترکی کے ساتھ منسلک ہے ۔ مصریوں نے بہت سی عادتیں ترکوں سے لی ہیں ۔ جب ترکی میں تغیرات ہوں گے تو مصر بھی لازمی طور پر ان سے متاثر ہوگا ۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ ترکی ایک تنگ آبنائے ہے جس پر سے مغربی تمدن گزر کر مصر کو جاتا ہے ۔ میرے خیال میں تو تمدن مغرب کے سیلاب کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا ۔ بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں ۔

ترکی کے انقلاب کا سب سے بڑا مظہر بے حجابی ہے ۔ ترکوں نے ازدواجی اصلاح سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ہے ۔ میاں بیوی منگنی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اور مانوس ہو جاتے ہیں ۔

---

۱ ۔ قوب قیو سرائے : قسطنطنیہ کا ایک محلہ ۔

بے حجابی کی وجہ سے عورت ہی کو فائدہ ہے۔ حجاب ایک قسم کا ہالہ تھا جو عورت کو محصور کیے ہوئے تھا اور جس کی وجہ سے آدمی تصورات اور تخیلات کی دنیا میں رہتا تھا۔ اس سبب سے ادبِ عربی میں غزل کی کثرت ہے اور متغزلین کے تخیلات کے کیا کہنے۔

میں نے اُن سے ہیٹ کے متعلق دریافت کیا تو کہنے لگے کہ یہ ترکی ٹوپی سے افضل اور سر اور آنکھوں کے لیے مناسب ہے۔ اگر حکومت نے علماء کو اقتدار سے محروم کر دیا تو بہت اچھا کیا کیونکہ یہ لوگ رجعت پسند اور ظالم سلطانوں کے ساتھ آلۂ کار تھے۔ قوم کو جو تکلیف پہنچتی تھی ان ہی کے ذریعے پہنچتی تھی۔ لوگوں پر ان کا بڑا رعب تھا۔ اس سلطان کے زمانے میں ان لوگوں نے قوم کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

بہت سے لوگ عمامہ پہن کر اتراتے پھرتے تھے۔ رمل، فال اور نجوم کا کام کرنے والے سبھی عمامہ پہنا کرتے تھے اور مذہبی آدمیوں کا سا لباس اوڑھا کرتے تھے۔ حکومت نے صرف مذہبی آدمیوں کو عمامہ پہننے کی اجازت دے کر دھوکے اور فریب کی جڑ اکھاڑ ڈالی ہے۔ ہر اصلاح کے لیے قربانیاں بھی کرنی پڑتی ہیں۔ آزادی کے بعد افراط کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ مذہبی لوگوں پر سختیاں کی گئیں تو بعض غلطیاں بھی سرزد ہو گئیں۔ عورتوں کی بے حجابی سے بعض لغزشیں بھی ظہور پذیر ہوئیں لیکن آئندہ چل کر ان غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔

کہنے لگے کہ دینی انقلاب میں افراط ملاحظہ ہو۔ میں نے بعض ترکی اخبارات میں پڑھا ہے کہ نماز اور مساجد کی تنظیم، جدید تمدن کے مطابق ہونی چاہیے۔ ایک آدمی بوٹ پہنتا ہے اور اس کا کھولنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک آدمی انگریزی ٹوپی پہن کر

بڑی مشکل سے سجدہ کر سکتا ہے ۔

تمام مغربی ممالک ترکی کے انقلاب سے حیرت زدہ ہیں حالانکہ یہ انقلاب بغیر کسی خونریزی کے برپا ہوا ہے ۔ بہت سے یورپی اس انقلاب کے ، دو وجہوں سے ، مخالف ہیں ۔ پہلی یہ کہ وہ ترکوں کے لباس ، عادات اور تقالید کو قرون وسطیٰ کی یادگار سمجھتے تھے ۔ دوسری یہ کہ اُن کو خصوصی امتیازات سے دستبردار ہونا پڑا جن سے وہ زمانۂ سابق میں فائدہ اُٹھاتے تھے ۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا ترکی شاہراہ ترقی پر ہمیشہ گامزن رہے گا ؟ کہنے لگے کہ ظاہری حالت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ جدید نسل اس انقلاب کی موید اور محافظ ہے اور پہلے کی نسبت لوگ زیادہ خوش حال ہیں ۔

اس کے بعد بات چیت کا رخ اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف پھر گیا ۔ میں نے پوچھا کہ کیا مصر کی یاد بھی آپ کو ستاتی ہے ؟ کہنے لگے ''ضرور ستاتی ہے لیکن میں یہاں کی اقامت کو ترجیح دیتا ہوں ۔ میں نے مصر میں دوستوں کی وفا شعاری کا خوب تجربہ کیا تھا اور رنج اُٹھایا تھا ۔ اچھا ہے کہ میں وطن سے دور رہ کر وقت گزاروں اور ان سے نہ ملوں ۔ میں نے ترکی کی رہائش اس واسطے پسند کی ہے کہ یہ اسلامی ملک ہے ۔ اس میں مشرق فراخ دلی پائی ہے ۔ فرنگی اگرچہ ہم سے ترقی یافتہ ہے لیکن اُس کا ایک پہلو وحشی بھی ہے ۔ میں انگلستان ، فرانس اور جرمنی میں بھی رہا ہوں لیکن یہ دل کی فراخی کہیں نہیں پائی جو مجھے ترکی میں ملی ہے ۔ جب میں آستانہ میں ہوتا ہوں تو میری رہائش مشرقی حصے میں اور کھانا پینا بھی مشرقی ہوٹل میں ہوتا ہے ۔ میں یورپی جانب شاذ و نادر ہی جاتا ہوں ۔ میں ایسی جگہ رہنا پسند کرتا ہوں جو اذان گاہوں

سے معمور ہو ۔" میں نے پوچھا "کیا تم تجرّد کی زندگی بسر کر کے خوش ہو ؟" کہنے لگے "میں تو اس پر نادم ہوں ۔ کاش جوانی عود کر آئے اور میں شادی رچا لوں ۔ شادی سے زندگی میں امید کی کرن پھوٹتی ہے اور اب جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں ، یاس و حسرت سے موت کا انتظار کر رہا ہوں ۔"

اس کے بعد ادبِ ترکی کے متعلق بات چیت ہونے لگی ۔ کہنے لگے کاش کہ تم ترکی زبان سیکھ لیتے کیونکہ یہ تمام مشرقی زبانوں سے زیادہ وسیع اور ترقی یافتہ ہے اور تم دیکھ سکتے ہو کہ ترکوں نے اپنی حیات اجتماعیہ ، عقلیہ اور نفسیہ کی اصلاح کے لیے کس طرح اپنی زبان و ادب سے کام لیا ہے ۔ مصر کی اصلاح کی کیسے امید رکھی جا سکتی ہے جبکہ وہاں علم اور بول چال کی دو زبانیں ہیں ۔ کسی بولی کی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس سے تعلیم کا کام لیا جائے ۔ اس سے صحیح فکر کی نشو و نما ہوتی ہے اور زبان ، حقیقی زندگی سے ہی روح پاتی ہے ۔

۵ جولائی ۱۹۲۸ء :

ہم نے صبح مکتبہ[1] سلیمانیہ' میں گزاری ۔ ظہر کے بعد فواد بک کی دعوت پر ہم اُن کے گھر گئے جو مسجد سلطان احمد کے قریب تھا ۔ یہ قدیم وضع کا گھر تھا اور حد درجہ صاف ستھرا ۔ سیڑھیوں پر قالین بچھے ہوئے تھے ۔ ہم ایک کمرے میں بیٹھے جس کے اطراف میں کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی تھیں اور ان کے وسط میں مطالعہ کے واسطے جگہ بنی ہوئی تھی ۔

فواد بک نے ہمارا استقبال کیا ۔ وہ کڑیل جوان تھے ۔ عمر

---

۱ ۔ مکتبہ سلیمانیہ : قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ ۔

کوئی تیس سال کے قریب ہوگی - نشاط اور ادب سے بھرپور تھے - آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی - وہ مؤتمر مستشرقین کے لیے مقالہ تیار کر رہے تھے - ہم اپنی یونیورسٹیوں اور اُن کی مطبوعات کا ذکر کرتے رہے - پھر مستشرقوں اور اُن کی خدمت علم کا تذکرہ رہا - کاش کہ بعض مستشرق سیاسی بازی گری سے علیحدہ رہتے - پھر اسلامی فرقوں اور اُن کی حقیقت کی طرف رسائی میں مشکلات پر بات چیت ہوتی رہی کیونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو غالی موید یا غالی معترض نے لکھا ہے - اُنھوں نے میری رائے پوچھی کہ کیا اسلام نے تصوف کی ہمت افزائی کی ہے یا اُسے پروان چڑھایا ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ ہمت افزائی کی ہے -

مجھے معلوم تھا کہ فواد بک دینی اور اجتماعی اصلاح کے نقیب ہیں جو اس وقت ترکی میں جاری و ساری ہے - میں نے اس موضوع کو دو دفعہ چھیڑنا چاہا تا کہ اُن سے وہ قواعد معلوم کروں جن کی بناء پر وہ اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد استوار کر رہے ہیں لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے اس کو ٹال گئے اور بات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا -

۸ جولائی :

صبح ہم شہید علی[1] کے کتب خانہ میں گئے - اس میں بہت سے قیمتی مخطوطات تھے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بہت سے نسخوں میں رطوبت کا اثر پہنچ گیا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتب خانہ چودہ سال بند رہا ہے - کسی جاسوس نے سلطان عبد الحمید

---

۱ - مکتبہ شہید علی : قسطنطنیہ کا ایک کتب خانہ جو نادر قلمی کتابوں کی وجہ سے مشہور ہے -

کو خبر کر دی تھی کہ یہاں سیاسی باتیں ہوا کرتی ہیں۔

کتب خانے کے مہتمم افغانستان کے رہنے والے تھے۔ سید جمال الدین افغانی[1] کے متعلق باتیں کرتے رہے - ہم نے اُن سے سید صاحب کی قبر کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے اس کا محلِ وقوع بتلایا - ہم ٹرام میں سوار ہو کر عصر کے بعد وہاں گئے۔ اس جگہ کو قشکہ کہتے ہیں - اسٹیمر سے جائیں تو یہ باسفورس کے دہانہ پر واقع ہے - سمندر کے قریب ایک قبرستان تھا جو پچاس میٹر کے فاصلہ پر ہوگا - یہاں دربان سے سید صاحب کی قبر کے متعلق پوچھا تو کچھ نہ بتا سکا - آخرکار ایک بوڑھے آدمی کو لے آیا جو ہمیں اُن کی قبر تک لے گیا - یہ ایک معمولی سی قبر تھی جس پر نہ تو کوئی کتبہ تھا اور نہ اُس کے اردگرد کوئی دیوار تھی - معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمداً کیا گیا تھا تاکہ اُن کی یاد باقی نہ رہ سکے - ان کا کفن دفن بھی معمولی آدمیوں سا ہوا تھا لیکن بعد میں اُن کی قبر سنگ رخام سے بنائی گئی اور اردگرد لوہے کا کٹھرا بھی لگا دیا گیا - سنگی کتبہ پر اُن کا نام اور تاریخ ولادت و وفات ترکی زبان میں کندہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "اس مزار کو تمام مسلمانوں کے دوست اور امریکی مخیر مسٹر چارلس کرین نے ۱۹۲٦ع میں تعمیر کرایا"۔ ہم سید جمال الدین کے مزار پر کھڑے تھے تو اُن کی زندگی اور انقلابی جد و جہد کی یاد تازہ ہوگئی - وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مصر میں اصلاح کا بیج بویا تھا - ہمارے دل اُن کی یاد سے بہت متاثر ہوئے اور ہم فاتحہ پڑھ کر وہاں سے روانہ ہوئے۔

---

۱ - سید جمال الدین افغانی : (۱۸۳۹ - ۱۸۹۷) تحریکِ اتحادِ اسلام کے داعی -

ہم نے مکتبہ شہید علی کے لائبریرین سے عبداللہ ندیم[1] کی قبر کے متعلق بھی پوچھا۔ کہنے لگے کہ وہ بکسطاش کی طرف ہے لیکن اُس کو جائے دفن کا اچھی طرح علم نہ تھا۔

۱۲ جولائی:

صبح ہم مصری قونصل خانے میں گئے اور الوداع کہا۔ پھر جامع بایزید کی طرف گئے اور علی بک فوزی کی دعوت پر ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد مؤثر طور پر اُن سے رخصت ہوئے۔ ہم وطنی کی وجہ سے وہ ہم سے بہت مانوس ہو گئے تھے، جب ہم نے اُن سے سفر کی اجازت مانگی تو کہنے لگے تم تو میری جان لینے کی اجازت مانگتے ہو۔ یہ جملہ سن کر میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

یہ عجیب و غریب قسم کے انسان تھے جن کا مثیل میں نے نہ دیکھا تھا۔ مصر سے دلی محبت تھی۔ مسلمانوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اُن کی بد حالی پر مرثیہ خواں تھے۔ علی بک فوزی کی دینداری میں ان کی عقل اور دل کی بھی آمیزش تھی۔ وہ ایک خاص طریقے سے روزہ رکھا کرتے تھے۔ سورج غروب ہونے پر دودھ کی دو پیالیاں پی لیتے لیکن سارا دن پانی پیتے رہتے۔ اس حالت میں افطاری تک رہتے اور پھر روزہ افطار کرتے۔ روزہ رکھنے سے اُن کا مطلب زیادہ نہ کھانے، چکنی چیزوں سے پرہیز اور اقوال و افعال سے اجتناب تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ استانبول میں ایسی جگہ رہا کرتے تھے جس کی نچلی منزل میں فرانسیسی بھی تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی حرکات سے کسی کو تکلیف پہنچے لہٰذا وہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔

۱۔ عبداللہ ندیم: (۱۸۴۵ - ۱۸۹۹ع) مصر کے نڈر اور بے باک صحافی۔

رخصت ہوتے وقت اُنھوں نے انگریزی کا ایک رسالہ دیا۔ تصوف کا یہ رسالہ عنایت خاں سوئٹزرلینڈ سے نکالتے تھے۔ اس میں دین خاص کی تفاصیل کو نظرانداز کرتے ہوئے عام تصوف کی طرف دعوت دی جاتی تھی۔ اِس بناء پر اس جمعیت کے ارکان میں مسلمان، یہودی اور عیسائی سبھی شامل تھے۔ علی بک فوزی نے بتلایا کہ عنایت خاں کی وفات کے بعد جمعیت کی صدارت انھیں پیش کی گئی تھی لیکن وہ نہ مانے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تقالید اور رسومات سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔

اُن کی مصیبتوں کا سرچشمہ اُن کے حد درجہ رقیق احساسات اور جذبات تھے۔

۱۴ جولائی ۱۹۲۸ء:

عصر کے بعد ہم سلطان عبدالحمید کا محل قصر یلدوز دیکھنے گئے۔ یہ محل کبھی قاصدوں کا کعبہ، سیاست دانوں کی بازی گہ اور جاسوسوں کا اڈہ ہوا کرتا تھا۔ اس محل سے ایسے احکام صادر ہوا کرتے تھے جن سے عالمِ اسلام حرکت میں آ جاتا تھا۔ یہاں مغربی مدبر سیاسی مدبروں سے ملتے۔ یہ محل دجالوں، شعبدہ بازوں، مصلحوں اور فسادیوں کی آماجگاہ تھا۔ خوبصورت گانے والی چھوکریاں اور حبشی غلام سرگرم رفتار رہا کرتے تھے۔

یہ محل سرائے باسفورس پر تھی۔ سمندر کی جانب دیواریں تھیں اور دیواروں کے ساتھ سڑکیں تھیں۔ سڑکوں کی دونوں جانب محافظوں کی چوکیاں تھیں اس کے بعد محل تھا۔

ہمارا رہنما عبداللہ آفندی ایک سوڈانی اونچے قد کا آدمی تھا۔ اُس نے یہاں چالیس سال خدمت کی تھی۔ ماضی کے شاندار اور تابناک ایام کو یاد کرکے روتا اور اسلام کے زوال پر افسوس کرتا تھا۔ یہ

محل بڑا با رونق تھا ۔ حدِ نگاہ تک باغات تھے ۔ محل کے دروازہ پر پہنچنے کے لیے بیس منٹ لگتے تھے ۔ یہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا ۔ اس کے ساتھ دوسرا بڑا کمرہ مہمانوں کے کھانے کے لیے تھا ۔ اس کی خوبصورتی اور حسنِ صنعت کا کیا کہنا ۔ اب یہ کمرہ سامانِ آرائش سے خالی تھا ۔ صرف ایک بڑا سا آئینہ رہ گیا تھا ۔ ایک دوسرا کمرہ جو اس سے کئی گنا بڑا تھا ، مقفل تھا ۔ ہمارے رہنما نے بتلایا کہ محل کا سامانِ رہائش یہاں دھرا ہے اور سلطانی حرم جہاں کہ سلطان کی اقامت رہا کرتی تھی ایامِ جنگ میں جل گیا تھا ۔

ہم نے باغ میں فوارہ دار حوض بھی دیکھا ۔ عبداللہ آفندی نے بتلایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا جب خدیو عباس ہمیں ملنے آئے تھے تو اس حوض کے پاس ٹھہرے تھے اور بتلاتے تھے کہ وہ جب مصر کے والی مقرر ہوکر سلطان عبدالحمید کی خدمت میں "آستانہ" حاضر ہوئے تو یہاں سلطان کے پاس آ کر بیٹھے تھے ، اُس وقت شاہ بلغاریہ بھی ساتھ تھا اور سلطان نے یہاں اُن کو انعام و اعزاز سے نوازا تھا ۔ عبداللہ آفندی ان ایام کو یاد کرکے روتا تو اُس کے چہرے پر غم و حزن کے آثار اور بھی نمایاں ہو جاتے۔ یہ دنیا دھوکہ باز اور مٹ جانے والا سایہ ہے ۔

۱۶ جولائی :

ہم نے واپسی کا ارادہ کیا ۔ جمرک تک گاڑی میں گئے اور وہاں الروضہ نامی جہاز پر سوار ہوئے ۔ آستانہ میں ہم نے چالیس دن گزارے تھے ۔ اس سفر پر میں سرسری نگاہ ڈالتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نے شروع میں بہت کچھ خرچ کیا کیونکہ یہاں کی طرز رہائش اور طریقہ بود و ماند کا ہمیں کچھ پتہ نہ تھا ۔ ہمارا رہنما ایک شامی تھا جو اپنی باتوں اور تکلیفوں سے زیر بار رکھتا تھا ، ہم نے اُس

سے نجات پائی (تو سکھ کا سانس لیا) ۔

ان دنوں آستانہ کا موسم بہت اچھا تھا ۔ قاہرہ جیسی گرمی نہ تھی بلکہ ہم بعض اوقات سردی محسوس کرتے تھے ۔ کئی لوگوں نے بتلایا کہ اس سال بہت کم گرمی پڑی ہے ۔ بعض برس گرمی اتنی سخت پڑتی ہے کہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے ۔ اس سفر نے میرے ذہنی افق کو وسعت بخشی ۔ پہلے میں مصر کے معاملات کو اونچائی سے دیکھا کرتا تھا گویا میں ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوں ۔ آستانہ میں مجھ پر دینی شعور غالب رہا ۔ یہ نمازوں کی کثرت سے نہ تھا بلکہ قلبی تاثرات کی وجہ سے ۔

مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں ہم سفروں کی نسبت زیادہ سنجیدہ ، کم گو اور اپنے وطن کا زیادہ شائق ہوں ۔ میں نے عزم کر لیا تھا کہ واپسی پر اپنے بچوں سے زیادہ پیار کروں گا ۔

میرا ارادہ تھا کہ واپسی پر ایک پریس قائم کروں گا جس میں ان قیمتی کتابوں کی ، جو میرے ہاتھ لگی ہیں ، طباعت کی جاوے گی ، تا کہ یہ کام نفع بخش ثابت ہو ۔ ادبی لحاظ سے بھی اور مالی لحاظ سے بھی ۔

میں نے دل میں کہا کہ جو چالیس دن میں نے آستانہ میں گزارے ہیں ایک افسانہ چھوڑ کئی افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں ۔ اس میں بہت سے مناظر اور اشخاص دیکھے ۔ کئی واقعات پیش آئے ، اگر اس میں کمی ہے تو صرف عورت اور افسانوی طرز بیان کی ۔

میرا سر اب سفید ہو چلا تھا ۔ اس سے میرا بوڑھا ہونے کا احساس جاگا ۔ بہت سے نوجوان مجھ سے سیر میں آگے نکل جاتے تھے ۔ میں آتا تو میرے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دیتے ۔ یہ تکلیف دہ عزت افزائی تھی ۔

میری تمنا تھی کہ جہاز پرندہ بن کر اڑ جائے ۔ سفر کا اختتام ایک ناگوار حادثہ پر ہوا جس کا نام استاد علی بک فوزی نے آیۃ الکرسی رکھا ۔ اسکندریہ پہنچنے سے ایک دن قبل میں جہاز پر چڑھا اور ایک کرسی پر بیٹھنا چاہا جو خود بخود بند اور کھل جاتی تھی ۔ میں اس کو کھول کر بیٹھ گیا اور اطراف کی دو تختیوں پر ٹیک لگا لی لیکن داہنے ہاتھ کی چھنگلی تختیوں میں اٹک کر زخمی ہو گئی ۔ میں جہاز کے ڈاکٹر کے پاس گیا ۔ اس نے لٹکتے ہوئے گوشت کو اس کی اصلی جگہ رکھ کر پٹی باندھ دی ۔ اس پر جہاز کے تمام مسافروں نے مجھ سے ہمدردی کی ۔ جب مصر واپس آیا تو میں ایک ڈاکٹر کے پاس گیا ۔ اس نے شعاعیں ڈال کر انگوٹھے کی ہڈی کا معائنہ کیا اور اس کو صحیح و سالم پایا لیکن زخم بڑے لمبے علاج کے بعد مندمل ہو سکا تاہم انگوٹھے پر ایک بڑا سا نشان باقی رہ گیا ۔

:o——— ———:

۲۳

شام اور فلسطین کی سیر

نصف سال کے اختتام پر ہمیں تعطیلات ہوا کرتی تھیں۔ ان کا فائدہ اُٹھا کر ہم نے شام کا عزم سفر کیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور سردی بھی زوروں پر تھی۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ مصر سے روانہ ہوئے۔ کالج کی طرف سے میں اس سفر کا نگران تھا۔ قاہرہ سے چل کر سویز پہنچے۔ صحرائے سینا گاڑی سے قطع کر کے غزہ[1] ہو کر ہم بعض یہودی نوآبادیوں سے گزرے۔ اُن کی نوآبادیوں کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں جس کی وجہ سے مستقبل سے ڈر لگتا تھا۔ لُد سٹیشن پر پہنچ کر بیت المقدس جانے کے لیے گاڑی بدلی۔ لُد اور بیت المقدس کے درمیان پہاڑوں اور وادیوں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہ مناظر دل میں ہیبت بھی پیدا کر دیتے تھے۔ بیت المقدس پہنچے تو بہت سے عالموں اور ادیبوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے رئیس مرحوم اسعاف بک نشاشیبی[2] تھے۔ اُنھوں نے ہماری عزت افزائی کی۔ ہم سید امین الحسینی مفتیِ فلسطین[3] سے بھی ملے۔ اُن کو دیکھ کر اُن کے عزمِ صمیم اور ان تھک شخصیت کا پتہ چلتا

۱۔ غزہ: فلسطین اور مصر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

۲۔ اسعاف بک نشاشیبی: (۱۸۸۵ - ۱۹۴۸ء) فلسطین کے سیاسی رہنما۔

۳۔ سید امین الحسینی: فلسطین کے عربوں کے محبوب رہنما جو اب وفات پا چکے ہیں۔

تھا ۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم سیاسی پارٹیوں کے بعض سربراہوں سے بھی ملے ۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مصلحت عامہ کو چھوڑکر ذاتی مفاد کی غرض سے آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں ۔ اُن کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا اور خیال ہوا کہ اُن کی نا اتفاقی ملک پر کوئی مصیبت لانے گی ۔ اس کے بعد بیتِ لحم کی زیارت کی ۔ یہ بھی دیکھا کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے مختلف مکانوں اور جگہوں کے لیے کس طرح جھگڑتے ہیں اور اُنھوں نے زمین کی ایک ایک بالشت آپس میں بانٹ لی ہے ۔ مجھے اسلام کی رواداری بے حد پسند آئی جس نے ساری زمین کو مصلیٰ اور دھرتی کا مالک ، خداوند تعالیٰ قرار دیا ہے ۔ ہم قریۃ الخلیل بھی گئے ۔ وہاں کی مسجد کی زیارت کی ۔ اُس کی عالی شان عمارت دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے ۔ اس میں رومی عمارت گری کے آثار آشکارا تھے ۔ مسجد اقصیٰ کی بھی زیارت کی ۔ اس کے صحن کی وسعت سے حیران رہ گئے ۔ محرۂ شریف پہنچ کر اُس کے عظیم الشان گنبد کے نیچے بیٹھ کر اُن خوبصورت عمارتوں کو دیکھتے رہے جنھیں سلطان صلاح الدین[1] نے بنوایا تھا ۔

اس کے بعد بحیرۂ مردار دیکھنے گئے ۔ ہمارے رہنما نے بتلایا کہ سمندر میں بہت سے کیمیاوی ذخائر موجود ہیں جن کے نکالنے سے ملکی باشندے منتفع ہوں گے ۔ واپسی پر مستقبل میں آنے والے یہودی خطرے کا بھی احساس ہوا ۔ اریحا سے ہو کر نہرالشریعتہ گئے ۔ وہاں وہ پل دیکھا جو فلسطین اور شرق اُردن کے درمیان حدِ فاصل ہے ۔

---

۱ ۔ سلطان صلاح الدین : (۵۲۳ - ۵۸۹ھ) مجاہد سلطان جس کے صحیفۂ زندگی کا عنوان عیسائیوں سے جہاد اور بیت المقدس کی بازیافت ہے ۔

نابلس[۱] سے ناصرہ[۲] گئے جو حضرت مسیح علیہ السلام کا شہر ہے۔ طبریہ[۳] پہنچ کر گرمی محسوس ہوئی۔ اردگرد اونچے پہاڑ تھے جن سے گرم پانی کے چشمے پھوٹتے تھے۔ آس پاس حمام بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دمشق پہنچے۔ اس کی زیارت کا بڑا اشتیاق تھا۔ ہمیں اس کے واقعات یاد تھے جبکہ عہدِ اموی میں دمشق، خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا۔ اس کے کارخانوں اور مسجدوں کو دیکھنے گئے۔ مضافات میں جاکر مناظر کی خوبصورتی سے دل بہلایا۔ اس وقت دمشق اور شام میں فرانسیسیوں کی حکومت تھی۔ انھیں ہماری یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ سے ڈر لگتا تھا کیونکہ یہ لوگ اُن کے خیال میں انقلابی تھے۔ ہمیں استعمار کے مخالفوں سے بھی نہ ملنے دیا گیا۔

فرانسیسی حکام عزت افزائی کے بہانے ہمیں گھیرے رہتے اور اپنی مرضیات و نامرضیات کے متعلق اطلاع دیتے رہتے اس پر ہمارا مشاہدہ شاہد ہے۔ جامع اموی کی عظمت، جلال، وسعت اور خوبصورتی نے ہمیں مسحور کر دیا۔ یہاں شیخ الصوفیہ محی الدین بن العربی[۴]، صلاح الدین ایوبی[۵] اور اُن کے استاد نورالدین محمود زنگی[۶]

۱۔ نابلس: فلسطین کا ایک شہر۔ آبادی چالیس ہزار کے قریب ہے۔ اب شرق اردن میں شامل ہے۔
۲۔ ناصرہ: بیت المقدس کے قریب ایک قصبہ ہے۔
۳۔ طبریہ: فلسطین کا ایک شہر۔ آبادی دس ہزار کے لگ بھگ ہے۔
۴۔ شیخ الصوفیہ محی الدین بن العربی: (المتوفی ۶۳۸ھ)۔ مشہور صوفی بزرگ۔ فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ان کی مشہور کتابیں ہیں۔
۵۔ سلطان صلاح الدین ایوبی: مجاہد سلطان (۵۲۳ - ۵۸۹ھ)۔
۶۔ سلطان نورالدین محمود: (۵۱۱ - ۵۶۹ھ)۔ جنھوں نے عیسائی طاقتوں کے چھکے چھڑا دیے۔

کے مزار ہیں ۔ رات کو موسیقی بھی سنی ۔

پھر گاڑی سے حلب[1] گئے ۔ محکمۂ تعلیم کے عہدے دار یہاں ہمارے استقبال کو موجود تھے ۔ ہم ان کے ساتھ شہر میں گھومتے رہے ۔ لوگوں کی سعیٔ عمل اور صفائی بہت پسند آئی ۔ دیکھا کہ ارمنی صنعت پر چھائے ہوئے ہیں ۔ یہاں بھی جامع مسجد اور عظیم الشان قلعہ دیکھا ۔ اس سے سیف الدولہ[2] ، اس کی ادبی مجالس اور متنبی[3] کی معرکہ آرائیوں کی یاد تازہ ہو گئی ۔

اس کے بعد معرۃ النعمان میں ابوالعلاء المعری[4] کا مزار دیکھنے گئے ۔ یہ ایک معمولی سی عمارت تھی جس میں دو کمرے اور چھوٹا سا صحن تھا ۔ ایک کمرے میں قبر تھی اور اس پر کتبہ لگا تھا : "ابوالعلاء احمد بن عبداللہ ابن سلیمان المعری" ۔ قبر پر دیر تک کھڑے رہے اور اس کی لزومیات اور سقط الزند ، دنیا سے نفرت وغیرہ یاد کرتے رہے ۔ اس نے جس بے مثل جرأت سے کام لے کر تقالید اور رسومات پر بے رحم تنقید کی ہے ، رہ رہ کر اس کی یاد آتی رہی ۔

حماۃ[5] سے گزرے اور رہٹوں کو دیکھ کر شاد کام ہوتے رہے ۔ بیروت پہنچ کر کلیۃ المقاصد ، جامعۂ امریکیہ اور مشن کالج دیکھے

---

۱ ۔ حلب : شمالی شام کا صنعتی شہر ۔ آبادی پانچ لاکھ کے لگ بھگ ہے ۔
۲ ۔ سیف الدولہ : (۳۰۳ - ۳۵۶ھ) ۔ امیرِ حلب اور متنبی کا ممدوح ۔
۳ ۔ ابوالطیب احمد متنبی : (۳۰۳ - ۳۵۴ھ) ۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور ترین عرب شاعر جس کے قصیدوں نے سیف الدولہ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے ۔
۴ ۔ ابوالعلاء احمد بن عبداللہ بن سلیمان المعری : (۳۶۳ - ۴۴۹ھ) عرب کا فلسفی شاعر جس کے کلام کا مجموعہ سقط الزند اور لزومیات ہے ۔
۵ ۔ حماۃ : مغربی شام کا ایک شہر ۔ آبادی ستر ہزار کے قریب ہے ۔

اور دخانی جہاز سے واپس اسکندریہ پہنچ گئے۔

اس سفر میں پندرہ دن صرف ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان شہروں اور مقامات کی سیر ہوائی جہاز سے کی ہے یا کوئی فلم دیکھی ہے۔

اس سیر و سفر سے میں نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ ملک کی حیات اجتماعیہ، سیاسی مشکلات اور طبعی مناظر سے واقفیت حاصل کی۔ لیکن مجھے خلوت گزینی کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ اگر کسی دن مجھے عزلت گزینی کی فرصت نہ ملے تو سارا دن اسی دھیان میں گزر جاتا ہے۔

میرے نزدیک سفر کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے جب مشاہدے سے دل بھی متاثر ہو سکے اور انسان کے رگ و پے میں یہ مشاہدہ سما جائے۔ اس سفر میں یہ چیزیں حاصل نہ ہو سکیں اور میری حالت اس اونٹ کی سی تھی جو چلتا چلتا کھاتا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد چبا کر ہضم بھی کر لیتا ہے۔ دعوتوں اور تقریروں کی کثرت نے ہمیں بے حد تنگ کیا۔ مشرق میں کھانا کھلانا اور گپ بازی ہی عزت و تکریم کی نشانی سمجھی جاتی ہے حالانکہ میں امید کرتا تھا کہ اس قسم کی عزت افزائی میں کمی کی جائے گی اور حقیقی استفادے کا زیادہ خیال رکھا جائے گا، خاص کر اہل علم کے معاملے میں۔ پھر بڑی مصیبت یہ تھی کہ میں اکیلا ہی بولنے والا تھا۔ جب کبھی ہمیں کھانے پر بلایا جاتا تو مجھے بھی جواباً تقریر کرنا پڑتی۔ اس سفر میں رسومات کی کمی نہ تھی اور یہی چیزیں سفر کی رونق کو غارت کر دیتی ہیں۔ طبعی طور پر ادیب اور فیلسوف کو جس چیز کا احساس ہوتا ہے وہ ان کے نفس کی گہرائی میں رہ جاتی ہے۔ چاہے وہ یاد رکھے یا بھلا دے، ان سے

کسی وقت فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے ۔

یہاں بیت المقدس کے سفر کا بھی ذکر ضروری ہے ۔ وہاں کی وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے (جمعیت شبان المسیحیة) نے مجھے لکھا تھا کہ میں کسی موضوع پر وہاں آکر دو لیکچر دوں ۔ موضوع کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیا تھا ۔ میں نے اُن کی دعوت قبول کرلی اور مسلمانوں کے موجودہ تمدن اختیار نہ کرنے پر بولنا منظور کر لیا ۔ اس کے بعد میں نے لیکچر تیار کرنے شروع کر دیے اور سفر سے پہلے اُن کی تکمیل کر لی ۔ ناگہاں مجھے قدس ، یافہ[1] اور حیفہ وغیرہ کی جمعیة شبان المسلمین وغیرہ کی طرف سے تار ملے جن میں بغیر کسی وجہ کے مجھے آنے سے روکا گیا تھا مگر میں نے ان تاروں کی مطلقاً پروا نہ کی اور مجوزہ سفر پر روانہ ہوگیا ۔ قدس پہنچا تو میرے استقبال کو جمعیة شبان المسیحیت کا ایک نمائندہ اور میرا ایک شاگرد موجود تھا ۔ جمعیت کے نمائندے نے مجھے اپنے گھر چلنے کو کہا لیکن میں نے معذرت کر دی ۔ میرے شاگرد اپنے گھر میں اکیلے رہتے تھے لہذا میں اُن کے ہاں چلا گیا ۔ پتہ چلا کہ مفتی امین الحسینی[2] ، اسعاف بک النشاشیبی[3] اور استاد ثعالبی نے معذرت کر دی ہے کہ وہ استقبال کے لیے نہ آ سکیں گے اور اُنھوں نے مجھے بلایا ہے ۔ اس کے بعد استاد اسعاف سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ جمعیة شبان المسیحیة کا دفتر تو عیسائیت کی تبلیغ اور انگریزی استعمار کا مرکز ہے ۔ بعض واقعات سے اس کی تائید ہوئی تو مسلمانوں نے اس

---

۱ ۔ یافہ اور حیفہ اب اسرائیل کے قبضے میں ہیں ۔ یہ تاریخی شہر کبھی فلسطین میں شامل تھے ۔

۲ ۔ مفتی امین الحسینی : فلسطینی رہنما جو اب بیروت میں اقامت گزیں ہیں ۔

۳ ۔ اسعاف بک النشاشیبی (۱۸۸۵ - ۱۹۴۸ء) فلسطین کے سیاسی لیڈر ۔

کا بائیکاٹ کر دیا ۔ اب جمعیۃ خطبات کی دعوت دے کر اس بائیکاٹ کو توڑنا چاہتی ہے ۔ میں نے جواب دیا کہ مناسب تھا کہ اخبارات میں اعلان ہونے سے پہلے آپ مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیتے ۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں کوئی تقریر نہ کروں ۔ دوسرے نے درخواست کی کہ میں جمعیۃ شبان المسلمین کے اہتمام میں یہ لیکچر دوں ۔ میں نہ مانا اور کہا کہ یہ لیکچر وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے میں ہوں گے ۔ ہاں اس سے پہلے جمعیۃ شبان المسلمین کے مرکز میں بھی ایک تقریر کر دوں گا ۔ چنانچہ مدرسۃ روضۃ المعارف میں قرآن پاک کی آیت "إن اللہ یامر بالعدل و الاحسان" (اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتے ہیں) کی تفسیر پر لیکچر دیا ۔ میں نے اس سے پہلے ان وجوہات کا ذکر کیا جو اس لیکچر کا باعث تھیں اور کہا کہ اس کے ذمہ دار خود مسلمان ہیں کیونکہ اُن کو لازم تھا کہ بائیکاٹ کے متعلق مجھے بھی اطلاع دیتے ۔ اب وہاں جو لیکچر دوں گا اُس کا عنوان اسلام اور مسلمانوں کی ترقی ہوگا اور اگر مسلمانوں نے موجودہ تمدن میں زیادہ ترقی نہیں کی تو اس کا الزام مغربی استعمار پر ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کی ترقی سے خائف تھا اور اُن کی کمزوری کی تدبیریں سوچا کرتا تھا ۔ اگر یورپ انصاف پسند ہوتا تو اُن کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ۔ چنانچہ میں نے اسی قسم کی تقریر وائی ۔ ایم ۔ سی ۔ اے میں کی جس کا حاضرین پر بڑا اثر ہوا ۔ ان لوگوں کو اقرار تھا کہ ایک عیسائی پادری نے . . . . عیسائیت کی طرف دعوت دی تھی ۔ آخر میں تقریر ہوئی اور میں نے صاف کہہ دیا کہ جس کی مرضی ہو وہ تقریر سنے اور جس کی مرضی نہ ہو وہ نہ سنے ۔ پھر میں نے انصاف اور احسان پر تقریر شروع کی ۔ اس سے پہلے قدس کے اخباروں نے تقریر نہ کرنے کی تحریک کی تھی ۔ جب میں تقریر کرنے گیا تو

معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان نوجوان لوگوں کو جانے سے روک رہے ہیں ۔ اس پر بھی مقام افسوس ہے کہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا ۔

ان لیکچروں کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف اُٹھانا پڑی اور وہاں کے طبعی مناظر سے متمتع نہ ہو سکا ۔ یہ بھی ایک قسم کا سخت درس تھا ۔

—:o:—

۲۴

عراق کی سیر

اگلے سال آرٹس کالج نے چھٹیوں میں عراق جانے کا پروگرام بنایا ۔ اس میں لاء کالج اور آرٹس کالج کے بہت سے اساتذہ اور طالب علم شامل تھے ان کی نگرانی مجھے سونپی گئی ۔ یہ سفر تکلیف دہ تھا ۔ دمشق پہنچ کر موٹروں سے بغداد روانہ ہوئے ۔ یہ چوبیس گھنٹے کا راستہ تھا ۔ پہلے شامی صحرا کو عبور کیا جو لق و دق صحرا تھا ۔ کہیں کہیں جھاڑیاں تھیں ۔ رات دن چلتے رہے ۔ راستے میں چائے یا قہوہ کی ایک پیالی پینے کی خاطر ٹھہر جاتے اور کہیں آرام نہ کیا ۔ اندھیری رات یا سخت سردی یا طوفان میں موٹروں کا چلنا خوفناک ہوتا ہے ۔ دریائے فرات دیکھا تو ہماری جان میں جان آئی ۔ کشتیوں کے پل کو عبور کیا ۔ جس طرح ہارون رشید اور مامون رشید کے زمانے میں رواج تھا اسی طرح کشتیوں کو جوڑ کر پل بنایا گیا تھا ۔ اس کے بعد انبار پہنچے جس کو آج کل فلوجہ کہتے ہیں ۔ انبار نے بہت سے عالم اور ادیب پیدا کیے تھے جن کی نسبت انباری تھی ۔ دجلہ اور فرات کی درمیانی زمین پر ایک گھنٹہ تک چلتے رہے ۔ یہ زمین سرسبز لیکن خالی پڑی تھی اور کاریگروں ، منصوبہ بنانے والوں اور سرمایہ لگانے والوں کی منتظر تھی ۔ میں نے رشید اور مامون کے بغداد کی زرخیزی کا دورِ حاضر سے مقابلہ کیا تو بہت رنج ہوا ۔ ہمارے پہنچنے پر جو پہلا جلسہ ہوا اس میں اپنے رنج کو چھپا نہ سکا ۔ میں نے تقریر میں جدید اور قدیم بغداد کا موازنہ کیا

تھا ۔ ہم جس اراضی پر سے گزر رہے تھے اُس کی صلاحیت تو اچھی معلوم ہوتی تھی لیکن تھی بے آباد ۔ میں نے عراقیوں کو دعوت دی کہ وہ آٹھ کر سونے کے خزانوں سے اپنے دامن کو بھر لیں کیونکہ عراق کی سر زمین پر نہریں رواں ہیں ۔ اس بیان میں ذرہ بھر بھی مبالغہ نہ تھا ۔ بغداد اور انبار کے درمیان کی زمین اس پر شاہدِ ناطق تھی ۔

دوسری تقریر میں اِس غلطی کی تلافی کر دی ۔ عراقیوں نے ملکی اصلاح کے میدان میں جو ترقی کی تھی اُس کو سراہا تھا ۔ دونوں باتیں سچی تھیں لیکن کہنے کا موقع اور محل ہوتا ہے ۔

ہم بغداد میں گھومتے پھرتے رہے ۔ اعظمیہ میں حضرت امام ابو حنیفہ رح[۱] اور کاظمیہ میں امام کاظم[۲] اور جواد[۳] کے مقابر کی زیارت کی ۔ عراق عجائب گھر دیکھا ۔ عراقی شاعروں جمیل الزہاوی[۴] اور معروف الرصافی[۵] سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔ اُن کے اشعار اُن جلسوں میں سنے جو ہمارے اعزاز میں ہوتے تھے ۔ عراقیوں نے ہماری بے حد عزت افزائی کی ۔ رمضان کا مہینہ تھا لیکن کوئی رات ہماری ضیافت کے بغیر نہ گزرتی تھی ۔ ایک رات میں تو ہم تین جگہ مدعو تھے ۔ مجبوری سے یہ دعوتیں قبول کرنی پڑیں ۔ مرحوم شاہ فیصل[۶] نے

---

۱ ۔ حضرت امام ابوحنیفہ : امامِ اہل السنت و الجماعت جن کی فقہ پر عام مسلمانوں کے عمل کا دار و مدار ہے ۔

۲ ۔ حضرت امام کاظم ؑ (۱۲۸ - ۱۸۳ھ) اثنا عشری شیعوں کے ساتویں امام ۔

۳ ۔ حضرت محمد جواد ؑ : اثنا عشری شیعوں کے نویں امام ۔

۴ ۔ جمیل الزہاوی : جدید عراق کے ایک شاعر ۔

۵ ۔ معروف الرصافی : (۱۸۸۷ - ۱۹۴۵ع) عراق کے قومی شاعر ۔

۶ ۔ شاہ فیصل : (۱۸۸۳ - ۱۹۳۳ع) والئی عراق ۔ خود مختار عراق کے پہلے فرماں روا ۔

ہمیں افطاری پر بلایا تھا ۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا عراق جیسے ملک میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت ضروری ہے ؟ اگرچہ اس سے تعلیم یافتہ طبقے میں بے کاری پیدا ہو جائے ، یا بقدر ضرورت تعلیم کی حاجت ہے ۔ یہاں جواب کے نتیجہ میں ایک اور سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا اعلیٰ تعلیم کے لیے مدارس قائم کیے جائیں یا چند لوگوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ وغیرہ بھیجا جائے ۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مجھے جواب سوجھا ۔ میں نے جواب دیا کہ قوم کی بھلائی اس میں ہے کہ مدارس عالیہ قائم کیے جائیں پھر ان مدارس سے جو بہترین طلبہ پڑھ کر نکلیں ان کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جائے ۔ بہرحال جو بھی کچھ ہو اعلیٰ تعلیم سراسر خیر و برکت ہے ۔ بعد میں پتہ لگا کہ ملک میں یہ دونوں مسئلے چھڑے ہوئے ہیں اور شاہ فیصل کا اس بارے میں سوال کرنا اسی فکری نزاع کا نتیجہ تھا ۔ میں نے محسوس کیا کہ عراق کی آبادی شیعوں اور سنیوں پر مشتمل ہے ۔ ہم نے نجف ، کربلا وغیرہ کی بھی زیارت کی ۔ یہ شیعوں کے مراکز ہیں ۔ اب حضرت علیؑ کی شہادت کے ایام تھے ۔ لوگوں کو دیکھا کہ حضرت علیؑ کے ماتم میں سینہ کوبی کر رہے تھے ۔ بعض اپنے کو تلواریں مار رہے تھے ۔ بعض لوہے کی زنجیروں سے اپنی پیٹھ زخمی کر رہے تھے ۔ قاہرہ کی شیعہ عورتوں کی طرح یہاں بھی عورتیں نوحہ و بکا میں مصروف تھیں ۔ ان مناظر کو دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا ۔ میرے خیال میں ان اعمال کے ذمہ دار علماء ہیں ۔ ان میں بڑے فاضل ہیں جن کا عوام پر گہرا اثر ہے ۔ اگر وہ چاہیں تو ایک دفعہ کے کہنے سے ان افعال کو روک سکتے ہیں لیکن معلوم نہیں کہ وہ خاموش کیوں ہیں ۔

عراق میں شیعوں اور سنیوں کا اختلاف ملک پر بڑی مصیبتیں

بھی لایا ہے ۔ اس معاملے میں جتنی کوشش ہوئی ہے اگر اس میں سنی و شیعہ مصالح کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام لوگوں کی بھلائی مد نظر ہوتی تو نتیجہ بخیر نکلتا ۔ اصحاب علیؓ و معاویہ کے زمانے میں اس جھگڑے کی شاید کوئی معقول صورت نظر آتی ہو وگرنہ موجودہ زمانے میں اس جھگڑے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ۔ نزاع تو صرف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر افضل ہیں یا حضرت علیؓ ۔ اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے ۔ عقلمندوں کا تو اتفاق ہے کہ ان تینوں کے بہت سے فضائل اور خصوصیات آئی ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اعمال کی جزائے خیر دیں گے ، سوائے اس کے شیعہ و سنی کا اختلاف حنفی ، شافعی اور مالکی جیسا ہے جس کے لیے جھگڑے اور نزاع کی بالکل ضرورت نہیں ، لیکن ہمیشہ سے تنگ نظری ، عوامی جذبات ، بعض دینی عالموں کی مصلحتوں اور سیاسی مسائل کو دینی رنگ دینے سے لوگوں میں فساد برپا ہوا ہے ۔ جب میری کتاب فجرالاسلام شائع ہوئی تو بہت سے شیعوں نے اس سے غلط تاثر لیا ۔ مجھے تو اس کا گمان بھی نہ تھا ۔ میرا خیال تھا کہ علمی اور تاریخی بحث ایک علیحدہ چیز ہے اور اس زمانے کی عملی زندگی کچھ اور ۔ لیکن عراق اور شام کے شیعوں میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی اور اس کی رد میں تیز و تند مقالات اور کتابیں لکھی گئیں ۔ اس پر میں نے برا نہیں منایا ۔ جب عراق میں شیعوں کے بڑے عالم استاد آل کاشف الغطاء[1] سے ملنا ہوا تو انہوں نے بھی برہمی کا اظہار کیا اور مجھے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو لازم تھا کہ شیعوں کی مستند کتابوں کی طرف رجوع کرتے ۔ بعض

---

۱ ۔ استاد آل کاشف الغطاء : شیعوں کے بڑے مجتہد جو اتحاد بین المسلمین کے پرجوش مبلغ ہیں ۔

جگہ تو اُن کی یہ رائے صحیح معلوم ہوئی لیکن جب میں نے ضحی الاسلام میں اُن کی کتابوں سے استناد کرتے ہوئے اُن کی بعض آراء پر نقد و احتساب کیا تو پھر بھی خشمگین ہوئے۔ حق بات تو یہ ہے کہ میں نہ سنیوں کا طرف‌دار ہوں نہ شیعوں کا۔ میں نے شیعہ اور سنی دونوں مذاہب پر تنقید کی تھی اور معتزلیوں کو بڑھا چڑھا کر لکھا تھا۔ میرے اعتقاد میں سنیوں نے ان سے پورا انصاف نہیں برتا تھا۔

میں بغداد میں تھا تو ایک خطرناک حادثہ رونما ہوا حضرت علیؓ کی شہادت کی یاد میں شیعہ حضرات مجالس عزا منعقد کرتے ہیں۔ ہمیں بھی یہ مجلس دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ کرخ[1] میں حسینیہ کی طرف گئے تو ایک بڑا وسیع مکان دیکھا جس میں کم ازکم چار ہزار آدمی ہوں گے۔ لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ مصری وفد آ رہا ہے۔ وہ استقبال کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ہمارے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی گئی۔ بعض خطباء نے ہمارا خیر مقدم کیا اور استاد عبدالوہاب عزام[2] نے بھی اس کا مناسب الفاظ میں جواب دیا پھر استاد کاظم الکاظمی کھڑے ہوئے۔ یہ بڑے خوش بیان خطیب ہیں جن کا سننے والوں پر بڑا گہرا اثر ہے۔ اُنھوں نے وفد اور احمد امین کو خوش آمدید کہا۔ فجرالاسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں شیعوں سے بے انصافی ہوئی ہے۔ حاضرین میں اکثریت شیعوں کی تھی۔ اُنھوں نے یہ سنا تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ جو بھی اُن کے عقیدے کے خلاف لکھتا ہے اُسے بے دھڑک سزا دینے پر اُتر آتے ہیں لیکن استاد کاظمی ماہر خطیب تھے۔ جب انھوں نے لوگوں کی ناراضگی

---

۱ - کرخ : بغداد کا ایک محلہ ہے۔

۲ - استاد عبدالوہاب عزام : سابق سفیر مصر متعینہ پاکستان متعدد عربی کتابوں کے مصنف اور پیام مشرق کے مترجم -

اور ہیجان کو دیکھا تو فجر الاسلام کا ایک فقرہ لے کر جس میں شیعوں کی تعریف تھی ، پڑھنے لگے ۔ اس طرح یہ شیعوں کے جذبات بھڑکاتے اور ٹھنڈے کرتے رہے ۔ بعض حاضرین نے یہ معاملہ بڑھتا اور انجام بخیر نہ دیکھا تو پچھلے دروازے سے ہمیں واپس جانے کا مشورہ دیا ۔ اس طرح ہم جانیں بچا کر چلے آئے ۔ معلوم ہوا کہ شاہ فیصل تک یہ خبر پہنچی تو بہت ناراض ہوئے اور خطیب کو سزا دینی چاہی لیکن قاصد سے ہم نے کہہ دیا کہ ایسا نہ کیا جائے ۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر و خوبی ختم ہوا ۔

ہم نے سامرا کی زیارت کا ارادہ کیا ۔ ہمیں بتلایا گیا تھا کہ بغداد اور سامرا کے درمیان دو گھنٹے کی مسافت ہے ۔ ہم نے سوچا تھا کہ زیارت کے بعد واپس آ کر مصری قونصل کے ہاں روزہ افطار کریں گے لیکن موٹروں کی سست رفتاری کی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے ۔ ہم نے قونصل کو تار دے دیا تھا کہ افطاری کے بجائے ہمارے لیے سحری کا انتظام کر رکھے ۔ راستے میں بےکار کنوئیں اور خالی زمین نظر آئی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کبھی آبادی ہوگی ۔ دریائے دجلہ کے پل کو عبور کر کے سامرہ[1] کے کھنڈرات دیکھے ۔ معتصم کی جامع مسجد کی زیارت کی ۔ مصر میں ابن طولون کی مسجد خاص کر اس کے مینار اسی طرز پر بنے ہوئے ہیں ۔ اس کے باقی ماندہ آثار دیکھے ۔ واپس ہونے لگے تو رات ہو چکی تھی ۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب واپسی مشکل ہے کیونکہ راستہ پُر خطر تھا ۔ جب ہم نے اصرار کیا تو قصبہ کے رئیس نے ہماری حفاظت کے لیے ایک مسلح موٹر ہمارے ساتھ کر دی ۔ ایک طالب علم دجلہ کا پل عبور کرتے

---

۱ ۔ دور عباسی کا ایک شہر ۔

ہوئے دو شہتیروں کے درمیان گر گیا ۔ میں نے نکالنے والے کو بلایا ۔ اُس وقت سخت سردی پڑ رہی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم نے اُس کو صحیح و سالم باہر نکال لیا ۔ بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر اُس کو دوسرے کپڑے پہنائے ۔ تاپنے کے لیے آگ جلائی ۔ اس طرح یہ حادثہ بخیر و خوبی ختم ہوا ۔

ہم سفر کر رہے تھے کہ موٹر کیچڑ میں دھنس گئی ۔ ہم نے نیچے اُتر کر اُسے باہر نکالا ۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ ایک مرتبہ چوروں نے قافلے پر حملہ کر دیا تھا ۔ ہمیں تو یہ سن کر بڑا ڈر لگا ۔ جب بغداد خبر پہنچی کہ ہمیں اس قسم کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا ہے تو بغداد کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کچھ فوجیوں کو لے کر ہماری مدد کو نکلے لیکن وہ ہمیں راستے میں مل گئے ۔ بعد از خرابیٔ بسیار ہم فجر کے بعد بغداد پہنچے ۔ افطاری اور سحری سے محروم رہے ۔ یہ دن ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا کیونکہ اس روز بہت تکلیف اُٹھانی تھی ۔

ایک دن موصل[1] کا ارادہ کیا ۔ گاڑی سے کرکوک[2] پہنچے لیکن شدید بارش کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے اور کرکوک سے واپس بغداد پلٹ گئے ۔ پھر تدمر[3] کی جانب نکل کھڑے ہوئے ۔ اُس کے گلی کوچوں کی سیر کی ، مقابر اور آثار کو دیکھا اور کھنڈرات پر کھڑے ہو کر وہاں کے لوگوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔ زبا[4] دیکھ کر اُس کی قدیم تاریخ آنکھوں کے سامنے پھر گئی ۔ یہاں

---

۱ ۔ موصل : عراق کا صنعتی شہر ۔ آبادی ایک لاکھ سے اوپر ہے ۔

۲ ۔ کرکوک : تیل کے چشموں کے لیے مشہور ہے ۔

۳ ۔ تدمر : شمالی شام کا ایک قصبہ ، آبادی دس ہزار کے قریب ہے ۔

۴ ۔ Zenobia -

رات گزار کر دمشق ہوتے ہوئے بیروت پہنچے پھر لبنان کے اونچے اونچے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کو قطع کرتے ہوئے بخیر و عافیت واپس قاہرہ پہنچ گئے۔ عالم عرب کی مختلف تصویریں ہمارے ذہن پر مرتسم تھیں۔ فلسطین، شام، عراق، لبنان سب کی اجتماعی زندگی یکساں تھی۔ مشرق کی خوبیاں اور برائیاں سب میں پائی جاتی تھیں۔ اگر مصر موجودہ تہذیب اور ثروت میں سب سے آگے ہے تو لبنان لوگوں کی سعی عمل، خوش طبعی، تعلیم اور نسوانی ترقی میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ شام تجارت اور کاروبار کے لحاظ سے مقدم ہے۔ عراق ابھی تک رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے لیکن ملک کے نوجوان علمی و اقتصادی میدان میں بڑھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر ملک کی حکومت کو سست رفتاری، احتکار کی کمی، اقتصادی اور اجتماعی اصلاح کے لیے رسم الخط کی تبدیلی کے لیے مطعون کیا جاتا ہے۔ یہ سب چیزیں نظام حکومت کے لیے معیوب اور رعایا کے حقوق سے لاپروائی کا موجب بنتی ہیں۔ یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ رعایا کو اپنے حقوق اور فرائض کا احساس نہیں۔ ہر ملک کی اپنی اپنی مشکلات ہیں۔ لبنان کی آبادی عیسائیوں اور مسلمانوں میں منقسم ہے۔ آبادی کا بڑا طبقہ فرانسیسیوں کا حامی یا سخت مخالف ہے۔ فلسطین کے سیاسی لیڈر غلبے اور اقتدار کے بھوکے ہیں حالانکہ یہودیت کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ عراق کی آبادی شیعوں اور سنیوں، شہریوں اور بدوؤں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان سب چیزوں نے میرے فکری شعور کو بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۳۷ء میں، میں نے مصری وفد کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے حجاز کا سفر اختیار کیا۔ میں راستوں اور مرحلوں کو یہاں بیان کر کے بیان کو طول نہیں دینا چاہتا۔ کسی دوسری جگہ اس کا تفصیل سے ذکر کر

چکا ہوں ۔ حاجی چونکہ دینی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اس لیے راستے کے مصائب اور قانون کی بے ضابطگی کا انھیں احساس نہیں ہوتا یا اگر احساس بھی ہوتا ہے تو وہ دینداری کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے ۔ یا پھر محاسن ہی کا ذکر کرتے ہیں ۔ میں بھی حج کے موقع پر دینی جذبے سے سرشار تھا ۔ بعض مواقع پر تو میرے دل پر چوٹ سی لگی اور میں اشکبار ہو گیا ۔ کعبے کا مشاہدہ اور طواف ، عرفات میں قیام وغیرہ ذکر کے قابل ہیں ۔ لاکھوں انسان سفید احرام میں ملبوس ، دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے اور گڑگڑا کر اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی اور آئندہ زندگی نیکی اور تقویٰ سے بسر کرنے کی توفیق مانگ رہے تھے ۔ پھر حرم مدنی کی زیارت ، آنحضرت صلعم کے روضۂ اقدس کے سامنے قیام ، ان سب واقعات کی تاریخیں مجھے ازبر ہیں اور ان کی عظمت نقش ۔ حقیقت میں یہ سب حیرت ناک اور عظیم الشان واقعات تھے ۔

لیکن میں تکالیف اور اُن کے اصلی سرچشمے اور مصری ادارۂ حج کی کارگزاریوں اور کوتاہیوں کو بھی دیکھ رہا تھا اور اُن کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا تھا ۔ ایامِ حج میں لوگوں کا اژدھام ہوتا تو آمد و رفت بڑھ جاتی ، خاص کر میدانِ عرفات سے منیٰ تک ۔ اس میں تنظیم اور ترتیب پیدا کرنے کے لیے توجہ کی سخت ضرورت ہے ۔ منیٰ میں پانی کی قلت بھی پیدا ہو جاتی اور اُس کا ملنا دشوار ہو جاتا ۔ اس کے لیے بھی کسی نظم کی ضرورت ہے ۔ حرم مکی اور مدنی کے اردگرد اور سڑکوں پر صفائی کا کسی کو دھیان نہ تھا ۔ جدہ اور مدینے کے درمیانی راستے کی بھی حالت ابتر تھی ۔ میں ان سب باتوں کو دیکھتا اور اُن کی اصلاح کی فکر کرتا ۔ مجھے یقین

تھا کہ ادارۂ حج عالم اسلام کے تعاون سے ان خامیوں کی اصلاح کر سکتا ہے اس کے بغیر حجاج فراغ خاطر سے عبادت نہیں کر سکتے جس کے واسطے وہ عازم حج ہوتے ہیں ۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان تکالیف کا اچھی طرح سے مطالعہ کر کے ان کے ازالے کی تدابیر سوچی جائیں اور اُن کا برملا پرچار کیا جائے کیونکہ خاموش رہنے سے تو یہ بہرحال اچھا ہے ۔ میں نے یہ سوچ کر ایک تقریر تیار کی جس میں تمام نقائص اور اُن کے طریقِ اصلاح کی تدابیر بتلائی تھیں ۔ حکومت حجاز نے امن قائم کرنے اور حاجیوں کو آرام پہنچانے کی جو کوشش کی تھی اُس کا بھی اعتراف کیا تھا ۔ یہ تقریر لکھ کر مصری وزارت خارجہ اور جامعہ کو بھیج دی ۔ اس کا خلاصہ مصری ریڈیو پر بھی سنا دیا ۔ اس پر مرحوم طلعت پاشا حرب[1] نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا ۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر ان مسائل کو زیادہ ابھارا جائے گا اور سفر حج کی تکالیف اور شدائد کو بیان کیا جائے گا تو بہت سے حج کو جانے والے دل برداشتہ ہو جائیں گے ۔ میں نے اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا کہ میرا مطلب ان عیوب کی اصلاح سے ہے ۔ آخرکار ہم دونوں نے اتفاق کیا اور فیصلہ کیا کہ میں اپنی تقریر کو ریڈیو یا اخبارات میں شائع نہ کراؤں بلکہ حکومت حجاز کو لکھ کر بھیج دوں اور دونوں حکومتیں مل کر ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں ۔

—:o:—

۱ ۔ طلعت پاشا حرب : (۱۸۷۶ - ۱۹۴۱ء) مصر کے صنعت کار اور بنک مصر کے بانی ۔

۲۵

سفر یورپ

۱۹۳۲ع کے اواخر میں یورپ جانے کا موقع ملا - میں مشرقی تہذیب کو دیکھ چکا تھا - اب مغربی تہذیب و تمدن کے دیکھنے کی باری تھی - قدامت پسندوں کے بعد جدت پسندوں کو دیکھنا چاہتا تھا تاکہ میری نظر میں کشادگی پیدا ہو سکے - مجھے مؤتمر المستشرقین میں مصری نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا جو کہ لیڈن (ہالینڈ) میں منعقد ہونے والی تھی - میں نے جلسے کے انعقاد سے دو ماہ قبل سفر کا پروگرام بنایا تاکہ یورپ کی اچھی طرح سیر و سیاحت کر لوں - مارسیلز تک اپنے دوست عبدالرزاق السہنوری[1] کے ساتھ سفر کیا وہ فرانس کے شہروں اور باشندوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے کیونکہ اُنھوں نے دو سال وہاں رہ کر قانون کی تعلیم حاصل کی تھی - ہم نے مارسیلز کے مضافات کی سیر کی - لیون جا کر تین دن ٹھہرے رہے - وہاں کے آثار اور یونیورسٹی کو دیکھا - دیہات میں بھی گئے - پیرس میں دس دن گزارے - فرانسیسی پارلیمنٹ کے ساتھ ہوٹل تھا اُس میں جا کر ٹھہرے - میرے دوست نے بڑی سوچ کے بعد میرے لیے ایک جامع پروگرام بنایا تھا تاکہ مجھے پیرس کی مختلف النوع زندگی کا مشاہدہ کرائے - علوم و فنون کی مجالس کے علاوہ شاندار عمارات بھی دکھلائے - شہر اور مضافات کی سیر کرائے - یہ لائحہ عمل

---

۱ - عبدالرزاق السہنوری : سابق وزیر تعلیم مصر -

کچھ مشکل سا تھا ۔ صبح اور شام دیکھنے اور دکھلانے میں گزر جاتے اور مجھے استراحت کا کوئی موقعہ نہ ملتا ۔ مجھے دھیرے دھیرے حرکت کرنے اور کھانے پینے کی عادت ہے ۔ کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام بھی کر لیا کرتا ہوں ، لیکن پیرس میں آ کر یہ آرام کہاں ؟ ہم نے باسٹیل کا میدان ، پیرس کے شوارع ، ماڈلین کا گرجا ، کونکور کا میدان اور شانزلیزہ کی سیرگاہ دیکھی ۔ ایفل کے مینار پر بھی چڑھے ۔ شام کو تھیٹر میں جا کر ڈرامے دیکھے ۔ پیرس کی یونیورسٹی دیکھی ۔ ایک دن بولونیا کے جنگلات بھی جا کر دیکھے ۔ لکسمبرگ کے باغات اور محل سراؤں اور گرجاؤں کا مشاہدہ کیا ۔ ظروف سازی کا کارخانہ بھی دیکھا ۔ پیرس کے قومی کتب خانے میں جا کر کتابوں کو سرسری نظر سے دیکھا ۔ ایک دن صبح سویرے اٹھ کر بازاروں میں خرید و فروخت کا منظر بھی دیکھا ۔ پیرس کے نواح میں وہاں کے خوش منظر دیہات بھی دیکھے ۔ سہنوری کے بعض دوستوں نے ہمیں اپنے گھر دکھلائے اور ہم نے ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا ۔ یہ دس دن خوب دوڑ دھوپ میں بسر ہوئے اور سوائے رات کے میں نے بالکل آرام نہیں کیا ۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن پروگرام کے مطابق ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا ۔ کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے کہ موسلادھار مینہ برسنے لگا ۔ مجھے تو آرام کرنے کا خیال ستانے لگا لیکن میرے ساتھی پروگرام میں کوئی تبدیلی کرنے کے روادار نہ تھے ۔ چنانچہ ہم بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے سیر کے لیے چل کھڑے ہوئے ۔

ان دس دنوں میں قابلِ دید مقامات دیکھتے دیکھتے میں تنگ سا آ گیا تھا ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں سنیما دیکھ رہا ہوں جس کے واقعات یاد رکھنے کے لیے کئی سال درکار ہوں گے ۔ اس کے بعد میں

اپنے دوست کو الوداع کہہ کر انگلستان روانہ ہوگیا۔

استاد عبدالرزاق سہنوری نے میرے دوسرے دوست کو انگلستان تار دیا تھا کہ میرے لیے رہائش کا بندوبست کر چھوڑے اور سٹیشن پر آکر مجھے ملے۔ ہم نے ڈوفر تک جہاز میں سفر کیا اور ریل گاڑی میں لندن پہنچے۔ میرے دوست میرے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کمرہ دکھلایا۔ یہ کمرہ صاف ستھرا اور ایک متوسط درجے کے گھرانے کا تھا۔ محلہ بھی اسی قسم کا تھا۔ لینڈ لیڈی (گھر کی مالکہ) نے کھانے وغیرہ کا بھی بندوبست کیا تھا۔ ناشتہ ہوٹل میں ہوتا۔ جہاں میری رہائش تھی وہاں ایک انگریز خاتون سے، جو نسلاً جرمن تھی، میری واقفیت ہوگئی۔ میں نے اُس سے لندن کی سیر کرانے کو کہا تو اُس نے میری درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ پہلے ہم برطانوی عجائب گھر میں گئے اور بعض مخطوطات دیکھے۔ کارپوریشن، بنک آف لندن، پارلیمنٹ کی عمارتیں، ٹائمز کا دفتر، نلسن کا مجسمہ، ابی کا گرجا، لندن یونیورسٹی، قصر سینٹ جیمز، ہائیڈ پارک اور جنگی عجائب گھر بھی دیکھے۔ لندن پہنچ کر میں نے کچھ اپنائیت سی محسوس کی کیونکہ میں انگریزی زبان سمجھتا تھا۔ فرانس میں تو مجھے اپنے دوست کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ میں کہیں باہر نکلتا تو اپنے دوست کے ساتھ۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو قہوہ نوشی میں مصروف رہتا یا گونگے بہروں کی طرح بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ کوئی مسافر فرانس سے انگلستان وارد ہوتا ہے اور جوں ہی وہ انگلستان کی زمین پر قدم دھرتا ہے تو اسے قلی گھیر لیتے ہیں اور اُس کا سامان گاڑی تک اس پھرتی سے پہنچا دیتے ہیں جس طرح کوئی مشین کام کرتی ہے۔

مجھے انگلستان کے دیہات دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میرے دو

دوستوں ، استاد حافظ وہبہ سفیرِ مملکتِ سعودیہ اور استاد امین جمال الدین (نگران مصری طلبہ) نے ویلز جانے کا پروگرام مرتب کر لیا ۔ استاد وہبہ نے گاڑی مہیا کر دی اور استاد جمال الدین نے ہمیں دیہات کی پر لطف سیر کرائی ۔ ہم آہستہ آہستہ سفر کرتے تھے ۔ کھانے کا وقت آتا تو راستے میں جہاں ہوٹل ملتا اتر کر کھڑے ہو جاتے۔ شام ہوتی تو مکان تلاش کر کے شب بسری کر لیتے ۔ اس طرح پھرتے پھراتے کارنافون پہنچے اور وہاں ایک دن قیام کیا ۔

میں نے انگلستان میں چالیس دن گزارے اور کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ملک کو اچھی طرح دیکھ لوں اور حیات اجتماعیہ کا مطالعہ کر لوں لیکن ایک افسوس ناک واقعہ ہوا ۔ میں نے اپنا لیکچر عربی میں تیار کیا تھا لیکن مجھے بتلایا گیا کہ مؤتمر المستشرقین کی سرکاری زبان انگریزی یا فرانسیسی ہے ۔ مجھے ایک مترجم اور ٹائپ رائٹر کا اانتظام کرنا پڑا جس کی وجہ سے بڑا وقت برباد ہوا ۔ اس وقت میں نگلستان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو دیکھا جا سکتا تھا اور قدرتی مناظر کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا تھا ۔ آخرکار میں نے لیڈن[1] کی راہ لی ۔ جہاں کہ مؤتمر المستشرقین ہو رہی تھی ۔

لیڈن بھی دیکھا گویا وہ ایک بڑا معبد ہے جہاں لوگ علم کی پوجا کرتے ہیں ۔ علماء اور کتب خانوں کی کثرت ہے ۔ یہاں بریل کا مشہور مطبع ہے جس نے عربی کی بہت سی کتابیں چھاپ کر شائع کی ہیں ۔ ہم نے مؤتمر کے سیکریٹری کو رہائش کے انتظام کے لیے لکھا تھا وہاں پہنچ کر جب اپنے کمرے دیکھے تو کچھ پسند نہ

---

۱ ۔ لیڈن : ہالینڈ کا ایک مشہور شہر ۔

آئے کیونکہ وہ ہوسٹل کے کمرے معلوم ہوتے تھے ۔ ہم نے دوسری جگہ رہنا پسند کیا جہاں سے ہر روز لیڈن آ جاتے تھے ۔ اس سفر میں ڈاکٹر ابراہیم بیومی' مدکور میرے ہمراہ تھے ۔ اُن کی وجہ سے بہت اچھا وقت گزرا ۔ اُنہوں نے بہت سے کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا ۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے ۔

آخرکار مؤتمر کا جلسہ ہوا ۔ ہم نے اسلامیات ، ادب عربی اور ہندوستان اور چین کے متعلق مستشرقین کی تقریریں سنیں ۔ اس کے بعد میری باری آئی ۔ میرے مقالے کا عنوان "نشاۃ المعتزلہ" تھا ۔ یہ دن میرے لیے بھاری تھا کیونکہ میں نے کبھی انگریزی میں تقریر نہ کی تھی ۔ صرف انگریزی سمجھنے اور پھر انگریزی سے عربی میں ترجمہ کرنے کی مہارت پیدا کی تھی ۔ انگریزی لکھنے یا تقریر کرنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا ۔ اُس روز جلسے کے استاد مارگو لیوتھ[2] تھے ۔ پہلے تو میں نے عربی میں مقالہ پڑھنے کی اجازت مانگی لیکن وہ نہ مانے اور کہنے لگے کہ اکثر مستشرقین صرف واجبی سی عربی جانتے ہیں ۔ انگریزی میں مقالہ پڑھنا مناسب ہوگا ۔ میں نے شرماتے ہوئے مقالہ پڑھا ۔ شرمساری کی وجہ موضوع اور تحریر نہ تھی ، صرف انگریزی میں تقریر کرنے کا پہلا موقع تھا ۔ جب مقالہ ختم ہوا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ۔

ہالینڈ سے ہم واپس آ کر پیرس ٹھہرے اور یہاں کئی دن گزارے ۔ یہاں میرے دوست ڈاکٹر محمد عوض محمد استقبال کے لیے موجود تھے جو پہلے دوست کی طرح سخت مزاج نہ تھے بلکہ ہمدرد

---

۱ ۔ ڈاکٹر ابراہیم بیومی مدکور : ایک مصری فاضل ۔
۲ ۔ استاد مارگولیوتھ : پروفیسر عربی آکسفورڈ یونیورسٹی ۔

تھے ۔ انھوں نے بہت کچھ دکھلایا جو میں نے ابھی تک نہ دیکھا تھا ۔ اُن کی وجہ سے میں نے آرام اور آسائش بھی پائی ۔ مار سیلز سے جہاز پر بیٹھ کر مصر روانہ ہوئے ۔ راستے میں جہاز کر لقصان پہنچا تو ہم اٹلی اُتر پڑے ۔ قریب کے شہروں میلان وغیرہ کی سیر کی ۔ وہاں کے گرجاؤں ، عمارتوں اور مقبروں کو دیکھا ۔ جدید تہذیب کے مظاہر دیکھنے کے بعد ہم واپس مصر پہنچ گئے ۔ میں نے مغربی اقوام کی ترقی کے راز کو بھی سمجھا ۔ اس سے پہلے میرا ذہن مشرق اور مغرب کے مقابلے و موازنے میں مصروف رہا کرتا تھا ۔ جب میں آلات اور کارخانوں ، بازاروں اور گھروں کی صفائی ، لوگوں کا نظم و ضبط ، حیات اجتماعیہ میں عورت کی اہمیت دیکھتا تو مشرق اور مغرب کے درمیان مقابلہ پھر مجھے یاد آ جاتا ۔ مغربی تمدن کی فضیلت کا سہرا عورت کے سر ہے ۔ وہ بچوں کی پرورش کرتی اور اُن کو نظم و ضبط کا خوگر بناتی ہے ۔ اس ترقی میں بارش بھی اپنا پارٹ ادا کرتی ہے اور مناظر طبعیہ کو خوبصورتی عطا کرتی ہے ۔ پہاڑوں کو سبزے کا لباس پہناتی ہے ۔ مختصر طور پر عورت اور بارش کا مغربی تہذیب و تمدن کے ہر مظہر کے پیچھے ہاتھ ہوتا ہے ۔ اگر میں کہہ دوں کہ ان قوموں کی ترقی کا اندازہ عورتوں کی ترقی اور بارش کی کمی بیشی سے کیا جا سکتا ہے تو کچھ بعید نہ ہوگا ۔ مجھے فرانسیسیوں کی ذہانت اور خوش طبعی ، انگریزوں کا نظم و ضبط ، سوجھ بوجھ ، متانت اور سنجیدگی ، ولندیزوں کی صفائی ، زندگی اور علم میں جد و جہد اور اٹلی کا آرٹ بہت پسند آئے ۔ میں نے اس سفر سے اتنا فائدہ اُٹھایا جس کا احاطہ کرنا میرے لیے دشوار ہے ۔ ہمیشہ موقع و محل کے پیش نظر میں معلومات کے اس خزانے سے فائدہ اُٹھاتا تھا ۔ مشرق اور مغرب میں مقابلہ کرنے کی اہلیت بھی اسی سفر سے پیدا ہوئی ۔

اس سے پہلے تو ایک ہی رنگ اور ایک ہی آواز سے میں شناسا تھا ۔

استفادے کا دوسرا موقعہ ۱۹۳۸ع میں یورپ کے سفر سے ہاتھ آیا ۔ جامعہ مصریہ نے مجھے نمائندہ بنا کر برسلز میں مؤتمرالمستشرقین میں بھیجا تھا ۔ اس ضمن میں اٹلی اور فرانس کی دوبارہ سیر کی جس سے ماضی کی یادیں تازہ ہوگئیں ۔ اس دفعہ سوئزر لینڈ جا کر لوزان میں کئی دن ٹھہرا ۔ ایک کشتی لےکر وہاں کے قدرتی مناظر سے خوب لطف اندوز ہوا ۔ ہم ایک دن اپنے دوست عبدالوہاب عزام[1] کے ہمراہ بحیرۂ لوزان کی سیر کر رہے تھے ۔ ساحل سمندر پر ایک گاؤں کا منظر بڑا پسند آیا ۔ وہاں جا کر خوب گھومے اور پھرتے رہے ۔ گاؤں کی چوٹی پر ایک ہوٹل تھا اور بہت سے مکانات بھی تھے ۔ جنگل میں ایک چھوٹا سا گھر دیکھا جس کے سامنے سیب کے درخت اُگے ہوئے تھے ۔ مالک سے پوچھا کہ کیا وہ ہمیں مہمان بنانے کے لیے تیار ہے ؟ جب وہ مان گیا تو ہم نے ہوٹل سے سامان لا کر اُس کے ہاں رکھ دیا ۔ وہاں کئی دن ٹھہرے رہے ۔ جنگلوں اور مزروعہ پہاڑوں کے منظر سے خوب لطف اٹھاتے رہے ۔ کھیتوں میں گائیں چر رہی تھیں ۔ ہر ایک گائے اپنے قد و قامت کے لحاظ سے ایک گھنٹی بھی اٹھائے ہوئے تھی ۔ یہ گھنٹیاں بجتیں تو عجیب نغمہ سا پیدا ہوتا اور اس وسیع فضا میں سننے والوں کو مبہوت کر دیتا ۔ ہم گائیوں کے گھروں کو دیکھتے اور کہتے "کاش کہ مصر کے کسانوں کو بھی ایسے گھر میسر آ جائیں ۔" یہ مکانات بالکل صاف ستھرے اور بجلی سے روشن تھے ۔ ان کا فرش لکڑی کا تھا ۔ ہر ایک گائے کے

---

۱ ۔ استاد عبدالوہاب عزام : سابق سفیر مصر متعینہ پاکستان جنھوں نے اقبال کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے ۔

لیے خواب گاہ اور چلنے پھرنے کی جگہ متعین تھی جس کے باہر وہ نکل نہیں سکتی تھی ۔ گھروں میں صفائی اور پاکیزگی کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا ۔ یہ اگست کا مہینہ تھا لیکن سردی اتنی تھی جتنی کہ مصر میں سخت جاڑوں میں ہوتی ہے ۔

سوئٹزر لینڈ کی خوبصورتی اور اس کی عمدہ ہوا سے صحت یاب ہو کر ہم برسلز روانہ ہو گئے ۔ گزشتہ واقعہ سے میں نے سبق سیکھا تھا اور قسم کھائی تھی کہ عربی میں تقریر کروں گا ۔ خوش قسمتی سے اکثر سامعین اچھی طرح سے عربی سمجھتے تھے ۔ میرے خطاب کا عنوان "ابوحیان توحیدی"۱ اور اس کی کتاب "الامتاع و الموانسة" تھا ۔ اس مرتبہ میں مواد سے مسلح تھا اور زبان بھی میری اپنی تھی اس لیے کامیاب رہا ۔ برسلز میں ایک پر لطف واقعہ ہوا ۔ میں ایک حجام کے ہاں گیا جو انگریزی نہیں سمجھتا تھا اور میں فرانسیسی سے نابلد تھا ۔ جب وہ فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتا تو میں yes کر دیتا اور جب میں انگریزی میں کچھ کہتا تو وہ Oui کہہ دیتا ۔ نہ وہ میری بات سمجھتا ، نہ میں اس کی ۔ انجام کار میرے سر پر خفیف سے بال رہ گئے ۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا ۔ جب میں جلسہ گاہ میں داخل ہوتا تھا تو مجبوراً ٹوپی اتار لیتا لیکن ان چھوٹے چھوٹے بالوں سے سردی کیسے روکی جا سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ یہ منظر بھی بھونڈا سا تھا ۔ میں نے یہ قصہ اپنے دوستوں ڈاکٹر طہٰ حسین اور عبدالوہاب عزام سے بیان کیا تو وہ خوب ہنسے ۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کہنے لگے کہ میں ایک افسانہ لکھوں گا جس کا نام "برسلز کا حجام" ہوگا ۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے تو قصیدہ کہہ دیا ۔

---

۱ ابوحیان توحیدی : (المتوفی ۴۰۰ھ) چوتھی صدی کا فلسفی ادیب ۔

(استاد نے جب شیشہ دیکھا تو سر کے بال نظر نہ آئے)

اس سفر میں بلجیم اور فرانس کے لوگ بھی دیکھے۔ لڑائی کی تیاری کی افواہیں سن کر وہ دہشت زدہ ہو رہے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں راستے بند نہ ہو جائیں، ہم نے بھی واپسی میں جلدی کی۔ اگر پہلے سفر نے جدید تمدن کے بہت سے گوشوں سے واقفیت بہم پہنچائی تھی تو اس سفر نے اس کو پختہ کر دیا۔

——:o:——

۲۶

کالج کی زندگی

اس سارے سفر کے بعد میں اب اپنی عام اور خاص زندگی کے متعلق لکھوں گا ۔ آرٹس کالج میں ترقی پا کر میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گیا تھا اور مجلسِ انتظامیہ کا ممبر بھی ۔ اس طرح سے مجھے انگریز ، فرانسیسی اور بلجمی پروفیسروں سے میل جول بڑھانے کا موقعہ ملا ۔ میں ہر جلسے میں دیکھتا تھا کہ کس طرح امور پیش ہوتے ہیں ۔ آن پر کیسے نگاہ ڈالی جاتی ہے ۔ خواہشات اور جذبات کا عمل دخل کس طرح ہوتا ہے ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ منطق تو حکم لگانے کا آخری حربہ ہے ۔ ذاتی خواہشات اور اغراض منطق پر غالب آتی ہیں ۔ منطق وہ نہیں جس کی تعریف ہم نے سنی تھی کہ اس کی مدد سے ذہن کو حکم لگانے میں خطا سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے ، بلکہ اس کی وجہ سے میلانات ، افکار اور اغراض ایک ہو کر معقول شکل اختیار کر لیتی ہیں ۔ یہ مجلس بھی بابل کا برج تھا جس میں کوئی تو عربی بولتا ، کوئی فرانسیسی اور انگریزی ۔ جب اختلاف رائے ہوتا تو زیر بحث مسئلے کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کر دیا جاتا ۔ بعض دفعہ پردوں کے پیچھے سے سیاست کی کارفرمائی بھی نظر آتی تھی ۔ فرانسیسی اُستاد فلسفے کے مضمون پر بالادستی رکھنا چاہتے تھے اور انگریز پرنسپل کی معرفت کالج پر چھا جانا چاہتے تھے۔ اگر پروفیسری یا پرنسپلی کی جگہ خالی ہوتی تو اس قسم کے مظاہرات دیکھنے میں آتے۔

میرے دیکھتے دیکھتے مصری اساتذہ کی کثرت ہو گئی۔ مصری پرنسپل کی تقرری سے جامعہ کی زمام کار اُن کے ہاتھ آ گئی۔ اگر حکومت جامعہ کے معاملات میں دخل دیتی تو جامعہ والے یونیورسٹی کی محافظت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ اس قسم کا واقعہ اُس وقت پیش آیا جب حکومت نے مجلس انتظامیہ کے مشورے کے بغیر ڈاکٹر طہ حسین کو محکمۂ تعلیم میں تبدیل کر دیا۔ ڈاکٹر طہ حسین نے استعفیٰ دے دیا اور طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ اس پر اُستادوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک صلح کن تھا تو دوسرا جنگ جو۔ میں نے مؤخرالذکر کا ساتھ دیا جس سے بہت سی تکلیفیں بھی اُٹھائیں۔

میرے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ تھی لہٰذا میرے لیے پروفیسر (صدر شعبہ) بننا مشکل تھا، اگرچہ قانون کی رو سے عربی اور اسلامیات کا اسسٹنٹ پروفیسر، پروفیسری تک ترقی کر سکتا تھا اور اس کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ میرے بعض معاصرین کو ترقی دے کر پروفیسر بنا دیا گیا تھا لیکن میں محروم رہا۔ میں نے اس حق تلفی کا پامردی سے مقابلہ کیا اور حسب قواعد و قوانین ڈاکٹریٹ کے لیے اپنی دو کتابیں "فجرالاسلام" اور "ضحی الاسلام" پیش کر دیں۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ ممتحن حضرات جامعہ کے اساتذہ ہوں گے اور سب کے سب میرے زیر اثر بھی۔ میں نے پھر درخواست کی کہ باہر کے مستشرقوں کو ممتحن مقرر کیا جائے لیکن وزیر تعلیم نہ مانے۔ یہ بھی جامعہ کے معاملات میں ایک قسم کی دخل اندازی تھی۔ جامعہ کے بہت سے اساتذہ جو میرے دوست تھے اور لجنۃالتالیف کے ارکان نے اس زیادتی کو محسوس کرتے ہوئے میرے اعزاز میں ایک جلسے کا انتظام کیا۔

یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے ۔ لجنۃالتالیف کے قیام کو بیس برس گزر چکے تھے اور اِن بیس برسوں سے میں اِس مجلس کا صدو چلا آ رہا تھا ۔ میں نے اُن کو اِس حیلے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے ۔ ایک شاندار مجلس کا انتظام کیا گیا جس میں لجنۃالتالیف کے ارکان کے علاوہ محکمۂ تعلیم کے عہدہ‌دار اور مختلف سیاسی جماعتوں کے سربراہ شامل تھے ۔ یہ اجلاس سینٹ جیمز میں مختلف زعماء کی صدارت میں ہوتے تھے ۔ پہلے جلسے کے صدر جامعہ کے چانسلر احمد لطفی‌السید[۱] ، دوسرے کے مرحوم احمد ماہر[۲] ، تیسرے کے ڈاکٹر علی ابراہیم[۳] ، چوتھے کے مرحوم ابراہیم الہلباوی[۴] ، پانچویں کے عبدالعزیز فہمی[۵] اور چھٹے کے مرحوم شیخ محمد مصطفیٰ[۶] المراغی تھے ۔ شیخ محمد مصطفیٰ المراغی ، استاد احمد لطفی السید اور مشہور مستشرق نللینو[۷] نے تقریریں کیں ۔ استاد نللینو نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا : "رومیوں میں مشہور ہے

---

۱ ۔ استاد احمد لطفی السید : (المتوفی ۱۹۶۳ء) ۔ مشہور مصری ادیب اور ماہرِ تعلیم ، وائس چانسلر جامعۂ مصریہ ۔

۲ ۔ احمد ماہر : مصر کے سابق وزیرِاعظم ۔

۳ ۔ ڈاکٹر علی ابراہیم : ایک مصری فاضل ۔

۴ ۔ ابراہیم الہلباوی : ایک مصری فاضل ۔

۵ ۔ عبدالعزیز فہمی : (۱۸۷۰ - ۱۹۵۱ء) مصری قانون دان اور قانونی کتب کے مصنف ۔

۶ ۔ شیخ محمد مصطفیٰ‌المراغی : (۱۸۸۱ - ۱۹۴۵ء) سابق شیخ ازہر اور مفسرِ قرآن ۔

۷ ۔ نللینو : (۱۸۷۲ - ۱۹۳۸ء) اطالوی مستشرق اور سابق استاد جامعۂ مصریہ ۔ تاریخ علم الفلک عندالعرب اُن کی مشہور تصنیف ہے ۔

کہ ایک آدمی کے لیے ایک دفعہ پاگل ہونا جائز ہے۔ میں بھی پاگل ہو کر عربی میں تقریر کروں گا۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام[1] ڈاکٹر عبدالسلام کروالی[2]، استاد محمد کرد علی[3] وغیرہم نے بھی تقریریں کیں، آخر میں۔ میں نے بھی شرماتے ہوئے انکساری سے جواب دیا۔ ڈاکٹر علی ابراہیم نے کہا کہ اگر کوئی اس قسم کے جلسے کا انتظام کرکے مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو اکٹھا کرکے ان میں میل ملاپ کرا دے جس طرح وہ آج متحد نظر آتے ہیں تو بڑی سیاسی کامیابی ہوگی۔ میں اس جلسے سے بڑا متاثر ہوا اور ڈاکٹریٹ میں کامیابی سے زیادہ اس اعزاز کو تصور کیا۔

زمانے کا رنگ بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ اس جلسے کے بعد میری طبیعت بجھی بجھی سی رہنے لگی اور کچھ دل گرفتگی سی محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو ذیابیطس کا مرض تشخیص کیا۔ کئی دن میں نے کچھ نہ کھایا۔ صرف پانی پر گزارا رہا۔ اس کے بعد نشاستہ دار اور میٹھی چیزوں سے پرہیز تجویز ہوئی۔ اُس وقت سے انسولین کے ٹیکے میری زندگی کا جزو بن گئے ہیں۔ اب یہ مرض پندرہ برس سے چلا آرہا ہے۔ کبھی آرام آجاتا ہے اور کبھی دوبارہ تکلیف ہو جاتی ہے۔ بہت سی مرغوب چیزوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور سخت محنت سے

۱۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام: سابق سفیرِ مصر متعینہ پاکستان۔ اقبال کی "پیامِ مشرق" کا عربی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ ان کو انتقال کیے چار پانچ برس گزرے ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالسلام کروالی: جامعۂ مصریہ کے ایک استاد۔

۳۔ استاد محمد کرد علی: (۱۸۷۶ - ۱۹۵۳ء) شام کے سابق وزیرِ تعلیم۔ مجمع العلمی العربی کے صدر اور کوئی درجن بھر کتابوں کے مصنف۔

بھنا پڑتا ہے ۔ کئی دفعہ میں افسردہ خاطر ہو جاتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس مرض کی شدت کم ہی محسوس کرتا ہوں ۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ کئی استادوں کو پروفیسری کے عہدے پر فائز کردیا گیا حالانکہ اُن کے پاس ڈاکٹریٹ نہ تھی اور مجھے اس بنا پر محروم کردیا گیا کہ میں جامعہ کی آزادی کا پاسبان تھا ۔ میں نے درخواست دی کہ میری تصانیف کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیٹی بٹھائی جائے ۔ دو مستشرقوں ڈاکٹر شاوہ[1] اور استاد برجسٹراسر[2] پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی ، جنھوں نے "فجرالاسلام" اور "ضحی الاسلام" پڑھنے کے بعد میرے استحقاق کی تصدیق کر دی مگر کہا نقص صرف یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں بعض ایسی فضول بحثیں ہیں جن پر بعض الہانوی علماء پہلے سے خامہ فرسائی کر چکے ہیں ۔ اگر مؤلف ان کو پہلے سے دیکھ لیتا تو کتاب کی بنیاد ان مباحث پر اُٹھا سکتا تھا اور اُس کو اس قدر محنت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ۔

وزارت تعلیم نے یہ نوٹ چھپا لیا جو اُس کے خلاف تھا ۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا کہ یہ نوٹ وزارتِ تعلیم سے منگوایا جائے لیکن محکمۂ تعلیم نے بات ٹال دی ۔ آخر کار پروفیسری بڑی دیر اور مشقت کے بعد حاصل ہوئی ۔ ایک دفعہ تو میں نے استعفیٰ بھی دے دیا تھا کیونکہ میرے ساتھ دوسروں جیسا سلوک نہیں ہوا تھا ۔ مجھے آرٹس کالج کی مجلس انتظامیہ میں نمائندہ بھی منتخب کرلیا گیا ۔ میں نے دوسال تک آرٹس کالج کی نمائندگی کی ۔

---

۱ و ۲ ۔ الہانوی مستشرق اور استاد جامعۂ مصریہ ۔

اس سے میرے تجربات میں اضافہ ہوا ۔ جامعہ کی مجلس النظامیہ میں کالجوں کے پرنسپل ، پروفیسر ، وزارتِ مالیات اور تعلیم کے نمائندے اور شہر کے ماہرین تعلیم ہوا کرتے تھے ۔ بعض سابق وزراء بھی شریک ہوا کرتے تھے ۔ یہ مجلس دانشوروں کی نمائندگی کرتی تھی ۔ میں نے دیکھا کہ عقلمند کس طرح امور میں تصرف کرتے ہیں ۔ کس طرح آراء قائم کی جاتی ہیں ۔ ان کی تکوین میں مختلف عوامل کی کار فرمائی کس طرح ہوتی ہے ۔ کس طرح مناقشہ اور بحث و مباحثہ ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے وہم سا رہا کرتا تھا کہ ایک آدمی کی عبقریت کی دلیل اُس کا بڑا عہدہ‌دار ہونا ہے اور اُس کی آراء اور افکار کے سامنے ہر فکر بے حقیقت ہے ، لیکن اس مجلس نے اس خیالِ خام کو زائل کردیا ۔ میں نے دیکھا کہ بڑے لوگ بھی عام لوگوں کی طرح سوچ بچار کرتے ہیں اور اُن کی طرح خطا کے مرتکب ہوتے ہیں اور اُن پر بھی نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوسکتا ہے ۔

میرے تجربے میں یہ بات بھی آئی کہ اکثر لوگ بڑے آدمیوں کی موافقت کرتے ہیں ، اگرچہ یہ بڑے آدمی غلطی پر ہوں ۔ لیکن جب کوئی ہمت سے کام لے کر حق کی مدافعت کرے اور اس پر ڈٹ جائے تو یہ بھی آدھر مائل ہوجاتے ہیں ۔ اُن میں حق بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی اور سچ کہنے والے کو بھی جھٹلا نہیں سکتے ۔

اس مجلس میں مجھے عاطف برکات کا احسان یاد آیا ۔ اُنھوں نے سچ بات کہنے کی تعلیم دی تھی ، اگرچہ یہ کتنی کڑوی ہو اور اس کی راہ میں کتنی ہی مصیبت جھیلنی پڑے ۔ ایک ایسا واقعہ ہوا جس میں کڑی آزمائش تھی ۔ یہ بات کتنی سچ ہے کہ "پہلے واقعہ

پر صدمہ ہوتا ہے"۔ لاء کالج میں رومن لاء کی پروفیسری کے لیے اعلان کیا گیا۔ اس کے لیے بہت سے پروفیسر امیدوار تھے جن میں ایک اطالوی اور دوسرے فرانسیسی استاد زیادہ موزوں نظر آئے۔ ہم نے بعض علمی مؤلفات کی بنا پر اطالوی پروفیسر کو ترجیح دی لیکن محکمۂ تعلیم نے بعض نامعلوم وجوہات سے فرانسیسی پروفیسر کو پسند کر لیا۔ اگرچہ مجلس میں وزیر تعلیم خود شامل نہ تھے لیکن اُن کے نمائندے فرانسیسی پروفیسر کی حمایت و مدافعت میں پیش پیش تھے۔ اطالوی پروفیسر کی حمایت میرے سوا دو اور ارکان بھی کر رہے تھے۔ مجلس انتظامیہ کے کئی جلسوں میں یہ موضوع زیر بحث رہا۔ آخر کار وزیر تعلیم نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ ملاقات میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں نے روانگی کے لیے اجازت چاہی تو کہنے لگے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم فرانسیسی پروفیسر کی تقرری کے خلاف ہو حالانکہ وہ اس اسامی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جناب عالی! یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ آپ کے آدمی جس بات کو حق سمجھتے ہیں اُس کی مدافعت کرتے ہیں اور جو اُن کے دل میں ہوتا ہے وہی اُن کی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد میں سلام کرکے چلا آیا۔ جامعہ کی مجلس نے اطالوی پروفیسر کے تقرر کی منظوری دے دی۔ اس کامیابی نے مجھے دلیر کردیا۔ لیکن میں اللہ تعالیٰ کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہوں کہ جب بھی کوئی تنازعہ پیش ہوتا میں قاضی کی طرح اُس پر غور و فکر کر کے فریقین کے دلائل سنتا اور اپنے میلانات اور جذبات کو بالائے طاق رکھ کر فیصلہ کرتا۔ اس مجلس سے میں نے یہ تجربہ بھی حاصل کیا کہ بہت سے لوگ مخالفت سے دل گرفتہ ہو کر ایذاء رسانی پر اُتر آتے ہیں لیکن جب اُنھیں یقین

ہو جائے کہ مخالف سچائی پر ہے اور اس میں اُن کی بے وقعتی کا کوئی سوال نہیں تو وہ اُس کو عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔

بعض دفعہ پیچیدہ مسائل رونما ہوتے تو میں مضبوط موقف اختیار کرتا مثلاً مجلس انتظامیہ طلبہ کو خارج کرنے کے متعلق فیصلہ کرتی کیونکہ وہ شور و شر پیدا کرتے تھے اور اُن کا غیر سرکاری سیاسی پارٹی سے بھی تعلق ہوتا ۔ لیکن جب وزارت ان طلبہ کے حامیوں کی بنتی تو مجلس انتظامیہ سے طلبہ کو معاف دینے اور دوبارہ داخل کرنے کو کہا جاتا تو میں سخت مخالفت کرتا کہ کبھی ایک کو ناراض کیا جائے اور کبھی دوسرے کو ۔ ایک دفعہ ہم نے غیر ملکی فاضلوں کو اعزازی ڈگری دیے جانے کی مخالفت کی ۔ مجلس میں یہ قرارداد بھی پاس ہو گئی لیکن مجھ پر شدید عتاب نازل ہوا ۔ نہ صرف مجلس انتظامیہ سے بلکہ جامعہ سے میرے اخراج کی تجویزیں سوچی جانے لگیں لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا اور یہ معاملہ رفت گذشت ہو گیا ۔ ایک دفعہ مجلسِ انتظامیہ نے سید لطفی پاشا کے مجلس چھوڑنے پر اُن کی گذشتہ خدمات کے صلے میں شکر گزاری کا ریزولیوشن پاس کیا لیکن حکومت سخت ناراض ہوئی اور ریزولیوشن رہ گیا ۔ دوسری وزارت قائم ہوئی وہ لطفی پاشا کی حامی تھی ۔ اس دفعہ شکر گزاری کا پیغام اُن کی خدمت میں بھیج دیا گیا ۔ اس پر میں مجلس میں کھڑا ہوا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آواز میں لرزہ تھا ۔ میں نے ارکان کو اُن کی آراء کے احترام اور نفاذ پر اُبھارا ۔ اس لیے ہر جلسہ میرے لیے مفید یا مشکل درس ثابت ہوتا ۔

ایک دفعہ استاد مکی الناصری[1] المغربی المراکشی مجھ سے

---

۱ ۔ استاد مکی الناصری : مراکش کے ایک عالم ۔

ملنے آئے اور کہا کہ خلیفیہ کے اضلاع جن کا صدر مقام[1] تطوان ہے ، مراکشی طلبہ کی جماعت کو بغرضِ حصولِ تعلیم مصر بھیجنا چاہتے ہیں ۔ انھوں نے مجھ سے طلبہ کی نگرانی قبول کرنے کو کہا ۔ میں نے یہ نگرانی قبول کر لی ۔

یہ طالب علم بیس کے قریب تھے ، ان میں سے بعض تو آرٹس کالج اور بعض دارالعلوم میں تعلیم پاتے تھے اور کچھ صنعتی مدارس میں ۔ میں نے ان کے لیے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی کر دیا ۔ اُن کی صحت کا پوری طرح خیال رکھا جاتا تھا ۔ اس سلسلے میں ایک مجلس کا بھی انتظام کیا گیا جہاں لجنۃ التالیف کے زیرِ اہتمام لیکچر ہوتے تھے ۔ اس مجلس کے خرچ پر بہت سی کتابیں شائع کی گئیں ۔ مثلاً قاضی[2] عیاض کی ازھار الریاض کے اکثر اجزاء ، استاد مٹز[3] کی الحضارۃ الاسلامیہ کا ترجمہ اور نہضۃ الغربیہ و اسسہا (یورپ کی ترقی کی بنیادیں وغیرہ) ۔ بلاد مغرب (شمالی افریقہ) کی جغرافیائی اٹلس کے چھاپنے کا بھی ارادہ کیا تھا اور مجھے اُمید بھی تھی کہ ماہرینِ فن اس بارے میں مدد دیں گے لیکن دوسری بڑی جنگ مانع آئی ۔ کاغذ اور چھپائی وغیرہ کی اُجرت بھی بڑھ گئی تھی ۔ فرانسیسی اور ہسپانوی حکومتیں بھی اس منصوبے کی مخالف تھیں ۔ اس طرح یہ تجویز ناکام ہو گئی ۔

اپریل ۱۹۳۹ء میں پرنسپلی کا عہدہ خالی ہوا ۔ مصریوں میں

---

۱ ۔ تطوان : مراکش کا ایک شہر ۔ آبادی ستر ہزار ہے ۔

۲ ۔ قاضی عیاض : اندلس کے مالکی امام ۔

۳ ۔ Mitz ۔

ڈاکٹر طہٰ حسین[1]، ڈاکٹر منصور فہمی[2] اور استاد شفیق[3] غربال اس جگہ کام کر چکے تھے ۔ جامعہ کا قانون تھا کہ مجلس انتظامیہ تین آمیدواروں کا انتخاب کرتی جن میں ایک کو وزیر تعلیم مقرر کر دیتا ۔ اس دفعہ مجلس انتظامیہ نے تین آمیدوار منتخب کیے جن میں میرا نام بھی شامل تھا ۔ محمود فہمی النقراشی[4] پاشا نے مجھے پرنسپل مقرر کر دیا ۔ میں نے ازہر اور مدرسۃ القضاء میں تعلیم پائی تھی ۔ جامعہ مصریہ میں تو کبھی پڑھنے کا خیال تک نہ آیا تھا ۔ غیر ملکی زبانوں میں سے صرف تھوڑی سی انگریزی جانتا تھا ۔ لیکن جامعہ کے اکثر اساتذہ غیر ملکی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے ۔ میں نے اس منصب کی ذمہ داریوں کو بہت محسوس کیا لیکن مرحوم شیخ محمد عبدہ کا قول یاد آیا کہ ایک چھوٹا آدمی عہدے کا غلام بن جاتا ہے اور بڑا آدمی عہدے کو محکوم بنا لیتا ہے ۔

میں پرنسپل ہوا تو بہت سا وقت انتظامی امور میں صرف ہونے لگا ۔ سب کاغذات میرے روبرو پیش کیے جاتے تھے ، حتیٰ کہ ایک جھاڑو بھی خریدنا ہوتا تو مجھے منظوری دینی پڑتی ۔ طالب علموں اور استادوں کی شکایتیں الگ سننی پڑتی تھیں ۔ مدرسوں اور استادوں کا ترقی لینے کے لیے ازدہام لگا رہتا ۔ ان بے مصرف کاموں میں بڑا

۱ ۔ ڈاکٹر طہ حسین : (المولود ۱۸۸۹ ع) مصر کے ادیب ، نقاد اور سابق وزیر تعلیم ۔

۲ ۔ ڈاکٹر منصور فہمی : ایک ادیب جن کو انتقال کیے ہوئے دس بارہ برس ہوئے ہیں ۔

۳ ۔ استاد شفیق غربال : سابق استاد تاریخ جامعۂ مصریہ ۔

۴ ۔ محمود نقراشی پاشا : سابق وزیراعظم مصر ۔

وقت برباد ہوتا اور طریقۂ تعلیم و تربیت کے لیے کوئی وقت نہ بچتا۔ مصری نظامِ حکومت کی یہ خرابی ہے کہ سب کام ایک ہی آدمی کو سونپ دیے جاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جامعہ اس قسم کے نظام سے خالی رکھی جاتی اور پرنسپل کے ذمے ضروری مسائل رہ جاتے لیکن اس کی توفیق کس کو میسر آ سکتی تھی۔

دو سال اسی طرح گزر گئے۔ مجھے رہ رہ کر وقت کے ضائع ہونے کا خیال آتا۔ میں اس عرصے میں نہ تو کوئی نئی کتاب لکھ سکا اور نہ کسی بحث و تحقیق کو مکمل کر سکا۔ طالب علموں کی شکایتوں اور وظیفوں کی مانگ سے دل گرفتہ رہتا لیکن پھر بھی دوسروں کی نسبت زیادہ کامیاب رہا۔

پرنسپلی کی قانونی میعاد تین سال ہوا کرتی تھی لیکن دو سال کے بعد ہی وزیرِ تعلیم سے میرا اختلاف ہو گیا۔ وزیرِ تعلیم نے کالج کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اعتراض کیا تو انھوں نے معذرت پیش کردی۔ دوسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ آرٹس کالج کے استادوں نے مل کر قرارداد پاس کی ہے کہ ان کو اسکندریہ تبدیل کر دیا جائے، لیکن مجھے ان معاملات کی کچھ خبر نہ تھی۔ میں نے تنگ آ کر پرنسپلی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس گلو خلاصی سے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور پروفیسری کے عہدے پر واپس آ گیا۔ پروگرام کے مطابق فجرالاسلام اور ضحیٰ الاسلام کے باقی ماندہ سلسلے کی تکمیل کی اور ظہرالاسلام کی پہلی جلد بھی شائع کر دی۔

وزارت تبدیل ہو گئی تو پھر افواہ گرم ہوئی کہ مجھے دوبارہ پرنسپل بنایا جائے گا۔ اخباری نمائندوں نے پوچھا تو میں نے کہا کہ میں تو اس قسم کے عہدوں سے بالا تر ہوں۔

میں نے تین باتوں کی اصلاح کی کوشش کی تھی لیکن اس میں زیادہ کامیابی نہ ہوسکی ۔

(۱) کالج کی اجتماعی زندگی کی تنظیم ، کالج کی زندگی صرف پڑھنے اور پڑھانے میں محدود رہ گئی تھی ۔ استادوں اور طالب علموں کے درمیان کوئی رابطہ نہ تھا ۔ میں نے مختلف وسائل سے کالج کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کرنی چاہی ۔ اس غرض سے مختلف اساتذہ کو جنھوں نے المانوی ، فرانسیسی اور انگلش یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی ، ان یونیورسٹیوں کے انتظام پر تقریریں کرنے کے لیے آمادہ کیا ، خاص کر وہاں کی اجتماعی زندگی پر ۔

(۲) میں نے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان اخلاقی روابط استوار کرنے کی کوشش کی ۔ چند طلبہ ہر ایک استاد کی نگرانی میں دے دے تاکہ وہ طلبہ کی اخلاقی نگہداشت اس طرح کریں جس طرح باپ ، بیٹے کی کرتا ہے اور طلبہ کی مالی ، نفسیاتی اور اجتماعی مشکلات سے آگاہ ہو کر اُن کے ازالے کی تدابیر بتلائے ۔

(۳) بہت سے پروفیسروں نے لیکچر کے بجائے املاء لکھانی شروع کردی تھی ۔ میں نے اس طرزِ تعلیم کی سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے طلبہ اکتا جاتے تھے اور میں اس کو جامعہ کی علمی موت کے مترادف سمجھتا تھا ۔ صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ طالب علموں کو اصلی مصادر بتلائے جاتے اور پھر لیکچر دیا جاتا تاکہ طلبہ میں فہم اور اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو ۔ لیکن مجھے حسب خواہش کامیابی حاصل نہ ہوسکی ۔ مجھے ان قصوں کے لکھنے میں بھی تامل تھا کیونکہ اس میں خود پسندی کا شائبہ تھا جو مجھے بھی ناپسند ہے ، لیکن کتاب کے پڑھنے والے سے میں اپنے معتقدات بھی چھپانا نہیں چاہتا ۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل[1] کی وزارت میں مجھے مجمع فوادالدول للغتہ العربیہ (عربی اکادمی) کا رکن بنایا گیا ۔ اس مجلس سے میں نے امکان بھر تعاون کیا ۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ مجمع کے ارکان حد درجہ قدامت پسند ہیں اور نئی چیزوں سے بدکتے ہیں ۔ کام میں سست رفتار اور بحث و مباحثہ کے بے حد شائق ہیں ۔ لیکن ساتھ ہی مجھے عربی زبان کی لغوی اور ادبی مشکلات سے واقفیت بہم پہنچانے اور مفکرین کی آراء سننے کا موقع ملا ۔

پرنسپلی کی مصروفیتوں کی بدولت میں بہت سے دوستوں میں سے ایک کی رفاقت سے محروم ہوگیا ۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ آپس میں راز داں بھی تھے اور خوشی و غم میں شریک رہا کرتے تھے ۔ اگرچہ ہم دونوں میں مزاج کا اختلاف تھا ، پھر بھی یہ دوست میرے دل کا ٹکڑا تھا ۔ وہ فن کار تھا اور اپنے فن کا مطیع ۔ میں عالم تھا اور مجھ پر منطق سوار تھی ۔ وہ شان و شوکت کا دلدادہ تھا تو میں گوشہ نشینی کا ۔ وہ لوگوں پر حکم لگانے میں جلد باز تھا تو میں سست رفتار ۔ وہ کسی سے محبت یا نفرت کرتا تو انتہا درجے کی کرتا ، میں معتدل مزاج تھا ۔ وہ تکلیفوں میں صابر اور شاکر تھا تو میں بےقرار ، وہ مجلسی گفتگو کا ماہر تھا تو میں بالکل گم سم قسم کا آدمی ۔ وہ زندگی کے شطرنج کی بازی میں زیادہ نفع و نقصان اٹھانے کا عادی تھا تو میں بہت کم بازی لگاتا تھا ۔ وہ سیاست کے میدان کا مرد تھا تو میں اس سے بالکل نفور ۔ لیکن مزاج کے اس اختلاف کے باوجود ہم دونوں دوست تھے اور خیال تھا کہ میرے نقائص کی تکمیل اس کی

---

۱ ۔ ڈاکٹر محمد حسین ہیکل : (المتوفی ۱۹۵٦ع) مشہور مصنف اور سابق وزیر تعلیم ۔

ذات سے ہوسکے گی ۔ اُس کو بھی ایسا ہی خیال تھا لیکن پرنسپلی نے اس دوستی کا خون کردیا ۔ وہ طبیعت سے مجبور ہو کر ہر بات پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا تھا لیکن میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا ۔ پھر وہ کسی اونچے عہدہ پر پہنچ گیا تو اپنا حکم چلانا چاہا لیکن میں نے ماننے سے انکار کردیا اور اس لڑائی جھگڑے میں دوستی جاتی رہی جس کا ہم دونوں کو قلق اور افسوس رہا ۔

—:o:—

والدہ کی وفات

میں آرٹس کالج میں پروفیسر تھا کہ میری والدہ نے ۱۹۳۶ء میں اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ اُس کا خاندان تلا سے نا معلوم اسباب کی بنا پر قاہرہ آ کر تجارت میں مشغول ہوگیا تھا۔ میرے دونوں ماموں غوریہ[1] میں عطاری کی دوکانیں کرتے تھے۔

میری والدہ سادہ مزاج اور اُس زمانے کی دوسری عورتوں کی طرح نوشت و خواند سے عاری تھی۔ محلے والے اُس سے محبت رکھتے تھے۔ مجھے بھی بے حد محبت تھی۔ اُس نے ساری زندگی مصیبتوں میں گزاری تھی۔ تین بچے عالمِ شباب میں مر چکے تھے۔ میرے والد بھی سخت گیر اور گھر کے ہر معاملے میں دخیل تھے۔ گھر پر اُن ہی کا حکم چلتا تھا جس کی وجہ سے وہ شکستہ دل رہا کرتی تھی۔ جب ہمارے والد ہم پر ناراض ہوتے تو ہم والدہ کے دامنِ شفقت کی پناہ لیا کرتے تھے۔

اس بنا پر میں نے امکان بھر والدہ کو راضی رکھنے اور اُس کا احسان اتارنے کی کوشش کی۔ میری دلی آرزو تھی کہ والد کے مرنے کے بعد وہ میرے پاس آجائے تاکہ میں اُس کی زیارت سے شاد کام اور صبح و شام اُس کی دعاؤں سے مستفید ہوتا رہوں لیکن اُس نے اپنا گھر چھوڑنا پسند نہ کیا اور نہ ہی اپنے پڑوسیوں سے

۱۔ غوریہ: قاہرہ کا ایک محلہ ہے۔

علیحدہ ہونا گوارا کیا ۔ مجھے بھی ڈر تھا کہ میاں بیوی کے جھگڑوں سے اُس کو کوفت ہوگی ۔ ناچار اُس کے اصرار کے سامنے سر جھکانا پڑا ۔

جب وہ فوت ہوئی تو میں شادی شدہ اور صاحبِ اولاد تھا لیکن اُس کے مرنے پر ایک خلا سا محسوس کیا جس کے پر ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی ۔ میں نے اُس کو امکان بھر راحت پہنچانے کی کوشش کی ۔ گرمیوں میں اسکندریہ جاتا تو اُس کو بھی ہمراہ لے جاتا ۔ اُس کو دیکھ کر اور اُس کے پاس بیٹھ کر خوش ہوتا لیکن میں اُس کے احسان کا بدلہ اتار نہیں سکا ۔ وہ مجھے بچپن سے بشارت دیا کرتی تھی کہ میں خوش نصیب ہوں گا ۔ اُس نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا تھا کہ ہم چلتے چلتے ایک ایسے مکان میں داخل ہو گئے جہاں خزانہ کھلا ہوا تھا ۔ اُس نے مجھے اپنی گود سونے سے بھرنے کے لیے کہا ۔ ایک فرشتہ وہاں موجود تھا ۔ کہنے لگا کہ جلدی نہ کرو ۔ یہ سارا خزانہ تمھارے لڑکے کے لیے ہے ۔ میں نے یہ خواب سنا تو بہت ہی خوش ہوا اور اس کو سچا سمجھا ۔ وہ ہر مناسب موقعے پر یہ خواب دہرایا کرتی تھی ۔

محدود آمدنی کے باوجود وہ ہاتھ کی سخی تھی ۔ اُسے مال کی زیادہ پروا نہ تھی ۔ اپنا سارا مال و متاع اولاد کو دے دیا تھا ۔ میں نے کبھی بھی اُس کو مال جمع کرنے کی فکر یا کسی دولت مند پر حسد یا قسمت کا گلہ کرتے ہوئے نہیں پایا ۔ اُس کا حال میرے ماموؤں جیسا تھا ۔ سب نے پاکیزہ زندگی گزاری تھی ۔ بہت کچھ کمایا اور خرچ کر ڈالا تھا ۔ وہ بات چیت میں حد درجہ سادہ اور بھولی تھی اور ہر بات کی تصدیق کرنے کو تیار رہتی تھی ۔

مجھ میں جو عناد ، کام میں جلدی ، مطالعے میں صبر و استقامت ،

سرعتِ غضب ، رنج کا رجحان اور انجام کار میں غور و فکر کرنے کی عادت ، یہ سب والدِ مرحوم کا ورثہ ہے ۔ سادگی ، مال و زر سے بے رغبتی ، رنجیدہ ہونے پر افسوس ، لوگوں کے ساتھ حسنِ ظن ، غصہ پر ندامت اور پھر جلد ہی رضامند ہو جانا ، یہ سب کچھ والدہ مرحومہ سے ملا ہے ۔

کیا ہم اپنے آبا و اجداد کی جدید صورتیں نہیں ہیں جن کا ہمارے جسموں اور روحوں نے قالب پہن لیا ہے ۔

——:o:——

۲۸

علمی مشاغل

پرنسپلی چھوڑنے کے بعد میں دوبارہ پروفیسری کے عہدے پر واپس آگیا اور ہر قسم کے اقتدار سے تہی دست ہوگیا۔ اب میں وزارت کی نظروں میں معتوب تھا ۔ میری کوئی سفارش سنی نہ جاتی تھی۔ لوگوں کی بے وفائی اور احسان ناشناسی کے گھناؤنے منظر بھی دیکھنے میں آئے۔

جب میں نفع پہنچانے پر قادر تھا تو ہر شخص میرا دوست تھا لیکن جب میں اقتدار سے محروم ہوگیا تو وہ میرے دشمن بننے کے بہانے ڈھونڈنے لگے ۔ اگر لڑنے کا موقع نہ ہوتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے۔ کبھی یہ لوگ میرے پرنسپل بننے پر میرے اعزاز میں عصرانے دیا کرتے تھے، لیکن جب میں نے پرنسپلی چھوڑی تو کسی نے بھی الوداعی تقریب کا اہتمام نہیں کیا۔ اکثر میری صحت و عافیت کے بارے میں استفسار ٹیلیفون پر آیا کرتے تھے۔ پہلے ملنے کا اشتیاق ہوتا اور مجھ سے وقت مقرر کیا جاتا، اس کے بعد میری صحت پر اطمینان کا اظہار ہوتا، پھر مطلب برآری کی اُمید ظاہر کی جاتی۔

اب کسی کا ٹیلیفون آتا تو اُس میں نہ صحت کے متعلق سوال ہوتا، نہ ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا جاتا۔

میرا لیٹر بکس جو کبھی خطوں سے بھرا رہتا تھا، اب خالی رہنے لگا، سوائے ذاتی اور خانگی خطوط کے۔

عیدین کے موقع پر ملاقاتیوں اور مبارک‌باد دینے والوں کا صبح سے لے کر شام تک تانتا لگا رہتا تھا ۔ اب کوئی ملنے نہیں آتا اور میں لکھنے پڑھنے میں لگا رہتا ہوں ۔

یہ صورت حال میرے لیے نئی نہ تھی ۔ میں اس کا تذکرہ کتابوں میں پڑھ چکا تھا اور لوگوں سے بھی سن چکا تھا ۔ دوسرے لوگوں کو بھی ان حالات سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا ، لیکن بعض شاگردوں کی بے وفائی بڑی گراں گذری ۔ میرا تو اعتقاد تھا کہ استاد کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے اور علمی رابطہ سب رابطوں سے بڑھ کر قوی ہوتا ہے ، لیکن شاگرد کو استاد سے بغاوت کرتے ہوئے اور اس کی طرف جھوٹ اور باطل کی نسبت کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ اس واقعے نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور لوگوں پر میرا اعتماد اور اعتبار اٹھ گیا :

و صرت اشک فی حسن اصطفیہ

لعلمی انہ بعض الانام

(میں دوستوں کی دوستی میں شک کرنے لگا کیونکہ وہ بھی تو آخر انسان ہیں) ۔

میں نے پھر کتابوں کی دنیا میں پناہ لی کیونکہ وہ با وفا اور مخلص دوست ہیں ۔ اب میں تھا اور میری لائبریری تھی ۔ میں نے ظہرالاسلام کے پہلے حصے کی تیاری شروع کر دی ۔ کتاب‌الامتاع و المؤانسة (ابوحیان توحیدی) کے چھاپنے میں حصہ لیا ۔ استاد زکی نجیب کے ساتھ مل کر یونانی فلسفہ ، جدید فلسفہ اور عالمی ادب کی تاریخ (۴ اجزاء) لکھی ۔ ان کاموں سے جو وقت بچتا وہ مجالس علمیہ یا لجنةالتالیف و الترجمہ و النشر کے کاموں کی نگرانی میں صرف ہوتا ہے ۔ یہ علمی زندگی مجھے بے حد پسند تھی ۔ اس میں

نہ جھگڑا تھا نہ لڑائی ۔ نہ کسی سے امید و بیم تھی ۔ نہ کسی قسم کی خصوصیت ۔ یہ زندگی میرے مزاج کے عین مطابق تھی ۔ مجھے کبھی بھی ایسے جاہ و منصب کی رغبت پیدا نہیں ہوسکی جس کی انتظامی ذمہ داریوں سے میرے وقت کا نقصان اور پریشانی خاطر لاحق ہو ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ میں مقالات بھی لکھ لیتا تھا ۔ اس کی ابتداء جریدہ السفور سے ہوئی تھی ۔ ۱۹۳۳ع میں لجنۃ التالیف کے بعض ارکان کے اشتراک عمل سے استاد احمد حسن الزیات[1] کو ''الرسالہ'' شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ ان میں میں بھی شامل تھا ۔ میں ہر ہفتے ایک مقالہ لکھ لیتا اور اس کام سے لذت حاصل کرتا ۔ مقالہ لکھنے کے لیے بہت سی انگریزی کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ۔ لیکن مجھے زیادہ تر اپنی واردات قلب ، اپنی عقل اور اپنے حواس پر اعتماد ہوتا ۔

اِن مقالات پر جو ادبی قسم کے ہوتے تھے اجتماعی اور اصلاحی رنگ غالب رہتا ۔ ادب کی یہ قسمیں میری دل پسند اور سچائی کی ترجمان تھیں ۔ ادب وہی ہے جو دل کی سچی ترجمانی کرے اور لکھنے والے کے تجربات کو صاف صاف بیان کر دے ۔ اس قسم کے مقالات کے لکھنے سے میرے دل کو سکون حاصل ہوتا کیونکہ میرے سینے میں بہت سے افکار پوشیدہ تھے جن کا اظہار ضروری تھا ، جب کسی مقالے کا موضوع سوچتا تو کھاتے پیتے ، سوتے جاگتے اسی کا دھیان رہتا ۔ یہ سوچ بچار ایک قسم کی عادت بن گئی تھی جس طرح لوگوں کو شراب پینے اور حقہ نوشی کی مستقل عادت پڑ جاتی ہے ۔ اس باب میں مجھے دوسرا تجربہ بھی حاصل ہوا ۔ جب میں فجرالاسلام یا ضحی‌الاسلام کی کوئی فصل لکھنے

---

۱ ۔ استاد احمد حسن الزیات : عصر حاضر کے مشہور ادیب اور صحافی ۔

کا ارادہ کرتا تو اپنے آپ کو ہمیشہ تیار پاتا لیکن مقالات کی تحریر کے وقت طبیعت بند رہتی ۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میرے جذبات کو برانگیختہ کیا جائے یا اہتزاز کی کیفیت پیدا کی جائے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے لیے کوہ کندن و کوہ بر آوردن والا معاملہ ہوتا ۔ کبھی ایک موضوع پر رہوارِ قلم سرپٹ دوڑا جاتا اور کبھی سست رفتاری کا موقع آ جاتا لہٰذا میں لکھنا چھوڑ دیتا ۔ اس کی وجہ میرے لیے بیان کرنا بے حد مشکل ہے ۔ اس کا سبب مزاج کی صلاحیت اور عدم صلاحیت یا عوامل کا قوی اور کمزور ہونا ہے ۔

مضمون نویسی کی ابتدا سے میں لفظی آرائش کو چھوڑ کر جودتِ معنی کا زیادہ خیال رکھتا ہوں ۔ لفظی خوبصورتی کی بجائے مجھے تولید معانی کی فکر لگی رہتی ہے ۔ اس سے بعض دفعہ عبارت میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے ۔ مذکر کی ضمیر مونث اور مونث کی ضمیر کو مذکر لکھ دیتا ہوں اور اس کا پتہ تصحیح کے وقت چلتا ہے ، کبھی یہ بھی چھوٹ جاتی ہے ۔ معنی آفرینی کی خاطر عبارت میں شرح و بسط سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ پڑھنے والے کے دل میں بات اتر جائے ۔ اگرچہ یہ مخلِ عبارت ہوتا ہے ۔

انگریزی ادب کے اثر سے میں نے بغیر کسی مقدمے یا تمہید کے بات کہنی سیکھی اور کسی تکلف کے بغیر معنی کی وضاحت ، کاتب اور متکلم میں قرب ، بلند بانگ و ہیچ باطن مقال سے پرہیز کی عادت ڈالی ۔ وضوح عبارت کے شوق سے کبھی کبھی عامی لفظ بھی اختیار کر لیتا ہوں ۔ اگر پختہ اسلوب سے احتمالات اور تاویلات کا دروازہ کھلتا ہو تو مجھے اس کے بجائے سہل اور سادہ اسلوبِ بیان ہی پسند ہے ۔

ان وجوہات کی بنا پر بہت سے ادیب شک میں پڑ گئے ہیں کہ

میں ادیب ہوں یا عالم ۔ لیکن اس شک کی اہمیت ہی کیا ہے ۔ مجھے تو یہی اچھا لگتا ہے کہ میں اپنے احساسات اور جذبات کی صحیح ترجمانی کر دوں ، نہ کہ اپنا اسلوبِ بیان تراش خراش کر بناؤں کہ لوگ مجھے ادیب کہہ کر پکاریں ۔

میں مقالہ لکھتے وقت موضوع کو مختصر طور پر لکھ لیتا ہوں اور جب ایک دفعہ لکھ لیتا ہوں تو نئی بات پیش آنے پر بدل دینا چاہتا ہوں ۔ لکھنے سے پہلے مجھے سوچنے کی عادت نہیں ہے ۔ اس بنا پر لکھتے وقت کئی اچھے خیالات گزرتے رہتے ہیں ۔ اس عادت نے میری آنکھوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے ، کیونکہ ڈاکٹروں نے جب لکھنے پڑھنے کی ممانعت کر دی تو املا لکھوانا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا ۔ جتنے خیالات لکھتے وقت امڈ آتے ہیں اتنے املا کراتے وقت نہیں آتے ۔ میں الرسالہ میں بھی مضامین لکھتا رہا لیکن پابندی نہ ہو سکی ۔ لجنۃ لتالیف نے رسالۃ الثقافۃ جاری کیا تو میں اس کا مدیر بنایا گیا ۔ رسالے میں جتنے مضامین آتے وہ مجھ کو پڑھنے پڑتے ۔ اس کے علاوہ میں خود بھی لکھتا رہتا ۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ ادب کی دوسری اقسام ، افسانہ نگاری وغیرہ ، میں بھی طبع آزمائی کی جائے ۔ بعض دفعہ کوشش بھی کی لیکن یہ مشق جاری نہ رہ سکی ۔ بہتر ہوتا کہ چھوٹی کہانیوں کے بعد بڑی کہانیاں لکھی جاتیں ، چاہے میں کامیاب ہوتا یا ناکام لیکن بہرحال زمانہ گزر گیا ۔

رسالے میں لکھنے کے علاوہ دوسرے رسائل الہلال ، المصور وغیرہ کے لیے بھی مضامین لکھ لیتا تھا ، بعد میں ان کو اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں فیض الخاطر کے نام سے شائع کر دیا ۔

ان کے علاوہ میں ریڈیو پر بھی تقاریر نشر کرتا رہتا ۔ یہ

تقریریں اسلوب اور موضوعات کے لحاظ سے مقالات سے مشابہ ہوتی تھیں ماسوائے اس کے میں موضوع کی سہولت کا بھی لحاظ رکھتا۔ عام لوگوں کے سمجھانے کے لیے میں عامی زبان بھی اختیار کر لیا کرتا۔ مجھے ادیبوں کی قدامت پسندی سے نفرت تھی کیونکہ وہ ایک خاص طبقے کے لیے لکھتے ہیں حالانکہ ادیب کا فرض ہے کہ سب کے لیے عقلی غذا بہم پہنچائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام دینے سے قاصر ہے۔ ایک دفعہ چینی مسلمانوں کا ایک بڑا لیڈر، مصر آیا۔ ہم کئی دفعہ ملے اور لمبی چوڑی گفتگو کی۔ میں نے اُس کا تعارف استاد[1] توفیق الحکیم سے کرایا۔ یہ لیڈر مجھ سے پوچھنے لگے کہ عوامی ادیب ہیں یا اونچے طبقے کے۔ یہ سوال میرے دماغ میں گردش کرتا رہا۔ جب میں نے جواب دیا کہ یہ اونچے طبقے کے ادیب ہیں تو چینی رہنما نے پوچھا تو پھر عوامی ادیب کون ہیں۔ مجھ سے تو کوئی جواب بن نہ پڑا۔ لیکن بار بار یہ خیال آتا رہا کہ عوام کے لیے کوئی ادیب نہیں ہے۔ فصیح اور عامی زبان کا آپس میں جو مشکل تعلق ہے اُس کا بار بار دھیان آتا رہا۔ فصیح زبان کے اعراب تعلیم کی اشاعت اور فروغ میں حارج ہیں۔ فصیح زبان کی تعلیم کے لیے لمبا عرصہ درکار ہے۔ مدارس کے طلبہ نو سال ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں گزارتے ہیں اور چار سال یونیورسٹی میں، لیکن پھر بھی نہ صحتِ اعراب کے ساتھ عربی پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی لکھ سکتے ہیں۔ میں نے بعض مضامین میں رائے ظاہر کی تھی کہ اس کے تدارک کی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔ میرے خیال میں مشکل کلمات کو عوامی زبان سے خارج کرکے وافر کلمات میں اعراب کے بجائے

۱۔ استاد توفیق الحکیم: (المولود ۱۸۹۸ء) مصری ڈرامہ نگار۔

وقف لگا دیا جائے تو یہ عوام کے لیے تقریر و تحریر اور تعلیم و تعلم کی زبان بن سکتی ہے ۔ فصیح زبان لکھے پڑھوں اور اعلٰی تعلیم کی زبان رہنی چاہیے یا اُن لوگوں کے لیے جو قدیم ادب سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ۔ اس طرح عامی اور فصیح ، دونوں زبانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔ عامی زبان گھروں ، بازاروں اور منڈیوں میں بولی جاتی ہے ۔ اس میں دفتری زبان سے زیادہ زندگی کی علامات موجود ہیں جن سے فصیح زبان محروم ہے ۔ عامی زبان کی ترقی سے لوگوں میں تعلیم کی نشر و اشاعت میں بھی مدد ملے گی اور عوام کو بھی ادبی غذا ملے گی ، جس سے وہ آج تک محروم چلے آ رہے ہیں ۔ یہ جرم تو ایسا ہے کہ بے گناہ کو قید کر دیا جائے اور غریب کو بھوکوں مارا جائے لیکن اس تجویز کی سخت مخالفت کی گئی ۔

۔—:o:—

عوامی یونیورسٹی

۱۹۴۵ء میں جب ڈاکٹر عبدالرزاق السہنوری وزیرِ تعلیم تھے، مجھے وزارتِ معارف میں ادارۃ الثقافیہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ اس ادارے کا دائرۂ عمل کام کرنے والے کے لیے بہت وسیع تھا اور کام نہ کرنے والے کے لیے محدود۔ اس کے اعمال میں مصر سے باہر دوسرے عرب ممالک میں مشرق سے آنے والے طلبہ کے داخلے کا انتظام، مصر اور ممالک مشرقیہ و غربیہ کے ثقافتی روابط کا اہتمام، مدرسی براڈکاسٹ کی تنظیم، طلبہ کی بیرون از مدرسہ اجتماعی زندگی کی نگرانی اور سنیما وغیرہ سے تعلیمی کام لینا شامل تھے۔

مجھے ایک اور خیال نہ جانے کہاں سے آیا۔ وزارتِ تعلیم نے تعلیمی کوششوں کو مدرسے کی چہار دیواری میں محصور کر لیا تھا اور میں اس کوتاہی سے واقف تھا۔ حالانکہ وزارت کی ذمہ داری مدارس کے علاوہ دوسری طرح سے بھی لوگوں کو مہذب بنانا ہے۔ دوسری غلطی یہ بھی کہ اربابِ تعلیم نے سمجھ رکھا تھا کہ صرف پڑھنے پڑھانے سے لوگوں میں ثقافت کی اشاعت ہو سکتی ہے۔ لیکن میری رائے میں سننے سنانے اور سنیما کی فلموں کے دیکھنے کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے ممالک میں تعلیمِ بالغاں کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا تھا۔ ادارۃ الثقافیۃ میں میرے ساتھ دوسرے نوجوانوں نے بھی اس طریقے کا مطالعہ کیا تھا۔ ہر روز عصر کے وقت وہ لجنۃ التالیف کے چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو کر

سوچ بچار کرتے کہ مصر کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہوگا۔ بعد میں ہم مفصل نوٹ قلمبند کر لیتے۔ اس فکر سے جامعہ شعبیہ کی بنیاد پڑی۔ میں نے اس کا نام مؤسسہ الثقافۃ الشعبیہ رکھا۔ یہاں طلبہ اور طالبات کو لیکچر دیے جاتے تھے۔ شامل ہونے والوں کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی۔ داخلے کے لیے کوئی امتحان نہ تھا اور نہ ہی کسی قسم کی سند عطا کی جاتی تھی۔ تعلیم نظری کے علاوہ عملی بھی تھی۔ تعلیم کا پروگرام جامد قسم کا نہ تھا بلکہ حالات و کوائف کے مطابق تبدیل ہو سکتا تھا۔ جب مسئلہ فلسطین اُٹھا تو میں نے اس کے متعلق لیکچر دیے۔ لوگوں کو ٹائپ سیکھنے کا شوق ہوا تو اس کے لیے ایک الگ شعبہ قائم کر دیا گیا۔ انتظامی امور کی نگرانی کے لیے مصر کے مشہور ترین آدمیوں کی کمیٹی موجود تھی، وزارتِ تعلیم کے سکولوں اور کارخانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ وزارتِ تعلیم کے استاد تعلیم کے لیے منتخب کر لیے جاتے تھے۔ پڑھائی کا وقت شام کو پانچ بجے سے آٹھ بجے تک تھا۔

یہ منصوبہ وزیرِ تعلیم کے گوش گزار کیا گیا تو انھوں نے ہمت بندھائی اور سترہ ہزار پونڈ کی رقم ابتدائی مصارف کے لیے مختص کر دی گئی۔ اس طرح یہ خیال حقیقت بن گیا۔ جب داخلے کا اعلان ہوا تو لوگوں نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا جس سے معلوم ہوا کہ ایک شدید ضرورت پوری ہوئی ہے۔ اگر کوئی کوتاہی یا فروگذاشت محسوس ہوئی تو بقدر استعداد اس کی اصلاح کر دی گئی۔ دائرہ عمل میں وسعت کے ساتھ مالی اخراجات بھی بڑھتے گئے۔ پہلے تو جامعہ کی سرگرمیوں کا مرکز قاہرہ تھا لیکن یہ تحریک دوسرے شہروں تک پھیل گئی۔ سنیما دکھانے والے گاؤں اور قصبوں میں پھیل گئے۔ کاریگر اور کسان بڑے شوق سے یہ

فلمیں دیکھتے ۔ سرکاری عہدہ دار اور کم درجے کے ملازم ساتھ بیٹھ کر جدید فن کا مطالعہ کرتے ۔ ایک خاتون اور اُس کی لڑکیاں کھانا پکانے ، امور خانہ داری اور سینا پرونا سیکھتیں ۔ تھوڑے سے عرصے میں طلبہ اور طالبات کی تعداد سترہ ہزار کے قریب پہنچ گئی اور اس کا میزانیہ ستر ہزار پونڈ کے لگ بھگ جا پہنچا ۔ لیکن اگر ہم دوسرے ممالک سے اپنا مقابلہ کرتے تو بالکل ابتدائی حالت نظر آتی ۔

میں نے یورپ کی مشہور کتابوں کے عربی ترجمے کی تحریک کی تھی ۔ وزارتِ تعلیم نے بعد میں اس کام کو وسعت دی ۔ مجھے جتنا فخر جامعہ کے انتساب سے ہے اتنا کسی کام سے نہیں ۔ جب ایک سال کے بعد ادارۃ الثقافیہ سے علیحدہ ہونا پڑا تو جامعہ شعبیہ کی مجلسِ انتظامیہ کی سربراہی کا شرف حاصل ہوا جو آج تک قائم ہے ۔

جب میں آخری مرض میں مبتلا ہوا تو اس کی مجلسِ انتظامیہ کی صدارت سے بھی مستعفی ہو گیا ۔ وزیرِ تعلیم نے لکھا :-

"مجھے اُمید تھی کہ آپ کی نگرانی میں جامعہ شعبیہ ترقی کی طرف قدم اُٹھائے گی لیکن آپ کے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق میں دلی افسوس سے آپ کا استعفیٰ منظور کرتا ہوں ۔ اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں اُن نیک کوششوں کے لیے جو آپ نے ثقافتِ عامہ اور مؤسسہ ثقافۃ خاصہ کے لیے کی ہیں ، آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کی صحت کاملہ اور پُر سعادت زندگی کا متمنی ہوں ۔"

اس کے بعد ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا ۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں کا ذکر ہے ۔ میں ایک دوست سے ملنے اسکندریہ کے سول سیکریٹریٹ میں گیا ۔ میرے یہ دوست مجلسِ وزراء کے سیکریٹری تھے ۔ جب میں نکل کر صحن

میں گیا تو ایک گاڑی کھڑی ہوئی دیکھی ۔ مجھے اس میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا ۔ میں نے اندر دیکھا تو وزیرِ خارجہ استاد احمد لطفی السید بیٹھے تھے ۔ مجھے ایک جنازے کی مشایعت کے لیے کہا گیا ۔ واپس آیا تو وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے ۔ وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری نے آکر ان سے کچھ کہا جس کو میں اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکا ۔ وزیرِ خارجہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "کیا تم فلسطین کانفرنس لندن میں مصری نمائندوں کے ساتھ چلو گے ؟" میں نے معذرت کر دی اور وجہ یہ بیان کی کہ میں عالم ہوں یا کم از کم علم سے انتساب رکھتا ہوں مگر سیاسی معاملات میں عمر بھر شرکت نہیں کی ۔ امورِ سیاست کے لیے طویل مطالعے اور تجربے کی ضرورت ہے ۔ کہنے لگے ایک سیاست داں کے ساتھ عالم کا بھی ہونا ضروری ہے ۔ انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو میں رضامند ہو گیا ۔

میں دفتر سے باہر نکلا تو سوچتا تھا کہ کس کام کے لیے آیا تھا اور کس کام کی خاطر اب جا رہا ہوں ۔ اس کے بعد سفر کی تیاری شروع کر دی ۔ مسئلۂ فلسطین اور صہیونیت[1] پر لائبریریوں میں کتابوں کی تلاش شروع کر دی ۔ وزارتِ خارجہ اور عرب لیگ کے دفاتر میں قضیۂ فلسطین اور وہائٹ پیپر (قرطاس ابیض) کے متعلق جتنی کتابیں تھیں وہ پڑھ ڈالیں ۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ہوائی جہاز کا سفر کیا ۔ زمانے کے کام بھی عجیب ہیں ۔ ایک وقت تھا کہ میں نے گاڑی میں طنطا کا سفر کیا تھا تو راستہ بھر روتا رہا تھا اور اب ہوائی جہاز میں مصر سے لندن کا سفر کیا تو نہ میں رویا اور

---

۱ - Zionism

نہ ہی اداس ہوا - ہوائی جہاز اوپر چڑھا تو مجھے بڑا ڈر لگا - ہمارا رہنما کہنے لگا کہ ہم ایک ہزار قدم کی بلندی پر آ گئے ہیں - پھر کہنے لگا چار ہزار ، چھ ہزار ، آٹھ ہزار لیکن جب ہوائی جہاز سنبھل گیا تو ذرا اطمینان ہوا - میرے پاس کئی سیاست دان بیٹھے ہوئے تھے جو اس سے پہلے ہوائی جہاز سے سفر کر چکے تھے اور مزے سے سوئے ہوئے تھے لیکن مجھے نیند نہ آ سکی - مالٹا اور پیرس کے درمیان صرف تھوڑی سی اونگھ آئی تھی - سترہ گھنٹوں کی پرواز کے بعد ہوائی جہاز لندن کی طیران گاہ میں جا اترا - انسان کتنا ضعیف ، کتنا کمزور اور کتنا صاحبِ اقتدار ہے -

میں نے ہوائی جہاز میں ممتاز عرب سیاست دانوں کو سیاسی معاملات میں بحث و مباحثہ کرتے دیکھا - یہ میرے لیے نئی بات تھی - میں تو صرف علمی محافل اور مجالس میں شرکت کا عادی تھا - ان کا طریقِ بحث بھی غیر عالمانہ تھا - میں سنتا زیادہ اور بولتا کم تھا - اہم معاملات میں کبھی کبھی اظہار رائے کرتا - ہماری گول میز کانفرنس ہوئی جس میں مسٹر بیون وزیرِ خارجہ برطانیہ ، وزیرِ مستعمرات اور مشرقی معاملات کے مشیر بھی شامل تھے - تقریریں ہوئیں تبادلۂ افکار کئی دن ہوتا رہا - پھر عرب اور انگریز مندوبین کی ایک چھوٹی سی کمیٹی بنا دی گئی جس کا کام کسی متفق علیہ نتیجے پر پہنچنا تھا - یہ کمیٹی اپنے کام سے فارغ ہو کر انگریز اور عرب نمائندوں کے سامنے اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتی اور بعد میں بحث و تمحیص ہوتی - ایک دوسرے کو نتیجے سے آگاہ کیا جاتا اور مناسب موقع پر ہمیں بلا لیا جاتا -

اس سفر نے مجھے بے حد متاثر کیا - لندن میں میرے کئی دوست تھے جنھوں نے جنگ سے قبل اور جنگ کے بعد انگلستان میں طویل

عرصہ گزارا تھا ۔ یہ لوگ انگلستان کی اجتماعی زندگی اور جنگ کے اثرات کا ذکر کرتے تو میں بڑے شوق سے سنتا ۔ انگریز دوسرے لوگوں جیسے تھے ۔ اُن کی عقل بھی مافوق الفطرت نہ تھی ، لیکن اُن میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہر معاملے میں ماہرینِ[1] فن پر اعتماد کرتے جنھوں نے ہر موضوع میں اختصاص حاصل کیا ہوتا ۔ جب کوئی معاملہ پیش آتا تو ان ماہروں کی خدمات سے فائدہ اُٹھاتے اور اُن کی آراء سے مستفید ہوتے ۔ دوسری وجہِ امتیاز یہ تھی کہ اُنھوں نے ہر ایک کام کو اُس کے ماہرِ فن کے سپرد کیا ہوا تھا ۔ بڑے کو چھوٹے پر اور چھوٹے کو بڑے پر اعتماد ہوتا ۔ سب امور علمی طور پر منظم ہوتے ۔ ہر چیز پہلے سے سوچی اور سمجھی ہوتی ۔ عین وقت پر نہ سوچتے ۔ یہ لوگ فکری انتشار کے عادی نہ تھے ۔

انگریز عوام کی حریت پسندی ، بے حد پسند آئی ۔ ہر انسان اپنے کو انسان سمجھتا ہے ، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ۔ کسی وزیر کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ ایک معمولی کاریگر سے زیادہ چیز لے لے ۔ وزیر خارجہ کی قمیض کا کالر بوسیدہ ہوگیا تھا ۔ وزیر مستعمرات کہنے لگے کہ جب سے جنگ چھڑی ہے ، انھوں نے نیا سوٹ نہیں خریدا ۔ وزیر اعظم ، کنٹین سے خود چائے لینے جاتے تھے ۔ ایک وزارت کے سیکریٹری علی الاعلان کہتے پھرتے کہ انھوں نے کوئلہ مقررہ راشن سے اس لیے زیادہ لے لیا ہے کیونکہ اُن کا گھر مرطوب سا ہے جس کے لیے زیادہ آگ کی ضرورت ہے ۔ ہر چیز کے لیے قطار لگی رہتی تھی ۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتا ۔ بڑا سرکاری عہدہ دار ایک معمولی مزدور کے پیچھے کھڑا ہو کر

---

۱ - Specialists -

اپنی باری کا انتظار کرتا ۔ اس قسم کی اشتراکیت ، اجتماعی زندگی کے ہر گوشے پر چھائی ہوئی تھی ، جس سے مزدوروں اور غریبوں کا درجۂ معیشت اونچا ہو گیا تھا ۔ دولتمندوں سے خوب ٹیکس لیے جاتے تھے ۔ کوئی دولت مند پانچ ہزار پاؤنڈ سے زیادہ نفع نہیں کما سکتا ۔ حقوق اور فرائض میں سب یکساں تھے ۔ مختلف طبقات کے درمیان امتیازی فرق جاتا رہا تھا ، جس کی وجہ سے زندگی میں ٹھہراؤ اور ایک قسم کا سکون سا پیدا ہو گیا تھا ۔ لوگوں کی عادات و اطوار اور اخلاق بھی پسند آئے لیکن جب انگریزی استعمار کی سیاست خارجہ ، خاص کر مشرق میں کارستانیاں ، دیکھیں تو سخت نفرت پیدا ہو گئی ۔

اس سفر کا فائدہ اٹھا کر میں بعض دوستوں کے ساتھ سوئٹزر لینڈ بھی گیا تاکہ چند دن رہ کر وہاں طبعی مناظر سے لطف اٹھا سکوں ۔ وہاں سے ہم مارسیلز گئے ۔ وہاں کے مناظر اور موسم سے خوب متمتع ہوئے اور ماسوائے فلسطین کے بہت سی چیزیں ساتھ لے کر مصر واپس آئے ۔

——:o:——

۳۰

ادارة الثقافیہ

میری عمر ساٹھ سال کی ہوئی تو مجھے ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا ۔ میری دیرینہ تمنا تھی کہ ملازمت کے جنجھٹ سے آزاد ہوکر کوئی کام کروں جس میں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی نہ ہو لیکن ملازمت چھوڑنے کا حوصلہ نہ تھا اور دوسرا سبب یہ تھا کہ محکمۂ تعلیم کی ملازمت حکومت کے اثر و رسوخ سے کسی حد تک بالا تر تھی اور طلبہ اور کتابوں سے اشتغال میرا دل پسند مشغلہ تھا ۔

بہرحال میں نے ساٹھ سال کی عمر تک ملازمت کی اور یہ سوچتا تھا کہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کیا کروں گا پھر خیال آیا کہ قدیم کتب کی نشر و اشاعت کے لیے ایک ادارہ قائم کروں اور اس کا نفع و نقصان میرے ذمہ رہے ، لیکن میرا تعلق لجنة التالیف و الترجمہ و النشر سے تیس سال سے چلا آ رہا تھا اور جو کام میرے پیش نظر تھا وہ یہ انجمن کر رہی تھی ۔ اس انجمن کی زمام کار ایک انتظامی مجلس کے ہاتھ میں تھی جس کی وجہ سے کام کاج کی آزادی نہ تھی ۔ لیکن میں بغیر کسی روک ٹوک کے کام کرنا چاہتا تھا ۔ اس بنا پر میں نے انجمن سے استعفی دے دیا لیکن انجمن کے ارکان نہ مانے ۔ میں نے زیادہ دباؤ بھی نہ ڈالا کیونکہ میں شروع سے اس کا نگران چلا آ رہا تھا اور اس سے علیحدگی ناگوار تھی ۔ میں نے اس کے لیے خون پسینہ ایک کر دیا تھا ۔ یہاں

کتابوں کی تالیف ، ترجمہ اور نشر و اشاعت میں بہت سے تجربات حاصل کیے ۔ اس ادارے کی کتابوں کے توسط سے سارے عالم عرب میں ہماری رسائی ہوگئی تھی ۔ لوگوں کا انجمن پر اعتماد تھا کیونکہ جب تک ماہرین فن کسی کتاب کو پڑھ کر اظہار رائے نہ کر دیتے اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہ آتی ۔ دوست احباب جمعرات کی شام کو انجمن میں آ بیٹھتے ۔ مختلف موضوعات پر انتہا پسندوں ، اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں میں تبادلہ افکار ہوتا ۔ مطالعہ شدہ کتب پر تنقید کی جاتی ۔ مشرق کی حالت پر شکوہ گزاری ہوتی اور قوم کے عیوب گنائے جاتے ۔

انجمن کے ارکان کی تعداد بڑھ کر اسی ہوگئی تھی ۔ اس میں مصر کے بہترین تعلیم یافتہ لوگ شامل تھے ۔ دو سو کے قریب کتابیں شائع ہو چکی تھیں ، لاکھوں پاؤنڈ کی کتابیں گوداموں میں جمع تھیں ۔ مشرق میں اپنی قسم کا یہ پہلا ادارہ تھا ۔ اگرچہ تجارتی اور مالی لحاظ سے دوسرے بہت سے ادارے بڑھے ہوئے تھے لیکن علمی لحاظ سے ان کو اس انجمن سے کوئی نسبت نہ تھی ۔

۱۹۴۶ع میں ماہِ رمضان کی ایک موسم گرما کی رات کا ذکر ہے ۔ میں اسکندریہ میں تھا کہ مرحوم نقراشی پاشا[1] نے ملاقات کے لیے بلایا انھوں نے مجھے سعد پارٹی کے اخبار کا ایڈیٹر بننے کو کہا ۔ اس اخبار کا نام الاساس تھا ۔ میں نے معذرت پیش کردی کہ میں نے اخبار نویسی کبھی نہیں کی تھی ۔ الثقافۃ جیسے ادبی اخبار اور الاساس جیسے سیاسی اخبار میں بڑا فرق ہے ۔ پھر اس کے لیے سیاست میں بھی سرگرم حصہ لینا ضروری ہے جس کو میں شروع سے ناپسند

---

۱ ۔ نقراشی پاشا : سابق وزیر اعظم مصر ۔

کرتا چلا آیا ہوں ۔ اخبار چلانے کے لیے کسی سیاسی راہنما کی اندھا دھند تقلید اور مخالف کی توہین و تذلیل بھی ضروری ہے ، جس کے لیے میں رضامند نہیں ہوں ۔ میں تو عمر بھر علمی کاموں میں مصروف رہا ہوں ۔ اخبار نویسی کے لیے شب بیداری اور زید و عمر سے ملاقات بھی ضروری ہے جس کی میری صحت متحمل نہیں ہو سکتی ۔ مرحوم کہنے لگے کہ آپ جواب دینے میں جلدی نہ کریں ۔ دو تین دن بعد سوچ کر جواب دیں ۔ میں آن سے دوبارہ ملا اور انکار کر دیا ۔ مجھے لجنۃ التالیف ، جامعۂ شعبیہ ، دارالکتب اور مجمع اللغوی میں کام کرنا پڑتا تھا ۔ بہت سی دوسری انجمنوں کا ممبر تھا ۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف میں بھی لگا رہتا ، ریڈیو پر بھی مقالات پڑھتا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے عرب لیگ کے ادارۃالثقافیہ کی ڈائرکٹری پیش کی گئی ۔ یہ علمی کام میرے دل کو بھا گیا لہٰذا میں نے اسے بخوشی قبول کرلیا ۔ مجھے سارے عالمِ عرب سے علمی تعاون قائم کرنے کی آرزو تھی اور یہ اس آرزو کی تکمیل کا موقع تھا ۔

میں اور میرے دوستوں نے ادارۃالثقافیہ میں مخطوطات کا شعبہ قائم کیا جس کی غرض و غایت ضروری آلات خرید کر تمام دنیا سے قدیم مخطوطات کی عکسی تصاویر جمع کرنا تھی ۔ دارالکتب ، جامعۂ مصریہ اور شہر اسکندریہ سے اہم مخطوطات کے فوٹو لے کر ایک جماعت کو لبنان اور شام اور دوسری کو آستانہ (قسطنطنیہ) بھیجا ۔ اہم کتابوں کے ترجمے اور ریڈیو پروگرام کے ذریعے سے ثقافتی تعاون کی راہ ہموار کی ۔ عربی زبان و ادب ، جغرافیہ ، تاریخ ، قومی تعلیم کے مسائل پر بحث اور سوچ بچار کرنے کے لیے ایک ثقافتی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تاکہ سب عرب ممالک اس میں

شامل ہو کر باہمی تعاون سے کام لیں ۔ ثقافتی کانفرنس کا پہلا جلسہ ۱۹۴۷ع کے موسم گرما میں لبنان میں ہوا اور اس کے تھوڑی دیر بعد مؤتمر آثار کا جلسہ دمشق میں منعقد ہوا ۔ ان کانفرنسوں میں کام اور شرکت کرکے میں پھولا نہ سماتا تھا ۔

ادارۃالثقافیہ نے ایک عجائب گھر بھی قائم کیا ۔ مختلف عرب ممالک کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے سنیما اور ریڈیو سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ۔ عرب ممالک کے ثقافتی معاملات کے لیے یونیسکو[۱] سے گہرا تعاون قائم کیا گیا ۔ اس اثنا میں جدید مصر کے نئے مکان کو جس میں ، میں بیس سال سے رہ رہا تھا ، چھوڑ کر اپنے پرانے مکان الجیزہ میں چلا آیا تا کہ میرے لڑکوں کو یونیورسٹی کا قرب حاصل رہے ۔

—:o:—

---

۱ - Unesco -

۳۱

ہسپتال

زندگی حسبِ معمول بسر ہو رہی تھی ، کام کاج پرانی ڈگر پر چل رہے تھے ، اُمیدوں اور آرزوؤں کا میدان کھلا پڑا تھا اور میں پڑھنے لکھنے اور تصنیف و تالیف میں مشغول تھا کہ میں نے اچانک ایک سیاہ نقطہ اپنی عینک پر دیکھا ۔ میں یہ سمجھا کہ پانی کا قطرہ ہے ۔ عینک اُتار کر اُسے صاف کیا ۔ دوبارہ عینک لگائی تو پھر سیاہ نقطہ نظر آ رہا تھا ۔ نقص تو آنکھ میں تھا نہ کہ عینک میں ۔ اُس روز عیدالضحیٰ کی چھٹی تھی ۔ سب لوگ حتیٰ کہ ڈاکٹر بھی عید کی خوشی منا رہے تھے ۔ بڑی مشکل سے ایک ڈاکٹر ملا ۔

یہ ڈاکٹر میری آنکھوں کو دیکھ رہا تھا اور میں نتیجے سے کانپ رہا تھا ۔ آخر بڑے لمبے معائنے کے بعد اُس کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہوئے اور کہا :

”آپ کی آنکھوں میں موتیا اُتر آیا ہے ۔“

میں نے پوچھا : ”ڈاکٹر صاحب ! اس کا کوئی علاج بھی ہے ؟“

جواب ملا کہ ”آپریشن کے سوا دوسرا کوئی علاج نہیں ہے ۔“

”کیا یہ اپریشن سخت قسم کا ہوگا ؟“

کہنے لگا ”ہاں ، ڈیڑھ ماہ آنکھوں پر پٹی بندھی رہے گی“ ۔

میں تو یہ سن کر گھبرا گیا ۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس لکھنے اور پڑھنے سے محروم ہونے کا تھا جبکہ لکھنا پڑھنا ہی میرا واحد

مشغلہ تھا ۔

کبھی خیال آتا کہ ڈاکٹر غلط تشخیص بھی کرلیا کرتے ہیں ۔ اس طرح کے واقعات روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں کہ صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے درست علاج نہ ہوسکا ۔ میں دوسرے اور پھر تیسرے ڈاکٹر کے پاس گیا لیکن سب نے ایک ہی مرض اور ایک ہی علاج تجویز کیا ۔

میں ہسپتال میں داخل ہوگیا اور علاج شروع ہوا ۔ اپریشن سے کئی ہفتے پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اب دنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی ۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ بیٹھنے اور پہلو کے بل لیٹنے کی اجازت نہ تھی گویا مجھے چارپائی پر جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا ۔ میں نے یہ ساری تکلیف صبر سے برداشت کی ۔ میں دنیا ، اس کی محبت اور دنیاداروں کی دنائت پر غور کرتا کہ وہ معمولی چیزوں کے لیے لڑتے رہتے ہیں ، جبکہ یہ دنیا اور اس کی سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں ۔ اگر یہ لوگ سمجھ دار ہوتے تو لڑنے جھگڑنے کے بجائے بھائی بھائی بن کر رہتے اور حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے انجام کار کی فکر میں لگے رہتے ۔

میں نے کوشش کی کہ تاریکی روشنی میں بدل جائے اور اگر بینائی جاتی رہی ہے تو بصیرت کی روشنی چمک اٹھے ۔ اس کوشش میں کبھی تو کامیابی ہو جاتی اور کبھی ناکامی ۔ میں تو ہمیشہ سے یہ سمجھا ہوا تھا کہ اس دنیا کو آنکھوں کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے اور بصارت سے محروم ہو جانے پر یہ دنیا چوپٹ ہو جاتی ہے ۔ کبھی خیال آتا کہ میں دوبارہ اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاؤں گا جس طرح پہلے تھا تو اطمینان اور راحت محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد ڈر اور گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی ۔ رات ہوتی تو عیادت کے لیے آنے والے

دوست و اقرباء گھر چلے جاتے ۔ اردگرد کے لوگ سوجاتے اور میں تنہا گہری سوچ میں گھر جاتا ۔ اس طرح رات اور نفس کی تاریکیاں آکر مجھے گھیر لیتیں ۔ میں سونے کی کوشش کرتا لیکن نیند نہ آتی۔ میں اطمینان بخش افکار کی تلاش میں رہتا لیکن بے سود ۔ قریب ہی یونیورسٹی کا کلاک تھا ۔ اس کے گھنٹے گنتا رہتا ۔ اگر کبھی اونگھ آجاتی تو خیال ہوتا کہ شاید رات گزرگئی ہے ۔ سڑک پر آنے جانے والوں پر اور گاڑیوں کی نقل و حرکت پر کان لگائے رکھتا اور پھر پوچھتا کہ یہ لوگ صبح صبح کام پر جا رہے ہیں یا شام کو واپس آرہے ہیں ؟ اس اثناء میں بیم و رجا کا عالم رہتا کہ شاید صبح ہو گئی ہے یا رات کا اندیشہ رہتا ۔ جب گھڑی گیارہ یا بارہ بجاتی تو مجھے ڈر سا لگتا کہ یہ تو نہ ختم ہونے والی رات ہے اور ایک شاعر کا شعر پڑھنے لگتا

یا لیل بل یا ابد   اغائب عنک غد ؟

ترجمہ : اے رات بلکہ اے ابد ! کیا کبھی کل نہ آئے گی ؟

کبھی اپنے کو تسلی دیتا کہ دوسرے کمرے میں مریض پڑے ہوئے درد سے کراہ رہے ہیں اور ہائے وائے کر رہے ہیں اور میں آرام سے پڑا ہوں ۔ لیکن جلد ہی یہ احساس جاتا رہتا کیونکہ تکالیف مختلف اقسام کی ہوا کرتی ہیں اور نفسیاتی تکلیف جسمانی تکلیف سے شدید تر ہوتی ہے ۔

ایمان سے زیادہ مجھے اچھی تسلی ملنی مشکل تھی ۔ اس بھیانک وقت میں ایمان ہی سہارا دیتا ہے ۔ اگر یہ نہ ہو تو پاؤں کے نیچے دوزخ معلوم ہوتا ہے ۔ اگر لوگوں کو اس اس کا پتہ چل جاتا تو وہ کبھی بھی ملحد نہ بنتے کیونکہ الحاد ایک الم ناک اور خوفناک شغل ہے ۔ پھر یہ انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے جس کا اعتماد

اور اعتبار اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو انسانی زندگی خالی خولی، ڈراؤنی اور فطرت کے منافی ہوتی۔ خوش قسمتی سے میرا ایک وفا شعار لڑکا میرے پاس رہتا اور مجھے کتابیں پڑھ کر سناتا رہتا۔ اُس نے ٹالسٹائی کی کتاب اعترافات[1] پسند کی کیونکہ یہ کتاب اُس کی زندگی کی ترجمان تھی۔ ٹالسٹائی نے پہلے تو عقلِ محض کا سہارا لیا، اِس کے بعد منطقی اور مادی مقدمات نے اُسے الحاد تک پہنچایا جس کی وجہ سے وہ مذہب کو خرافات سمجھتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اُس کو پتہ چلا کہ زندگی کی کوئی قیمت نہیں اور وہ بے معنی شے ہے۔

یہ مادی زندگی جو عقلِ محض کا سہارا لیتی ہے، ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے[2]۔ زندگی کی کیا اہمیت ہے؟ مادی اور ابدی زندگی میں کون سی وجہ ارتباط ہے اور جزوی زندگی اور کلی انسانیت کو کون سی چیز مربوط کیے ہوئے ہے وغیرہ وغیرہ۔ عقلی قضیوں سے تو اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ نفسِ انسانی کا حال برا ہو کر اُس کے فکر پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ٹالسٹائی کو معلوم ہوا کہ اس قسم کی زندگی ایک حقیر سا شوشہ ہے اور وہ بقا کی مستحق نہیں ہے۔ کئی دفعہ اُس نے خودکشی کی بھی کوشش کی۔ اس کے ساتھ وہ دین پر بھی استہزاء کرتا رہا لیکن غور و فکر سے کام نہ لینا چاہتا تھا۔ بعد از خرابیٔ بسیار وہ ان سوالات کے حل کے لیے مذہب کی طرف متوجہ ہوا اور دیکھا کہ اکیلے مذہب ہی سے زندگی کا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے، اور

۱۔ Confessions

۲۔ ٹالسٹائی: (۱۸۲۸ - ۱۹۱۰ع) روسی مفکر اور ادیب۔

اس کی وجہ سے جزوی زندگی کا کلی سے اور نفسِ فردیہ کا انسانیت سے ربط ہے تو اُس کو اطمینانِ قلب نصیب ہوا اور وہ دیندار بن گیا۔

مجھے اس کتاب سے کچھ تسلی ہوئی اور فکر و نظر کا موقع بہم پہنچا۔ میں نے ٹالسٹائی اور امام غزالی کے نظریات کا موازنہ کیا۔ میں نے امام غزالی کی کتاب "المنقذ من الضلال"[1] پڑھی تھی۔ وہ ان ادوار سے گزر چکے تھے۔ دینی تقالید کو شک کی نظروں سے دیکھ چکے تھے۔ اسلام کے مختلف فرقوں کا بھی مطالعہ کر چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے فلسفۂ محض اور باطنی تعلیمات کا سہارا لیا تھا لیکن بے فائدہ۔ اب ان پر شک مسلط تھا اور وہ باطن کے ہاتھوں گرفتار تھے۔ لوگوں کو مال و جاہ اور منصب کے لیے لڑتے دیکھ کر ہر چیز سے متنفر ہو گئے۔ آخر میں سخت بیمار ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کی جسمانی بیماری باطنی بیماری کی وجہ سے تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کو افاقہ ہوتا گیا اور وہ منطق کو چھوڑ کر ٹالسٹائی کی طرح سچے دین دار بن گئے۔ وہ فطری شعور سے شفایاب ہوئے نہ کہ فلسفے کے مقدمات سے۔ ٹالسٹائی اور امام غزالی میں فرق یہ ہے کہ ٹالسٹائی الحاد کے بعد ایمان لایا اور امام غزالی تقلیدی ایمان کے بعد کشفی ایمان لائے۔ ان دونوں مرحلوں کے درمیان شک و ارتیاب کا زمانہ تھا۔

اپریشن کے پندرہ دن بعد ڈاکٹر آیا اور کہا کہ وہ کل پٹی کھول کر آنکھ دیکھے گا۔ میں نے پوچھا کہ کن احتمالات کا انتظار ہے۔ کہنے لگا کہ آنکھ کے اجزاء پیوستہ نہ ہو سکے ہوں تو سمجھ

---

۱ - Deliverance from error.

۲ - امام غزالی: (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) اسلام کے مایہ ناز۔ عالم۔ مفکر اور متکلم۔

لو کہ اپریشن ناکامیاب رہا ۔ اگر پیوستگی شروع ہو گئی تو پھر اپریشن کامیاب رہا ۔

اب چوبیس گھنٹے چوبیس مہینوں کے برابر تھے ۔ ان کے بعد کامیابی اور ناکامی کا انتظار تھا ۔ اُمید اور ہراس کا عالم تھا ۔ اس وقت ایمان ہی کام آتا ہے ۔

کبھی میں اپنے کو کہتا کہ یہ اضطراب اور پریشانی کیوں ہے ۔ تمھاری آنکھوں کی دنیا میں حیثیت ہی کیا ہے؟ تو اس طرح کیوں نہیں کہتا جس طرح حدیث شریف میں آیا ہے :

ھل انت الا اصبع دمیتِ   و فی سبیل اللہ ما لقیتِ

ترجمہ : تو صرف انگلی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں زخمی ہوئی ہے ۔ یہ تیرا نفس جو تجھے غم انگیز تفکرات میں ڈبو رہا ہے ، اس زمین کے ماضی ، حال اور مستقبل کا صرف ایک ذرہ ہے ۔ تجھے تو تنگ نظر اور تنگ حوصلہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ خودداری سے کام لے کر اندرون سے زیادہ باہر کی فکر کرنا چاہیے ۔ میں اس سوچ میں پڑ جاتا تو کچھ اطمینان سا حاصل ہوتا لیکن سینما کی فلم کی طرح یہ صورت بھی جاتی رہتی اور میں پھر غمگین ہو جاتا ۔ اس طرح کئی قسم کے خیالات آتے رہتے ۔

میری قوتِ سماعت بڑھ گئی تھی ۔ میں ہر انسان کو اُس کی آواز یا اُس کی بات کے اول کلمے سے پہچان لیتا تھا ۔ اس کے لیے کسی تعارف کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ۔ میرا ایک دوست تھا جو پندرہ سال ہوئے مجھ سے قطع تعلق کر چکا تھا ۔ اس کے بعد نہ میں نے اُسے دیکھا تھا اور نہ اُس نے مجھ کو ۔ جب اُس نے آ کر مجھے سلام کیا تو میں فوراً پہچان گیا اور اُس کا نام پکارا ۔

عیادت کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ۔ یہ لوگ مختلف قسم کی

باتیں کرتے ۔ کوئی تو غم انگیز باتیں کرتا اور کوئی حسرت انگیز ، کوئی کسی کا شکوہ شکایت کرتا اور مجھ سے فریادی ہوتا یا کسی قسم کی سفارش چاہتا ۔ کوئی وفادار دوست وقتی اختلافات کو چھوڑ کر میری عیادت کرنے آتا تو میری حالت دیکھ کر اس سے ضبط نہ ہو سکتا اور میں باہر سے اس کی ہچکیوں کی آواز سنتا ۔ اس سے سارا دن صدمہ رہتا اور رات بھر اسی کی یاد رہتی ۔

بہت سے لوگوں کو یاد کرکے جو نورِ بصارت سے محروم تھے ، میں اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتا تھا ۔ ان میں بشار بن برد[1] اور ابو العلاء معرّی[2] وغیرہ شامل تھے ۔ بشار نے اندھے پن کا بڑے عزم اور حوصلے سے مقابلہ کیا تھا ۔ اس نے بیناؤں جیسی زندگی ہنسی اور کھیل میں گزار دی تھی ۔ وہ کہا کرتا کہ جب آنکھوں سے عشق بازی نہ ہو سکے تو کان عاشق ہو جاتے ہیں ۔ اس نے شہوات میں غرق ہو کر اس مادی زندگی کا بیناؤں کی طرح لطف اٹھایا تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تندخو اور زورآور تھا ۔ کسی کو اسے چھیڑنے کی مجال نہ تھی ۔ وہ ایک سرکش فاجر بھی تھا ۔ اپنے اشعار میں گرد و غبار ، آنکھوں کی خوبصورتی اور قد و قامت کی دل فریبی کو بیان کرتا تھا ۔ اس کے اشعار میں آنکھوں سے محرومی پر نوحہ یا نورِ بصارت سے محرومی پر کسی قسم کے رونے دھونے کا اثر نہیں ہے ، لیکن ابوالعلاء نے خوب غم و حزن کا اظہار کیا ۔ لذاتِ دنیا سے منہ موڑ لیا ۔ اپنے آپ کا ، لوگوں کا اور سارے معاشرے کا خوب ماتم کیا اور تمام لوگوں سے متنفّر ہو گیا ، چاہے وہ امیر ہوں یا رہنماء ، مذہبی عالم

---

۱ ۔ بشار بن برد (۹۵ - ۱۶۷ھ) عباسی دور کا نغزگو شاعر ۔

۲ ۔ ابوالعلاء المعری (۳۶۳ - ۴۴۹ھ) عربی زبان کا فلسفی شاعر ۔ یہ دونوں شاعر نابینا تھے ۔

ہوں یا نجوسی ۔ دنیا کی کوئی چیز اُس کو نہ بھاتی تھی ۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔ اندھے پن کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے نہ آتا تھا ۔ اپنی ذات کو قید خانے کا قیدی بتلاتا لیکن اس پر بھی دنیا میں اُس کا نام گونج رہا ہے ۔ وہ معارف ، تاملات اور تفکرات کے خزانے لٹاتا رہا ۔ نظر سے زیادہ اس کا نورِ بصیرت روشن تھا ۔ اُس کی زندگی سے علم و تعلیم اور آزادیٔ رائے کو بہت نفع پہنچا جو کوئی دوسرا بینا نہ پہنچا سکا ۔

اگر خدا نخواستہ میں بھی اندھا ہوتا تو میری طبیعت ابو العلاء المعری جیسی ہوتی ۔ مجھ میں اور اُس میں یہ فرق تھا کہ وہ افکار کے لحاظ سے گہرا اور زرخیز تھا ۔ شاید بچپن میں آنکھوں کے کھو جانے کا زیادہ اثر نہیں ہوتا ۔ ایک بچہ اپنے اعضاء کی مانند ہوتا ہے ۔ تم جدھر چاہو اُس کو موڑ سکتے ہو لیکن بوڑھا بوڑھی ہڈی کی طرح ہوتا ہے جس کا جوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ (میں اپنا مطلب ایک مثال دے کر سمجھاتا ہوں) دو فقیر ہیں ۔ ایک فقیر نے ساری عمر غربت میں بسر کر دی اور دوسرا امیری کے بعد غربت کا شکار ہوا تو ان دونوں فقیروں میں کتنا فرق ہوگا ۔

میرے اردگرد دل بہلانے کی کئی چیزیں تھیں ۔ میرے پاس ریڈیو بھی پڑا تھا ۔ پہلے تو گانا سننے میں مزہ آتا تھا اب یہ بھی ناپسند تھا ۔ تقریروں سے بھی رغبت نہ رہی ۔ اب ایک چیز کا اشتیاق رہتا ، وہ ریڈیو کا اولین پروگرام تھا جو صبح کی آمد کا پتہ دیتا ۔ قرآن پاک کی تلاوت سن کر میرے اعصاب کو سکون حاصل ہوتا ۔

ڈاکٹر نے بڑے انتظار کے بعد پٹی کھول کر آنکھ دیکھی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ زخم بالکل درست ہو گیا ہے لیکن آنے والے دنوں میں سخت احتیاط کی ضرورت ہوگی ۔ زیادہ

نقل و حرکت ممنوع ہے ۔ ایک جانب سونا پڑے گا ۔ ذرا سی بے احتیاطی سارے علاج کو غارت کر دے گی لیکن مجھے نئے احکام اور صبر کا درس ناگوار گزرتا اور اس کا شکوہ اللہ سے کرتا ۔

دن گزرتے گئے لیکن جسم میں پہلی سی طاقت نہ رہی ۔ اب معمولی باتیں بھی اثر انداز ہونے لگتیں ۔ اگر اس لڑکے کو زکام سے آرام نہ آئے گا تو کیا بنے گا ۔ اس لڑکے نے دوسری دفعہ امتحان دیا ہے ، اب کیا نتیجہ نکلے گا ۔ یہ لڑکا مدرسہ سے پاس ہو کر نکلا ہے ۔ اگر اس کو ملازمت نہ ملی تو کیا ہوگا ۔ اس لڑکے نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک نہیں پہنچا ، اس کا سبب کیا ہے ؟ اب دنیا اوہام اور تاثرات کا نام تھی اور وہ مجموعہ تھی اعصاب کا ۔ جب اعصاب صحیح و سالم ہوں گے تو زندگی کا بھی مزہ آئے گا اور اگر ناکارہ ہوگئے تو صحت برباد ہو جائے گی ۔

ڈاکٹر نے صحیح و سالم آنکھ سے چالیس دن کے بعد پٹی کھولی تو مجھ کو کچھ نہ نظر آتا تھا ۔ وہ آنکھ جالی اور دروازے میں تمیز نہ کر سکتی تھی ۔ خیال ہوا کہ ناکارہ آنکھ کا کیا حال ہوگا ۔ ڈاکٹر سے شکایت کی تو وہ کہنے لگا کہ آنکھ آہستہ آہستہ اپنا کام شروع کر دے گی ۔

میں ہسپتال اور اس کی منظم زندگی سے تنگ آ گیا تھا ۔ ایک ہی طرح کی آوازیں سننے میں آتیں اور ایک ہی قسم کا کھانا ملتا ۔ ہر طرف سے کراہنے کی آوازیں آتیں ۔ گھنٹی بجتی رہتی اور دن رات ایک ہی قسم کا متحرک عمل جاری رہتا ۔

ہسپتالوں میں بعض نقائص بھی ہیں جن کا کسی کو خیال نہیں آتا ۔ اطباء کا سارا دھیان جسمانی حرارت ، اس کی تحلیل اور مریض کی مناسب یا نامناسب غذا کی طرف لگا رہتا ہے لیکن مریض کے نفسیاتی

علاج کی طرف سے سب غافل ہیں۔ جسمانی مرض کے علاج کے لیے تو لرسیں ہیں، نفسیاتی علاج کے لیے کوئی بھی نہیں تاکہ مریض ان کی باتوں سے دل بہلا سکیں اور اپنے غم و اندوہ کو بھلا دیں۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے اتفاق کیا لیکن کئی وجوہات سے اس پر عمل درآمد کو مشکل بتلایا۔

ہسپتال میں اگرچہ صفائی اور حفاظت کا مکمل انتظام تھا لیکن میں نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ جتنی جلدی ممکن ہو، مجھے ہسپتال سے خارج کر دیا جائے۔ ڈاکٹر نے اس شرط پر گھر جانے کی اجازت دی کہ زیادہ حرکت و جنبش نہ کی جائے اور نہ جسم میں اہتزاز کی کیفیت پیدا کی جائے۔ گھر پہنچنے پر مجھے گاڑی سے اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا جائے۔

اس کے بعد میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا جس طرح چھوٹا بچہ چلتا ہے، لیکن پھر بھی سر چکرانے لگتا اور میں چارپائی پر جا گرتا۔ دو تین دنوں کے بعد میں دو تین میٹر چل سکا لیکن کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے بعد ساتھ والے کمرے میں جانے اور یکساں رفتار سے چلنے کی اجازت ملی، لیکن سیڑھی پر چڑھنے اور اترنے کی طاقت نہ تھی۔ آنکھ میں نورِ بصارت آہستہ آہستہ چمکنے لگا اور جسم شفایاب ہونے لگا لیکن انقباض کی حالت پھر بھی دور نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کو دو تین دفعہ بلایا گیا۔ خوب دیکھ بھال کے بعد وہ کہنے لگا کہ سب اعضاء صحیح و سالم ہیں۔ دورانِ خون اور چھاتی وغیرہ سب درست ہیں۔ باقی رہا نفسیاتی مسئلہ تو اس کو آپ خود حل کر سکتے ہیں۔ اسباب کی تحلیل کی گئی تو دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ اندھیرے میں دیر تک سونے سے اعصاب سست ہو گئے تھے اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر مجھ کو لکھنے

پڑھنے سے روکتا تھا جبکہ میرا اوڑھنا بچھونا مطالعہ اور تحریر تھی - ان مشاغل سے محروم ہونے پر ایک قسم کی خوفناک فراغت مجھ پر طاری ہو گئی۔ صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی شغل اختیار کیا جائے۔ سنجیدگی یا خفیف بے کاری تو وبال جان بن جاتی ہے - اسی وجہ سے فارغ لوگ نرد اور شطرنج سے دل بہلاتے ہیں۔ زندگی کی لذت وہی اچھی ہے جس میں انسان اپنے آپ کو کھو دے لہٰذا بے کاری ہی میری دل گرفتگی کا باعث تھی -

میری عادت تھی کہ بہترین مصنفوں کا انتخاب کر کے اُن کی کتابوں کا شوق سے مطالعہ کرتا اور ان کی آراء پر غور و فکر کرتا - جب یہ میسر نہ ہو سکا تو کسی دوسرے کو ڈھونڈتا جو مجھے پڑھا کر سنائے اور میری املا لکھ سکے - آخر بڑی مدت کے بعد اس کا خوگر ہو سکا لیکن خود اعتمادی جیسی بات پیدا نہ ہو سکی - کبھی کسی پڑھنے والے کو تلاش کرتا تو وہ نہ ملتا اور اگر کبھی پڑھنے اور لکھنے والا ملتا تو مجھے بے رغبتی ہوتی - اس طرح شک و اضطراب بڑھتا رہا -

ماضی کے ذکر کو تازہ کرنے کے لیے اپنی لائبریری میں جاتا تو میرا رنج فزوں ہو جاتا اور میں مطالعے کے لیے بے تاب ہو جاتا۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا کہ کیا بصارت عود کر آئے گی اور میں کتب خانے سے استفادہ کر سکوں گا ؟ یہ ہزاروں کتابیں جو رکھی ہوئی تھیں ان میں سے ہر ایک کا رنگ اور مزہ علیحدہ علیحدہ تھا۔کل تک وہ صرف اشارے پر اپنی باتوں سے محظوظ کیا کرتی تھیں لیکن آج اُن کی کوئی بات سن نہیں سکتا - وہ میرے پاس آنے کے لیے بے تاب ہیں لیکن میں اپنا ہاتھ روکے ہوئے ہوں -

کبھی عجیب شعور کی وجہ سے مجھے روشنی اچھی لگتی اور

اندھیرا برا لگتا ۔ میں دن سے محبت رکھتا اور رات سے نفرت ۔ جو الفاظ روشنی پر دلالت کرتے ہیں وہ مجھ کو خوب بھاتے اور ظلمت والے ناپسند ہوتے ۔ سورج کا طلوع ہونا محبوب ہوتا اور اُس کا غروب ہونا نفرت انگیز ۔ اس غرض سے میں سوچ[1] اپنی چار پائی کے پاس رکھتا ۔ جب اندھیرے سے گھبرا اُٹھتا تو اُس کو دباتا اور کمرہ روشن ہو جاتا ۔

اس اختلال سے میرے نزدیک زندگی کی اقدار کی کوئی اہمیت نہ رہی ۔ میں لوگوں کے متعلق سنتا کہ انھوں نے زندگی کے مختلف راستے اختیار کئے ہوئے ہیں تو اُن کا مذاق اُڑاتا ۔

جب زندگی کی اقدار کا احساس نہ رہا تو نئی اقدار قائم کرنے کے لیے میں بنیادیں تلاش کرنے لگا ۔

اس تجربے سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ تعالیٰ کا بہترین عطیہ مزاج کا سکون ہے ۔ اس سے مصائب کو عزم و ثبات سے برداشت کیا جا سکتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ دنیا غم و خوشی ، وجدان و فقدان اور موت و حیات کا گھر ہے ۔ ایک انسان اس حقیقت کو بغیر کسی اضطراب کے سمجھ لیتا ہے اور شدائد پر صبر کرتا ہے جس کو یہ دونوں نعمتیں میسر ہوں وہ خوش نصیب ہے ۔

اس نفسیاتی کشمکش سے ایک سال کے بعد نجات ملی ۔ میری دائیں آنکھ ، جس کا اپریشن نہ ہوا تھا ، اچھی طرح دیکھنے لگی ۔ لیکن بائیں آنکھ کو جس کا اپریشن کامیاب ہوا تھا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا ۔ معلوم ہوا کہ موتیا بند ہے اور پانی پکنے پر اس کا اپریشن ہوگا ۔ ڈاکٹر تشخیص کرتے کہ پانی پک رہا ہے اور جلد ہی اپریشن

---

۱ - Switch.

ہو سکے گا ۔ دوسرے ماہر امراضِ چشم کو دکھلایا تو اس کی رائے تھی کہ اپریشن خراب ہوا ہے اور آنکھ کے درست ہونے کی کوئی امید نہیں ۔ اس کا عوض تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے ۔

اس سبب سے ، باوجود رغبت کے لکھنے پڑھنے کی زیادہ طاقت نہ رہی ۔ کبھی کوئی مجھ کو پڑھ کر سنا دیتا یا میں اس کو لکھا دیتا ۔ پہلے تو یہ بندوبست اچھا نہ رہا کیونکہ میں اپنے پر زیادہ اعتماد کیا کرتا تھا ۔ انسانی ذہن جو کچھ آنکھ سے حاصل کر سکتا ہے وہ کان سے ملنا مشکل ہے ۔ سنتے وقت خیالات منتشر ہو جایا کرتے لیکن خود پڑھنے سے جمع اور حاضر رہتے ۔ لکھاتے وقت خیالات تیزی سے نہ آتے لیکن جب خود قلم پکڑ کر لکھتا تو خیالات اور معانی کا سیلاب امڈ آتا ۔

——:o:——

۳۲

اعزاز و اکرام

۱۹۴۸ع میں آرٹس کالج اور جامعہ فواد الاول کی مجالس انتظامیہ نے مجھے ڈاکٹریٹ کی آنریری ڈگریاں دینی منظور کیں تو میرا لقب ڈاکٹر احمد امین پڑ گیا۔ یہ ایک ہزار مصری پونڈ کا انعام تھا جو اُس شخص کو ملتا تھا جس کی تحقیقات ادب اور فنون یا علوم میں اہم نتائج کی حامل ہوں۔

۲۸ فروری ۱۹۴۸ع کو جامعہ کے ہال میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں یہ انعام مجھے عطا کیا گیا۔ سرکاری فرمان کی عبارت کچھ اس طرح تھی:

"من جانب فاروق الاول شاہ[۱] مصر بخدمت ڈاکٹر احمد امین ابراہیم بک ممبر مجمع فواد الاولؒ برائے ترقیِ زبانِ عربی۔

حسبِ قراردادِ کمیٹی برائے عطائے انعام فواد الاولؒ و فاروق الاول آپ کو 'ظہر الاسلام' لکھنے پر ادبی انعام فواد الاول کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ ہم نے قصرِ شاہی سے اس انعام کے عطا کرنے کا حکم صادر کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو علم اور وطن کی خدمت کی توفیق دے۔ مورخہ ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ۔"

قصرِ ہمایونی قاہرہ

۱۔ شاہ فاروق الاول جس کو جمال عبدالناصر اور اس کے ساتھیوں نے ۱۹۵۲ع میں معزول کر دیا تھا۔

اسی دن ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری مجھے عطا کی گئی - میری ادبی مساعی اور جامعہ کی خدمت کی بدولت یہ دونوں انعام ایک ہی دن ملے تھے - اس اعزاز و اکرام پر میرا خوش ہونا ایک قدرتی امر تھا لیکن اپریشن کی وجہ سے میرا دل بجھا رہا کیونکہ میں نفسیاتی لحاظ سے ایک معمولی بات پر بھی محزون ہو جایا کرتا ہوں - اس سال یونیورسٹی میں آنریری پروفیسروں کی تقرری کا قانون منظور ہوا - قانون، ادب اور علوم کے بہت سے اساتذہ سرکاری عہدوں پر فائز تھے جن کے لیے ملازمت سے علیحدہ ہونا مشکل تھا - اُن کے لیے یہ سبیل نکالی گئی کہ وہ اپنے اپنے عہدے پر رہ کر سرکاری خدمات انجام دیتے رہیں - اس بنا پر میرے ساتھ استاد محمد شفیق غربال سیکریٹری محکمہ تعلیم اور استاد مصطفٰی عامر مدیر جامعہ فاروق کو آنریری پروفیسر بنا کر جامعہ سے ان کا تعلق باقی رکھا گیا - اس وجہ سے میں بھی ریٹائر نہ ہو سکا - ۱۹۴۹ء میں، میں نے دو خطبات دیے - ایک کا نام "نقدِ ادب، اُس کا موضوع اور طریقہ تدریس" تھا - دوسرا "کتاب الوساطة بین المتنبّی و خصومہ" کے درس و مطالعہ پر تھا -

—:o:—

۱ - 'الوساطة بین المتنبّی و خصومہ' : مصنفہ قاضی عبدالعزیز الجرجانی المتوفی ۳۹۶ھ جس میں متنبّی کے مخالفین کا جواب دیا گیا ہے -

۳۳

فالج کا حملہ

۵ جولائی ۱۹۵۰ء کو میں موسم گرما گزارنے اسکندریہ گیا اور سیری بشر میں اپنے مکان میں جا ٹھہرا ۔ وقت خوب آرام سے گزر رہا تھا ۔ رات کو اچھی طرح سے نیند آئی ۔ صبح میں عادت کے مطابق اٹھا اور دودھ کی ایک پیالی، پنیر کے ایک ٹکڑے اور قہوے کی ایک پیالی کا ناشتہ کیا ۔ غسل خانے میں ہاتھ دھونے گیا تو خیال ہوا کہ میرا پاؤں کسی چیز پر آ کر پھسل گیا ہے ۔ دوسری دفعہ چلنے کی کوشش کی تو گر پڑا ۔ مجھے احساس ہوا کہ بائیں طرف کے ہاتھ اور پاؤں میں ہلنے جلنے کی طاقت نہیں ہے ۔ ڈاکٹر بلایا گیا تو اس نے معمولی فالج تشخیص کیا اور آرام کرنے کو کہا ۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ فالج گودے میں پیدا ہوتا ہے اور جب جسم حرکت کرتا ہے تو یہ بھی حرکت کرتا ہے اور گودے میں فاسد مادہ پیدا کرتا ہے لہٰذا بالکل آرام کریں ۔ میرے خیال میں یہ دو غلطیوں کا نتیجہ تھا ۔ میں نے دو سی سی کا انسولین کا ٹیکہ لگوایا تھا جبکہ جسم صرف ایک سی سی کا متحمل ہو سکتا ہے ۔ اس کے بعد میں دو گھنٹے تک سویا رہا ۔ اس سے میرے خون کا شکر جل گیا ۔ پھر میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ، حالانکہ اس حالت میں شکر آمیز دودھ کی ایک پیالی کافی تھی ۔ تیسری غلطی یہ ہوئی کہ میں کھانے کے بعد فوراً سو گیا لہٰذا دورانِ خون معدہ کی طرف منتقل ہو گیا ۔ اس سے بعض شریانوں کو غذا حاصل نہ ہو سکی اور

وہ بے حس ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری شریانوں نے لے لی۔ ان کے نشو و نما کے لیے تین ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ چار ماہ بعد میرے جسم میں کچھ حرکت سی پیدا ہوئی اور ہاتھ سے پہلے پاؤں حرکت کرنے لگا۔ اس اثناء میں پچانوے فیصد مرض زائل ہو گیا لیکن مکمل صحت یابی میں ایک مہینہ اور لگ گیا۔

اس مرض سے مجھے بہت سے تجربات حاصل ہوئے۔ یہ پتہ چلا کہ ہاتھ اور پاؤں کی حرکت ایک مرکب میکانکی عمل ہے جو اعضاء کی سلامتی سے وابستہ ہے۔ اس مرض کی وجہ سے میں سگرٹ اور دیاسلائی کی ڈبیا بھی تھام نہ سکتا تھا اور نہ دیاسلائی جلا سکتا تھا۔

—:o:—

۳۴

عادات و خصائل

ان حوادث نے جو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مجھ پر گزرے ہیں ، مجھ پر بڑا اثر کیا ہے اور آج میری شخصیت جس طرح کی بن گئی ہے سب انہی کا نتیجہ ہے اور ان میں مشیت ازلی کارفرما رہی ہے -

میں نے ایک دفعہ ایک دوست کے اوصاف میں ایک مقالہ لکھا تھا - اور اس دوست سے مراد میری ہی ذات تھی - اس میں لکھا تھا کہ میرا دوست خلقی اور علمی لحاظ سے مجموعۂ اضداد ہے -

وہ بے حد شرمیلا ہے ، لڑکھڑاتے ہوئے مجلس میں جاتا ہے - جہاں پہلے جگہ پاتا ہے وہیں بیٹھ جاتا ہے - حیا کی وجہ سے اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا - آنکھیں نیچی رکھتا ہے - اس کو قہوہ پیش کیا جاتا ہے تو اس کے ہاتھ کانپنے لگ جاتے ہیں - یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو کھانے پینے سے بے رغبتی ہے - کبھی سیگار سلگاتا ہے لیکن سیگار نہیں جلتا اور شرم کے مارے اسے ہر وقت جھاڑتا رہتا ہے - ناکامی کو چھپانے کے لیے وہ اپنے ہم جلیس سے بات چیت شروع کر دیتا ہے لیکن دوبارہ غور و فکر میں مشغول ہو جاتا ہے - واپسی کا وقت آ جاتا ہے تو وہ اطمینان کا سانس لیتا ہے -

اس وجہ سے اسے خوشی اور غم کے جلسوں میں شرکت ناگوار سی گزرتی ہے - لیکن اگر اس کے دوست و احباب ہمراہ ہوں تو وہ بخوشی شریک ہوتا ہے - وہ عزلت پسند , ہے اس لیے نہیں کہ لوگوں

سے نفرت کرتا ہے بلکہ اپنی ذات کو بچانے کے لیے گوشہ گیر ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ وہ حیرت انگیز طور پر جرأت مند ہے۔ دھڑلے سے تقریر کرتا ہے۔ علمی مسائل پر کھل کر گفتگو کرتا ہے بھری محفل میں اپنے دلائل نڈر ہو کر پیش کرتا ہے۔ اُس کی بے باکی لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ اس امر میں اُس کو جان کی بھی پروا نہیں رہتی۔

کوئی اُس کی پہلی حالت دیکھے تو کہہ دے کہ یہ کنواری لڑکی سے زیادہ با حیا ہے۔ دوسری حالت دیکھ کر اُس کو شیر سے زیادہ جرأت مند اور چٹان سے زیادہ سخت کہے گا۔ وہ بلند نظر اور قانع ہے۔ اگرچہ وہ گم نام ہے لیکن اُس کا دل اعلیٰ مراتب کا خواہاں ہے۔ اس کے لیے ہمت و دلیری سے کام لیتا اور ہر مصیبت و مشقت جھیل لیتا ہے۔ وہ کوشش، حزم اور عزم کے ساتھ آگے بڑھنے لگتا ہے کہ اُس پر تصوف سوار ہو جاتا ہے اور ناگہاں وہ دنیا، اُس کے کام، سعادت اور شقاوت کو حقیر جاننے لگتا ہے اور ان کا استہزاء کرتا ہے اور قسمت پر شاکر ہو کر رہ جاتا ہے۔ کبھی اُس کو شہرت کا خیال آتا ہے لیکن اخبار میں نام آ جانے سے شرماتا ہے۔ جب محفل میں اُس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہے تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ صوفیا کا یہ قول وردِ زباں رکھتا ہے "اپنے وجود کو گمنامی کی زمین میں دفن کر دے جو دفن نہ ہوا اُس کو شہرت و ناموری حاصل نہیں ہوئی" اس بنا پر وہ شہرت اور گمنامی دونوں کو پسند کرتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہ متکبر بھی ہے۔ اپنے مرتبے سے بڑھ جاتا ہے، ساتھ ہی وہ متواضع اور منکسرالمزاج بھی ہے۔ متکبروں کے سامنے متکبر اور عاجزوں کے مقابلے میں عاجز ہے۔ بڑوں سے فخر

اور غرور سے پیش آتا ہے لیکن درویشوں کے ساتھ بیٹھتا اور کھاتا پیتا ہے۔ بڑوں کے آگے نہیں جھکتا لیکن چھوٹوں سے نرمی اور عاجزی سے پیش آتا ہے۔

وہ لوگوں سے محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی۔ محبت سے اُن میں گھل مل بھی جاتا ہے اور نفرت کی وجہ سے بھاگتا بھی ہے۔ اُس کی محبت میں نفرت بھی شامل ہے۔ وہ بڑے آدمیوں کو اہمیت نہیں دیتا لیکن وہ کسی کو حقیر بھی نہیں سمجھتا۔

اس کا دماغ بساطی کی دوکان ہے جس میں پرانا کپڑا قیمتی پتھر کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ اس میں اہل السنت کے مذہب کے ساتھ نشو و ارتقاء کا عقیدہ اور جبر کے عقیدے کے ساتھ اختیار کا مذہب بھی مخلوط ہے۔ اُس کے کتب خانے کی زینت پرانی اور بوسیدہ کتابیں اور مغرب کی تازہ ترین مطبوعات ہیں۔ ان دونوں چیزوں نے اُس پر بڑا اثر ڈالا ہے۔

اس کے ملحدانہ افکار کو اُس کی طبیعت قبول نہیں کرتی۔ اگر عقل شک میں مبتلا ہو جائے تو اُس کا دل مومن رہتا ہے۔ اُس کے دوستوں میں شرابی، زاہد، فاجر، عابد اور مختلف مذاہب کے پرستار شامل ہیں کیونکہ وہ ان سب کی باتوں کو غور سے سنتا ہے۔

اس پر میں یہ اضافہ کرتا ہوں کہ مجھے غصہ بھی بہت آتا ہے۔ میں حلیم بھی ہوں۔ جو کوئی مجھے دیکھتا ہے وہ مجھے سکون، رزانت اور حلم کا پیکر سمجھتا ہے لیکن جب مجھے غصہ آتا ہے تو میں حد سے بڑھ جاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تربیت نے میرے مزاج کی تیزی کو نرم کر دیا ہے۔ میں عصبی المزاج ہوں۔ اپنے دوستوں سے زیادہ حوادث سے منفعل ہو جاتا ہوں۔ میں کبھی دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہوں کہ ناگہاں کسی کے مرنے کی

خبر آتی ہے تو میں سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں ۔

میں نے اپنے والد سے افکار کی برداشت ، نتائج سے ڈر ، بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال اور معیشت کا فکر ورثے میں پایا ہے ۔ لوگوں پر بھی افکار نازل ہوتے ہیں لیکن وہ ان کا کچھ اثر نہیں لیتے اور بے پروا ہو کر ہنسی خوشی زندگی گذارتے ہیں ۔ اگر مجھے دس میں سے نو چیزوں کی خوشی حاصل ہو تو ایک کا غم بھاری رہے گا ۔

میں حد درجہ حساس ہوں ۔ اگر کسی کے متعلق منہ سے نامناسب کلمہ نکل جاتا ہے تو رات بھر مجھے نیند نہیں آتی ۔ اس کے ساتھ فوراً معاف بھی کر دیتا ہوں ۔ اگر کوئی مجھ سے برائی سے پیش آئے تو بہت جلد میرا دل صاف ہو جاتا ہے ۔

مجھے اپنی عزت کا بے حد پاس ہے ۔ کوئی نا ملائم بات کہہ دے تو ملول خاطر ہو جاتا ہوں لیکن اگر کوئی میری آراء اور میرے افکار کی مخالفت کرے تو میں خندہ پیشانی سے پیش آتا ہوں ۔ کتابوں پر نقد و احتساب سے مجھے بالکل غصہ نہیں آتا بلکہ بے حد خوش ہوتا ہوں ۔

لوگ اگر میری کتابوں اور افکار کی قدر و منزلت کرتے ہیں تو مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ اگر میری کتابوں پر تیز سے نقد و تبصرہ کیا جائے تو میں اس کو ایک قسم کی قدر افزائی سمجھتا ہوں ۔ سچ بات کہنے پر دلیر ہوں ۔ مال و جاہ کی محرومی پر صبر اور برداشت سے کام لیتا ہوں ۔ لیکن اگر میری اولاد یا شرف و وقار کو کانٹا بھی چبھ جائے تو اس کی تاب نہیں رہتی ۔

مجھ کو اپنی ذات اور تصانیف پر زیادہ اعتبار نہیں ، اگر کوئی کتاب یا مقالہ لکھتا ہوں تو جب تک لوگ اس کی اچھائی یا برائی کا حکم نہ لگا دیں میں اپنے فیصلے پر بھروسہ نہیں کر سکتا ۔ مجھے یاد

پڑتا ہے کہ میں مدرسۃالقضاء میں مدرس تھا ۔ میں نے ایک لیکچر "ملاحظہ کی باریکی" پر تیار کیا تھا ۔ ہماری عادت تھی کہ جو کچھ لکھتے ، عاطف بک کو ضرور دکھلاتے ، چاہے وہ پسند کرتے یا ناپسند ۔ وہ پڑھنے کے بعد اس پر سرخ سیاہی سے نشان لگا دیا کرتے تھے ۔ ایک دن کے بعد اُنھوں نے لیکچر پڑھ کر واپس کر دیا لیکن اُس پر کوئی نشان نہ تھا ۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ لیکچر اُنہیں پسند نہیں آیا ۔ مجھے تو اس بات کا بے حد افسوس تھا اور میں یہ سمجھا کہ اُس میں تازگیٔ افکار ناپید تھی ۔ تیسرے دن اُنھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم نے ابھی تک اپنے لیکچر کا اعلان کیوں نہیں کیا ۔ میں نے جواب دیا کہ شاید یہ لیکچر آپ کو پسند نہیں آیا ۔ کہنے لگے یہ تم کو کس نے بتلایا ۔ میں نے جواب میں کہا کہ دلائل سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کیونکہ آپ نے نہ اس کے متعلق کچھ کہا اور نہ کوئی اشارہ کیا ۔ صرف چپڑاسی کے ہاتھ بھجوا دیا ۔ کہنے لگے کہ لیکچر تو ہر حیثیت سے مکمل تھا ۔ اُس میں قطع و برید کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ چونکہ تم پڑھانے میں مصروف تھے اس لیے چپڑاسی کے ہاتھ واپس بھیج دیا ۔ میں نے اس کے نکات کو ذہن میں رکھ کر ، اس کے افکار کو عمدہ جانتے ہوئے یہ لیکچر دے ڈالا تو سب حاضرین نے اس کو پسند کیا ۔ معلوم نہیں کہ یہ عیب مجھ میں کہاں سے پیدا ہو گیا ۔ انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی ذات پر اعتماد کرے اور اپنے کام کا افراط اور تفریط سے بچ کر اندازہ کرے ۔

مجھے باقاعدگی بے حد پسند ہے ۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اور ہر کام اپنے وقت پر ہونا چاہیے ۔ بغیر کسی تردد کے کام میں برق رفتاری مجھے پسند ہے ۔ میری روزانہ زندگی کا نظام لگا بندھا سا ہے گویا کہ میں

ایک ریل گاڑی ہوں جس کی چال میں کوئی انحراف نہیں ہے۔ چاہے کچھ ہو میں سورج نکلنے سے پہلے جاگنے کا عادی تھا، اگرچہ رات کو کتنی بھی دیر سے سویا ہوتا۔ یہ عادت مجھے بچپن سے تھی جبکہ میرے والد نماز فجر پڑھنے کے لیے مجھے بیدار کیا کرتے تھے۔ جب سورج نکل آتا تو میں دودھ کا ناشتہ کر کے کام میں مصروف ہو جاتا وگرنہ اپنے کتب خانے میں جا بیٹھتا یا پائینِ باغ میں جا کر لکھنے پڑھنے میں ظہر تک لگا رہتا۔ فائدے اور نتیجے کے لحاظ سے یہ وقت بہترین تھا۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا۔ دوپہر کا یہ سونا میرے نزدیک ایک مقدس عبادت تھی۔ اگر میں نہ سو سکتا تو سارا دن سست سا رہتا۔ بسا اوقات یہ سونا بہت سی مصیبتوں کا باعث بھی بنا ہے۔ مجھے خاموشی اور سکون ہی میں نیند آ سکتی ہے۔ تھوڑی سی حرکت یا کسی بچے کا رونا میری نیند اڑا دیتا ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ سوتا ہوں اور اس کے بعد بیدار ہو کر قہوہ پیتا ہوں۔ اگر کہیں باہر جانے کا بلاوا ہوتا ہے تو باہر نکل جاتا ہوں۔ ورنہ پھر کتب خانے میں گھس جاتا ہوں لکھنے کے بعد سوتا ہوں تو طرح طرح کے خواب آتے ہیں اور جو کچھ لکھا ہوتا ہے خواب میں بھی اسی کا اعادہ ہوتا رہتا ہے، لیکن مطالعے کے بعد یہ حالت نہیں رہتی۔ میری عادت ہے کہ شام کو پڑھتا اور غور و خوض کرتا ہوں اور صبح اٹھ کر لکھ لیتا ہوں۔

تحریر کا کام بھی امن اور اطمینان کی صورت میں ہو سکتا ہے میری آرزو رہی کہ جس طرح آنکھوں کی پلکیں ہیں کانوں کے لیے بھی کسی قسم کا ڈھکنا ہوتا۔

جمعہ کے دن آرام کرتا ہوں۔ حلوان یا اہرام یا نہر کے کنارے نکل جاتا ہوں تاکہ مطالعہ و تحریر کو بھول جاؤں۔ گرمی کا موسم

اسکندریہ یا راس البر میں گذارتا ہوں۔ وہاں کتابیں بھی ساتھ لے جا کر علمی کاموں میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ فضائے کائنات کو دیکھ کر یا نہر کے کنارے سیر کر کے اپنے دل کو بھلاتا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سیگریٹ نوشی کی عادت سے محفوظ ہوں قہوہ خانوں میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی عادت نہیں۔ شطرنج اور چوسر کا بھی شوق نہیں ہے ہاں انجمن کے دفتر میں رفقاء سے مل کر خوش ہوتا ہوں۔ شروع زندگی میں مجھے کافی فراغت تھی جسے میں نے لکھنے پڑھنے میں صرف کیا۔

فجرالاسلام اور ضحی‌الاسلام اسی زمانے کی یادگار ہیں لیکن اس کے بعد علمی مجالس کی شرکت کی وجہ سے میں عدیم الفرصت ہو گیا۔ میں مجمع اللغوی، دارالکتب اور آرٹس کالج کی مجالس انتظامیہ کا ممبر ہوں۔ لجنۃ التالیف اور جامعۂ شعبیہ کا صدر ہوں۔ ریڈیو پر بھی تقاریر نشر کرتا رہتا ہوں۔ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے اور میرے خیال میں کوئی خاص فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ ان مشاغل کو چھوڑ کر دوبارہ تصنیف و تالیف میں لگ جاؤں اور فجر الاسلام، ضحی الاسلام کے سلسلے کو مکمل کر دوں یہ زیادہ مناسب ہوگا لیکن ہر کام کا موقع اور محل ہوتا ہے۔ مجھے میل جول کی زیادہ عادت نہیں۔ مجھے وہی دن اچھا لگتا ہے جس روز سب سے الگ تھلگ رہوں۔

میں رات کے گیارہ بجے تک مطالعے میں مصروف رہتا ہوں۔ چارپائی کے پاس بجلی کا لیمپ رکھا رہتا ہے اور میں پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں جب ڈاکٹروں نے مجھے مطالعے سے منع کر دیا تو کسی سے پڑھوا کر سنتا رہتا ہوں۔

جب کوئی فکر یا خیال دامن گیر ہو جاتا ہے تو اس کے

متعلق خوب مطالعہ کرتا ہوں ۔ رات کو سو جاتا ہوں تو اسی امر کا خیال رہتا ہے ۔ سوتے ہوئے جاگ اٹھتا ہوں ۔ کتب خانے میں جا کر روشنی کر کے کتاب ڈھونڈھ لاتا ہوں ۔ فکری تحقیق کے لیے نفی یا اثبات پر پہنچنے کے لیے اس کا مطالعہ کر کے دوبارہ چارپائی کا رخ کرتا ہوں ۔

جب کوئی سیاسی یا اجتماعی ، قومی یا انسانی واقعہ رونما ہوتا ہے تو میں شدید طور پر متاثر ہوتا ہوں اور اپنے علمی فکر کو بھول جاتا ہوں ۔ ان ایام میں فلسطین کے حوادث ، یہودیوں کی جد و جہد اور عربوں کی بے عملی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے ۔ یہودیوں کا اتحاد ، عربوں کا انشقاق ، اول الذکر کی یورپ ، امریکہ اور روس جیسی سیاسی چالیں ، معاملہ فہمی اور موقع شناسی اور موخر الذکر کی رازِ دروں پردہ سے بے خبری ، اتحاد اور اتفاق میں کوتاہی اسے مضطرب کئے ہوئے ہے ۔ یہودیوں کی زیادہ کامیابی کا خیال ان کے ہمدردوں کو بھی نہ تھا ۔ میں اپنے دل سے بار بار پوچھتا ہوں کہ اگر یہودی اپنی جد و جہد اور مساعی میں عرب غفلت اور بے عملی میں مصروف رہے تو اس کا کیا انجام ہوگا ، پھر میں تحریر میں مشغول ہو کر اس غم کو بھلانا چاہتا ہوں ۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اندلس مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا تو کسی کو بھی جنبش نہ ہوئی ۔ نہ کسی نے مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا اور آج کئی صدیوں کے بعد یہ مصیبت دوبارہ آ رہی ہے ۔ فلسطین مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے لیکن کسی نے عبرت حاصل نہیں کی اور نہ تاریخ سے کوئی سبق سیکھا ۔ اب مسلمان مدد کے لیے چلاتے ہیں اور نہ ہونے کے برابر مدد کی جاتی ہے تو مسلمانوں کا اللہ والی ہے ۔

مجھے تصوف کا بھی شوق ہو رہا ہے بعض اوقات میرا دینی

جذبہ اُبھر آتا ہے جس سے میرا دل جھوم اٹھتا ہے۔ لمبے چوڑے کھیت، سربلند درخت، روشن ستارے، سورج کے طلوع اور غروب کا منظر، سمندر اور اس کی امواج، پرندوں کی نغمہ سرائی، یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر میں وجد میں آ جاتا ہوں اور ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پاتا ہوں لیکن اس کے ساتھ افسوس بھی آتا ہے کہ میں نے اس جذبہ کی بیداری کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔

میرا مزاج ادیب سے زیادہ فلسفی ہے۔ مجھے معنوی غزارت اور بلند خیالی زیادہ بھاتی ہے۔ اس وجہ سے مجھے حریری[1]، قاضی فاضل[2]، صاحب ابن عباد[3]، عماد اصفہانی[4] اور ان کے پیروؤں کے بجائے جاحظ[5]، ابو حیان توحیدی[6] اور ابن خلدون[7] زیادہ پسند ہیں۔ میں متنبی[8] اور ابوالعلاء المعری[9] کا مداح ہوں۔ کاش کہ ان کے کلام

۱۔ ابوالقاسم الحریری: (۴۴۶ - ۵۱۶ھ) مقامات حریری کا مصنف۔

۲۔ قاضی الفاضل: (۵۲۹ - ۵۹۶ھ) سلطان صلاح الدین الایوبی کا وزیر اور اپنے زمانے کا زبردست انشا پرداز۔

۳۔ صاحب ابن عباد: (۳۲۶ - ۳۸۵ھ) بنی بویہ کا ادب پرور وزیر۔

۴۔ عماد الاصفہانی: (المتوفی ۵۹۷ھ) ادیب، مورخ اور تذکرہ نگار جو مقفیٰ اور مسجع انشا پردازی کا دلدادہ تھا۔

۵۔ جاحظ: (المتوفی ۲۸۵ھ) تیسری صدی ہجری کا مشہور ادیب اور انشا پرداز۔ کتاب البیان و التبیین اور الحیوان کا مصنف۔

۶۔ ابوحیان توحیدی: (المتوفی ۴۰۰ھ) چوتھی صدی ہجری کا ممتاز فلسفی ادیب جس کو تذکرہ نگار جاحظِ ثانی بھی کہتے ہیں۔

۷۔ ابن خلدون: (۷۳۲ - ۸۰۸ھ) مستغنی عن التعریف مورخ۔

۸۔ ابوالطیب احمد متنبی: (۳۰۳ - ۳۵۴ھ) چوتھی صدی ہجری کا مشہور ترین شاعر جس نے سیف الدولہ کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

(حاشیہ نمبر ۹ اگلے صفحے پر)

میں غرابت ، تکلف اور تفلسف نہ ہوتا ۔ یہ دونوں ابو تمام' اور اُس کی دقت پسندی پر فضیلت رکھتے ہیں ۔ بحتری' کے صرف چند قصائد پسند کرتا ہوں ۔ چونکہ عربی ادب کے اشعار جو قدرتی مناظر سے تعلق رکھتے ہیں ، استعارہ اور تشبیہ پر مبنی ہوتے ہیں اور دل کی حرارت سے خالی ہوتے ہیں اس لیے مجھ پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ ادب کی پسند اور ناپسند میں میرا خاص ذوق ہے ۔ میں مجتہدانہ اتباع کو پسند کرتا ہوں ۔ اگرچہ اس میں غلطی کا احتمال ہو ۔ نہ کہ تقلید کو ، چاہے یہ درست ہو ۔

اگر میں اپنی زندگی کو شروع سے لے کر آخر تک بیان کرتا تو اُس میں بہت سی ناہمواریاں آتیں ۔ اس کا انجام ، آغاز سے کتنا مختلف ہوتا ۔ کوئی مجھے مدرسہ اُم عباس میں دیکھتا تو کہہ سکتا تھا کہ میں پرائمری ، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوکر بڑا سرکاری عہدہ دار بنوں گا لیکن قضا و قدر سے مجھے ازہر میں داخل ہونا پڑا ۔ اگر یہاں رہتا تو کسی مسجد کا امام یا کسی سرکاری سکول کا ماسٹر یا ازہر میں استاد ہو جاتا کسی ستون کے پاس بیٹھ کر متن کی تشریح کرتا لیکن اس کو چھوڑ چھاڑ کر مدرسة القضا سے رشتہ جوڑنا

(حاشیہ نمبر ۹ صفحہ گذشتہ)

۹ ۔ ابوالعلاء المعری : (۳۶۳ - ۴۴۹ھ) عرب کا فلسفی شاعر ۔ کلام کا مجموعہ : سقط الزند اور لزومیات ہے ۔

۱ ۔ ابو تمام : (۱۸۸ - ۲۳۱ھ) تیسری صدی ہجری کا نامور شاعر اور دیوان الحماسہ کا جامع ، جس کے کلام میں صنائع بدائع کی بھرمار ہے ۔

۲ ۔ البحتری : (۲۰۶ - ۲۸۴ھ) تیسری صدی ہجری کا ممتاز ترین شاعر جس کا کلام سلاستِ زبان اور فصاحت بیان کے لیے مشہور ہے ۔

پڑا جہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں قاضی اور چیف جسٹس بن جاتا ۔ قدرت کو یہ بھی منظور نہ تھا ۔ میرا تعلق یونیورسٹی سے ہو گیا اور میں پہلے پروفیسر اور بعد میں پرنسپل بن گیا ۔

میری عقلیت بھی ان تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی گئی ۔ میری سمجھ بوجھ ازہر اور مدرسۃ القضاء کے ماحول کے مطابق نہ ہو سکی ۔ مدرسۃ القضاء میں ایک دوسرے دوست میرے ہم خیال تھے لیکن بات چیت کرنے پر پتہ چلا کہ ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہیں ۔ میری پہلی اور آخری معیشت میں کتنا فرق ہے ۔ جاحظ کے قول کے مطابق یہ فرق امراؤالقیس[1] اور علی بن[2] جہم کی شاعری کا فرق ہے ۔ امراؤالقیس کہتا ہے :

تقول و قد مال الغبیط بنا معاً
عقرت بعیری یا امراء القیس فانزل

ترجمہ : ہودہ ہم دونوں کے ساتھ ایک طرف جھک گیا تو وہ کہنے لگی "چل اتر جا تم نے تو میرے اونٹ کو مار ہی ڈالا ۔"

علی بن الجہم :

فبتنا جمیعاً لو تراق زجاجة
من الخمر فیما بیننا لم تسرب

ترجمہ : ہم سب نے رات باہم اس طرح بسر کی کہ اگر جامِ شراب گرایا جاتا تو کبھی زمین پر نہ گرتا ۔

---

۱ ۔ امراؤالقیس : (۱۳۰ - ۸۰ قبل از ہجرت) زمانۂ جاہلیت کا مشہور ترین شاعر ۔

۲ ۔ علی بن جہم : (المتوفی ۲۴۹ھ) دورِ عباسی کا ایک نازک خیال غزل گو شاعر ۔

ہماری طرز معاشرت جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں ، حد درجہ سادہ اور محدود تھی - نہ پانی کا انتظام تھا ، نہ جدید تمدنی زندگی کے وسائل مہیا تھے - اب میرے گھر کے ساتھ باغ بھی ہے اور جدید تمدنی زندگی کے لوازمات یعنی ریڈیو ، ٹیلیفون وغیرہ بھی میں نے سولہ سال کی عمر تک گاڑی کا سفر نہ کیا تھا - جب طنطا کا سفر کیا تو غم سے روتا جاتا تھا لیکن جب آخری زندگی میں ہوائی جہاز سے لندن کا سفر کیا تو خوشی کی انتہا نہ تھی -

میں بچپن میں ازہر پیدل چل کر جایا کرتا تھا - واپس آتا تو ہاتھ میں بوجھل رومال ہوتا جس کو کبھی دائیں ہاتھ میں تھام لیتا اور کبھی بائیں میں - اب میں تھوڑی مسافت کے لیے بھی کار میں سفر کرتا ہوں - میرے والد نے مجھے مکتب بھیجا تھا اور اب میں اپنے بچوں کو نرسری اور کنڈر گارٹن سکولوں میں بھیجتا ہوں - آن کو ٹرام اور بس کا سفر پسند نہیں بلکہ وہ موٹر کے طلب گار رہتے ہیں - مجھے معمولی قصور کی سزا مل جایا کرتی تھی تو میں برداشت کر لیتا تھا - اب میرے بچے معمولی بات پر غضب ناک ہو جاتے ہیں - بعض معمولی ضروریات سے محروم ہونے کے باوجود میں نے کبھی اپنے والد سے مواخذہ نہیں کیا تھا - اب بچوں کے اسراف کی کوئی انتہا نہیں ہے - میں جوانی میں مستقبل کی زندگی کا نقشہ عالم خیال میں کھینچتا تھا اور خلق ، مسلک اور اصلاح کا اعلیٰ درجہ پیش نظر رہتا لیکن واقعات نے آگے چل کر ان کو بے بنیاد قرار دیا - میں نے حوادثِ زمانہ کے سامنے سینہ سپر ہونا چاہا لیکن قدم ڈگمگا گئے - اس واسطے میرا شباب میرے بڑھاپے سے اچھا رہا - عالمِ شباب میں باوجود نقصان اٹھانے کے میں اصولوں سے چمٹا رہا ، اگر میری عزت پر حرف آتا تو کام کی نفع رسانی کے باوجود میں اس سے ہاتھ

کھینچ لیتا ۔ میں نے اصلاحِ حال اور اعمال کے متعلق بے شمار اُمیدیں قائم کی تھیں لیکن وہ سب ہا در ہوا ثابت ہوئیں ۔ بڑھاپے میں بعض آراء سے دستبردار ہونا پڑا ۔ خاندان ، لوگوں کی مختلف باتوں ، اولاد کی کثرت ، پے در پے مجبوریوں اور قوتِ ارادی کی کمزوری سے انسان مجبور ہو کر اصول کی بلندیوں سے نیچے اُتر آتا ہے ۔ مجھے تو یہ بات پسند ہے :

عصیت هوی نفسی صغیراً و عندما
رمانی زمانی بالمشیب و بالکبر
اطعت هوی عکس القضیة لیتنی
ولدت کبیراً ثم عدت الی الصغر

ترجمہ : میں نے بچپن میں خواہشات نفسانی کی نافرمانی کی اور جب بوڑھا ہو گیا تو اُن کی اطاعت کی ۔ کاش کہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ۔ میں بوڑھا پیدا ہوتا اور اس کے بعد صغیرالسن ہو گیا ہوتا ۔

باوجود اس کے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ مجھے بہت سے کام سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائی ۔ لجنۃالتالیف ، جامعہ شعبیہ (عوامی یونیورسٹی) ۔ جامعہ مصریہ ، جامعہ عربیہ اور آرٹس کالج میں کام کرتے ہوئے بہت سی کتابیں تالیف کیں ۔ میری علمی ، ادبی ، مالی اور عائلی زندگی کا بھی یہی حال رہا ہے ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں جن کا شکر ادا کرنے سے میں قاصر ہوں ۔

ان واقعات کی عقلی تعلیل نہیں ہو سکتی اور نہ اجتماعی اور

نفسیاتی تحلیل سے ان کو بیان کیا جا سکتا ہے ۔ بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ ذہین ، مضبوط جسم اور ارادے کے پکے تھے ۔ آثار سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کاموں میں ضرور کامیاب ہوں گے ، لیکن انجام کار اُن کو حرماں نصیبی کے سوا کچھ نہیں ملا ۔ اس کی کوئی علت بیان نہیں ہو سکتی ، سوائے اس کے کہ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم (یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے) ۔

——:o:——

مجلسِ ترقیِ ادب لاہور کی چند مطبوعات

اقبالیات :

۱- **اقبال کا تصورِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین :**
از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی - - - - - ۱۲/-
۲- **اقبال معاصرین کی نظر میں :** مرتبہ پروفیسر وقار عظیم ۱۸/-
۳- **اقبال اور عبدالحق :** مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن - - ۸/-
۴- **اقبال کی تیرہ نظمیں :** از پروفیسر اسلوب احمد انصاری ۱۶/-
۵- **اقبال بحیثیتِ شاعر :** مرتبہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ۳۵/-
۶- **شذراتِ فکرِ اقبال :** مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - ۱۰/-
۷- **خطباتِ اقبال :** پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی ۲۰/-
۸- **جاوید نامہ :** منظوم پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی ۱۶/-

غالبیات :

۹- **اردوے معلیٰ :** از اسد اللہ خاں غالب ،
مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ، تین جلدیں ، فی جلد ۱۰/-
۱۰- **دیوانِ غالب ، نسخۂ حمیدیہ :**
مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں - - - - ۱۵/-
۱۱- **دیوانِ غالب ، نسخۂ شیرانی :** (عکسی ایڈیشن) - ۱۵/-
۱۲- **عودِ ہندی :** از اسد اللہ خاں غالب - سفید کاغذ ۱۰/-
مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی - اخباری کاغذ ۶/۵۰
۱۳- **کلیاتِ غالب فارسی :** مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل
لکھنوی (تین جلدوں میں) - - - - ۳۰/-
۱۴- **یادگارِ غالب :** از خواجہ الطاف حسین حالی
مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی - اخباری کاغذ ۷/۵۰
۱۵- **مجموعۂ نثرِ غالب :** مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی
سفید کاغذ ۸/۰۰
اخباری کاغذ ۵/-

مجلسِ ترقیِ ادب ، کلب روڈ ، لاہور

زرین آرٹ پریس لاہور